طارق اسمٰعیل ساگر

تعاقب

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 1

ڈرائیور نے ویگن کی لائٹیں آف کر دی تھیں اور نبیل کے ساتھی جن کی پہلے ہی خوف سے گھگی بندھی ہوئی تھی یہ سوچ کر لرز جاتے تھے کہ اندھیری اور اس نوعیت کی طوفانی رات میں اگر سامنے کوئی رکاوٹ آ گئی تو اُن کا کیا حشر ہوگا۔ ویگن میں نبیل کے ساتھ پانچ اور نوجوان موجود تھے۔ اُن میں سے کوئی کسی کو نہیں جانتا تھا سب کل رات ہی اکٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ایک دوسرے کو صرف اپنے نام ہی بتائے تھے نجانے کیوں نبیل نے اپنا نام بھی غلط بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اُس کی اصلیت کا علم ہو اُسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا بھلے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑتی۔

''اسے بند کر.....'' کرخت چہرے اور قدرے پھولی ہوئی ناک والے گارڈ نے اس لڑکے کو ڈانٹا جس نے سگریٹ سلگانے کی کوشش کی تھی۔ پاگل ہو گئے ہو کیا.....'' گارڈ نے تنبیہ کی.....''تمہیں کہا تھا ناں چپ چاپ بیٹھے رہو.....''

لڑکے نے سہم کر سگریٹ کی ڈبی دوبارہ اپنی جیکٹ کی جیب کے اندر رکھ لی تھی۔ اُن سب کے موبائل انہوں نے سفر کے آغاز پر ہی آف کروا دیے تھے اور سختی سے ہدایت کی تھی کہ منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے اُن میں سے اگر کسی نے بھی موبائل آن کرنے کی کوشش کی تو اُسے بلا دریغ گولی مار دی جائے گی کیونکہ کسی ایک کی غلطی سے اُن سب کی جان جائے یہ سودا انہیں منظور نہیں تھا۔

''ابھی ویسا ہی کرو جیسا تمہیں بتایا گیا ہے''..... کھردرے لہجے والے گارڈ نے جس کے گلے میں کلاشنکوف لٹکی تھی انہیں آخری بات یہی کہی تھی۔

نبیل کو یہ تو علم ہو گیا تھا کہ اُس کے ساتھ الگ الگ شہروں کے رہنے والے ہیں لیکن ایک بات سب میں مشترک تھی کہ نبیل سمیت وہ سب ایک ہی ایجنٹ کے ذریعے موت کی اس شاہراہ پر گامزن تھے۔ باخبر اور ایسے معاملات پہ دسترس رکھنے والے نبیل کو اندازہ تھا کہ ان لوگوں نے کس طرح پانچ پانچ لاکھ روپے اکٹھے کر کے ایجنٹ کو دیئے ہوں گے۔ جس نے انہیں یورپ پہنچانا تھا۔

انہیں یہی بتایا گیا تھا کہ بلوچستان کے اس سمندری ساحل سے لانچ کے ذریعے انہیں مڈل ایسٹ کی کسی ریاست میں پہنچایا جائے گا جہاں سے وہ پہلے سے تیار کردہ جعلی کاغذات کے ساتھ مشرقی یورپ کی ایک ائر لائن کے ذریعے اپنی منزل پر پہنچیں گے۔

اُن کی منزل مشرقی یورپ ہی کا ایک ملک تھا جہاں سے وہ ایجنٹ کے کہنے کے مطابق آسانی سے مغربی

تعاقب

دشمنی کی بھینٹ چڑھنے والے ایک نوجوان کی کہانی جو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا تھا

یورپ چلے جاتے۔ ایجنٹ سلطان نے فی بندہ آٹھ لاکھ روپے میں بک کیا تھا لیکن اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے اُس نے اُن سے پانچ لاکھ فی بندہ پاکستان میں وصول کئے تھے جبکہ بقیہ دو لاکھ اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد جب وہ اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے تو وہ سلطان کو پہنچاتے۔

نبیل سمیت ہر لڑکا یہ جانتا تھا کہ سلطان کے ذریعے اب تک درجنوں لوگ باہر جا چکے ہیں۔ وہ کسی تگڑی سفارش کے بغیر کام کرنے کی ہامی ہی نہیں بھرتا تھا۔ نبیل نے بھی سلطان تک ایک سب انسپکٹر دوست کے ذریعے رسائی حاصل کی تھی جو اُس کا کورس میٹ اور قریبی دوست بھی تھا۔

نبیل کے ساتھ جانے والے نوجوانوں کی تو بہت سی مجبوریاں رہی ہوں گی لیکن نبیل کا مسئلہ اُن سے الگ تھا۔ اُسے پیسوں کی کمی نہیں تھی نہ ہی اُس کا تعلق کسی غریب گھرانے سے تھا۔ وہ کھاتے پیتے گھر کا لڑکا تھا۔ ایک ایسا نوجوان جسے خاندانی دشمنی ورثے میں ملی تھی......!

گجرات کے ایک نواحی علاقے کے رہنے والے نبیل کو اوائل عمری ہی میں اس تلخ سچائی کا علم ہو گیا تھا کہ جب اُس کی عمر بمشکل پانچ دو سال تھی تو اُس کے والد کو دشمنوں نے اُس عدالت کے دروازے پر اُس کے چچا اور دو ساتھیوں سمیت قتل کر دیا تھا جہاں وہ اپنے دشمنوں کے خلاف مقدمہ لڑنے گیا تھا۔

نبیل کے والد کی موت کا بدلہ اُس کے چچا زاد بھائیوں نے اگلے دس دن میں ہی لے لیا تھا لیکن اصلی قاتل بچ نکلا تھا اور بعد میں عدالت نے بھی اُسے اس بنا پر بری کر دیا تھا کہ وہ موقع واردات پر موجود ہی نہیں تھا۔ نبیل کا شعور اُن دنوں پختہ ہو چکا تھا وہ شہر کے ایک سکول میں پانچویں جماعت کا طالبعلم تھا اور اپنے ماموں کے پاس رہتا تھا جب اُسے علم ہوا کہ اُس کے باپ کے قاتل ملک ماکھو کے وکیل نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ملک ماکھو قتل کی اس واردات سے تین روز پہلے ہی گجرات سے قریباً چار سو میل دور سندھ کے ایک شہر کے سرکاری ہسپتال میں داخل تھا جہاں اُسے اچانک ہارٹ اٹیک ہوا۔ فاضل وکیل نے ہسپتال میں داخلے کے اخراج اور اس دوران ہونے والے علاج کی ایک ایک تفصیل ڈاکٹروں کی گواہی کے ساتھ عدالت میں پیش کر کے ملک ماکھو کو بری کروا لیا تھا۔

اس خبر پر اصولی طور پر تو انہیں دُکھ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ حیران رہ گیا جب چاچا شریف نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

”بہت اچھا ہوا صغراں بہن، بہت اچھا ہوا“...... اُس نے نبیل کی ماں کو مخاطب کر کے کہا تھا“...... اگر اُسے جیل ہو جاتی تو ہمارے لئے زیادہ مشکلات پیدا ہوتیں...... جیل میں اپنے بھائی کا بدلہ لینا آسان کام نہیں ہے...... ماکھوا جیوندیاں دے میلے...... اوئے میرا کلیجہ بتر ٹھنڈا ہو گا جب تجھے اپنے ہاتھ سے موت دوں گا......“

چاچا شریف اُن کے خاندان کا نبیل کے والد کے بعد سب سے بڑا بن گیا تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام میں رہنے کی وجہ سے وہ سب کے لئے قابل احترام تھا۔ چاچا شریف نے ہی نبیل اور اپنے دوسرے دو بھتیجوں کو شہر کے سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ اب حویلی میں اُن کے ملازم اور پانچ چچا زاد بھائی رہتے تھے۔ جو زمینوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی آڑھت بھی چلا رہے تھے۔

حویلی کے دروازے مستقل بند رہتے تھے۔ بڑی

بڑی دیواروں کے ساتھ چاروں اطراف ایک طرح سے آبزرویشن پوسٹیں بنی ہوئی تھیں جن پر دن رات مسلح پہرہ رہتا تھا۔ چاچا شریف کے بیٹے دس دس بارہ بارہ جماعتیں پڑھے ہوئے تھے انہوں نے اپنی خاندانی آڑھت کو خاصی ترقی دی تھی۔ ایک سے تین دکانیں بن گئی تھیں اور تینوں پر جعلی کھاد کی ہزاروں بوریاں دنوں میں فروخت ہو جاتی تھیں۔ پیسے کی ریل پیل تھی، مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے سب مل کر اچھی زندگی جی رہے تھے۔ ملک ماکھو عدالت سے تو بری ہو گیا لیکن اچانک ہی وہ اپنے ڈیرے سے غائب ہو گیا۔ اُس کے بھائی اور بیٹوں کو علم تھا کہ شریف زیادہ انتظار نہیں کرے گا اور جلدی اپنے بھائی کی موت کا قرض چکانے آ جائے گا۔ انہوں نے اپنے بزرگ ملک ماکھو کو کراچی میں اپنے سالوں کے پاس بھیج دیا۔

چاچا شریف کو اُس کے غائب ہونے کی خبر جیرے کڑلی نے دی تھی جو ایک طرح سے اُن کا مستند مخبر تھا اور جیرے کڑلی کے ذریعے ہی انہیں ملکوں کی نقل و حمل کی اطلاع ملتی تھی۔

اُس روز جیرا کڑلی رات کی تاریکی میں چھپتا چھپاتا چوہدری شریف کے ڈیرے پر پہنچا تھا جہاں اُس نے نبیل کے بڑے بھائی احمد کو یہ اطلاع دی تھی ”تمہیں کس نے بتایا“؟ احمد نے موبائل فون کے ذریعے چاچا شریف کو فوراً ڈیرے پر پہنچنے کی تاکید کرنے کے بعد جیرے کڑلی سے پوچھا۔

”ملک صاحب! میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ وڈی ملکانی فون پر باتیں کر رہی تھی اپنے بھائی سے۔“ جیرے نے رازداری سے کہا

”اوئے کب کی بات ہے یہ؟“...... احمد نے بے چینی سے پوچھا

”پرسوں کی“...... جیرے نے جواب دیا

”اور تو آج......“

”ملک جی! آپ جانتے ہیں۔ ملک ماکھو کی حویلی سے کسی ملازم کو اپنی مرضی سے باہر آنے کی اجازت نہیں ہوتی...... بڑی مشکل سے بہانہ بنا کر نکلا ہوں......“ جیرے نے اپنی صفائی پیش کی۔

اس دوران ملک شریف کی گاڑی ڈیرے پر پہنچ گئی تھی اور اب وہ جیرے کا انٹرویو کر رہا تھا۔

”تو نے آج دیکھا ہے اُسے......“ اُس نے جیرے سے فوراً سوال کیا۔

”ملک جی ہم تو کئی کئی دن اُنہیں نہیں دیکھتے...... وہ گھر میں تو کم ہی رہتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ناں“......

”ہوں ں ں......“ ملک شریف نے لمبی سانس لی...... احمد پتر! اسے کچھ دے کر رخصت کرو...... زیادہ

ڈیرے پہ یہاں رُکنا مناسب نہیں''...... اُس نے احمد کو ہدایت کی۔

''اللہ تیریاں بادشاہتاں قائم رکھے ملک جی!......'' جیرے کڑملی نے عاجزی ظاہر کی۔

''جیرے! ہمیں پل پل کی خبر ملنی چاہیے۔ بے فکر رہیں۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... جب اُسے تھوڑا سا شک ہو۔ ہمارے پاس چلے آنا''

ملک شریف نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

احمد نے سوسو کے پانچ نوٹ جیرے کو تھمائے تو اُس کے چہرے کی رنگت ہی بدل گئی۔ خوشی سے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے اور وہ ملک شریف کو مسلسل دُعائیں دے رہا تھا۔

ملک شریف اور جیرے کی یہ آخری ملاقات تھی......!!

اُن سے رخصت ہو کر جیرا اگلے روز صبح حویلی پہنچا تو ملک ماکھو کے بڑے بیٹے گامی نے اُسے ڈیرے پر طلب کر لیا۔ جیرا ڈیرے پر پہنچا تو گامی کا موڈ بدلا ہوا دکھائی دیا۔ جیرا گامی کی رگ رگ سے واقف تھا۔ خوف کی لہر اس کے سارے بدن میں تیزی سے سرایت کر گئی۔

''کہاں گئے تھے کل''؟ گامی نے اُس کی طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''کنجاہ گیا تھا ملک جی! اپنے سسرال میں''...... جیرے نے بمشکل یہ فقرہ ادا کیا تھا۔

''اچھا......'' گامی نے عجیب سے لہجے میں بات کرتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا...... ''اوئے تیری یادداشت تو ٹھیک ہے ناں...... اچھی طرح سوچ کر بتا کہاں گیا تھا کل؟......''

جیرے کے پاؤں تلے زمین سرک گئی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُسے اور کیا کہے...... اچانک ہی وہ لرز کر رہ گیا۔

''کہیں اسے ملک شریف سے میری ملاقات کا علم تو نہیں ہو گیا؟''......

خوف سے وہ کپکپانے لگا تھا۔

''بتاتا نہیں اوئے''؟ گامی نے غصے سے پھاڑ کر کھانے والے لہجے میں کہا ''مم ملک جی میں اپنی ماسی دارو سے ملنے وہاں......''

''ملک شریف کے ڈیرے پر گیا تھا......'' گامی نے اُس کی بات مکمل کی......''

اسے جانتے ہو اوئے؟

اُس نے اپنے عقب سے کمرے میں آتے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے جیرے سے پوچھا اور جیرے کو یوں لگا جیسے اچانک اُس کے قوی جواب دے گئے ہوں...... اُس نے اس نوجوان کو ملک شریف کے ڈیرے پر دیکھا تھا۔ ضرور یہ ملک گامی کا مخبر ہو گا۔ جیسے وہ ملک شریف کا مخبر تھا اُس کی زبان پر لکنت طاری تھی۔ لفظ ڈھنگ سے ادا نہیں ہو پا رہے تھے ۔ اُس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر ملک گامی کے پاؤں چھولے لیکن اچانک اپنے عقب میں کھڑے ملک گامی کے گارڈ کی زوردار لات کھا کر وہ منہ کے بل گرا اس کے ساتھ ہی ملک گامی نے اُسے اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔

اگلے روز علی الصباح جیرے کڑملی کی لاش ریلوے لائن پر ملی۔ پولیس رپورٹ کے مطابق وہ رات کو جلدی لائن کراس کرنے کے چکر میں ٹرین سے ٹکھرایا اور اُس کا جسم دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

ملک شریف نے چوری چھپے دس ہزار روپے جیرے کڑھی کی بیوی کو پہنچا دیے تھے۔

ملک ماکھو وہاں سے غائب ہو گیا۔ ملک شریف نے اس دوران کراچی کا کونا کونا چھان مارا لیکن اس کا نام و

نشان نہ ملا۔ اس دوران دونوں طرف سے پانچ بندے مارے جا چکے تھے۔ ایک بندہ ملک شریف کا اور چار بندے ملک ماکھو کے۔

نبیل اور اُس کے کزن جب وہ شہر سے گاؤں جاتے انہیں سخت حفاظتی پہرے میں ایک ایک کر کے لایا اور لے جایا جاتا۔ نبیل نے اس دوران گریجوایشن کر لی۔ اپنے چچا کی خواہش پر پولیس میں نوکری کر لی۔ ایلیٹ فورس کے خصوصی کمانڈو کورس کرنے کی وجہ سے وہ خاصی نمایاں حیثیت حاصل کر چکا تھا۔

چاچا شریف کی عمر ضرور ڈھل رہی تھی لیکن اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ روز بروز جوان ہو رہا تھا۔

پندرہ سال اس نے ملک ماکھو کا انتظار کیا۔ اس دوران اس کا بیٹا رحیم اور ملک ماکھو کا بڑا بیٹا ملک گامی بھی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ مقدمات نے دونوں پارٹیوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ متعدد سرکاری اور غیر سرکاری کوششوں سے وہ ایک دوسرے کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

نبیل نے الگ مزاج پایا تھا۔ وہ پولیس آفیسر اور تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ اُس کی شدید خواہش تھی کہ معاملہ کسی طرح ختم ہو جائے اور یہ سلسلہ یہیں رُک جائے لیکن ملک شریف اور ملک ماکھو جب تک زندہ تھے یہ ممکن نہیں تھا۔ اس دوران اُس نے چاچا شریف کو بھی دو تین مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگلی نسلوں کو اپنے گناہوں کی سزا کیوں دے رہے ہو لیکن اُس نے اُلٹا نبیل کو بزدلی کا طعنہ دے دیا۔ اُس نے نبیل کو سمجھایا کہ جب تک ملک ماکھو زندہ ہے وہ اس دشمنی کی آگ کو سرد نہیں ہونے دے گا بلکہ بھڑکاتا رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔

وہ روز بد بھی آ ہی گیا جس کے نہ آنے کی نبیل اور اُس کی ماں نے بہت دعائیں مانگی تھی۔ اُس روز وہ چھٹی پر گھر آ رہا تھا۔ نبیل نے اپنا تبادلہ بہاولپور میں کروایا ہوا تھا تا کہ اس مصیبت سے جان چھٹی رہے۔ بہاولپور سے وہ بذریعہ ٹرین گوجرانولہ پہنچا تھا جہاں اُس کا بھائی احمد اور اُن کے دو باڈی گارڈ اُسے لینے آئے تھے۔ نبیل نے انہیں منع کیا تھا لیکن چاچا شریف نے اُس کی ایک نہ مانی کیونکہ وہ ملک ماکھو کی ذہنیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ دو گاڑیوں میں اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے جہاں زندگی کا بدترین سانحہ اُس کا منتظر تھا۔ گاؤں سے دو کلومیٹر فاصلے پر موجود نہر کی پٹڑی پر جیسے ہی گاڑیاں چڑھیں اُن پر گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ احمد اور اُس کے ساتھیوں کے لئے گو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی اور وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اس کے

لئے تیار تھے۔ لیکن اس مرتبہ ملک ماکھو نے بڑی خطرناک منصوبہ بندی کی تھی۔

جدید ترین آٹو میٹک گنوں کی اندھا دھند فائرنگ کا پہلا شکار احمد ہوا۔ چھ گولیاں اُس کے جسم کے مختلف حصوں میں لگیں۔ نبیل نے اپنی کمانڈو تربیت کے بل بوتے پر جی جان سے اس ناگہانی آفت کا مقابلہ کیا۔

قریباً بیس منٹ کی اس لڑائی میں حملہ آور اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ احمد اور اس کا ایک باڈی گارڈ اس حملے میں جان ہار گئے۔

نبیل نے زندہ بچ جانے والے باڈی گارڈ کے ذریعے احمد کو ہسپتال کے دروازے تک پہنچا دیا تھا لیکن احمد تب تک زندگی کی بازی ہار گیا۔ ایک باڈی گارڈ نے ملک شریف کو موبائل پہ حملے کی اطلاع دے دی تھی۔

ملک شریف کی مدد پہنچنے تک حملہ آور بھاگ گئے۔

احمد کی لاش گھر پہنچی تو کہرام مچ گیا......!

نبیل جانتا تھا اب اس کی ماں زندہ نہیں رہے گی۔ اُسے احمد سے عشق تھا۔

نبیل کو تو چاچا شریف نے پانچویں جماعت میں ہی شہر ہوسٹل میں داخل کر دیا تھا احمد ہی ماں کے پاس رہ گیا تھا یا پھر نبیل کی دو شادی شدہ بہنیں۔

غم اور غصے سے ملک شریف کی حالت غیر ہو رہی تھی سارا گاؤں اُس کی پشت پر کھڑا تھا۔ گاؤں والوں نے احمد کی تدفین تک پولیس کو وہاں گھسنے نہیں دیا۔

احمد کی تدفین مکمل ہونے کے بعد ملک شریف اُس کے بیٹوں اور باڈی گارڈز نے نبیل کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔

''چل پتر......'' چاچا شریف نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

''کہاں چاچا''......نبیل نے اُس کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھا

''گھر......پتر......'' ملک شریف نے کہا۔

''ناں چاچا......اب تو احمد کی چھوڑی پر تب ہی بیٹھوں گا جب ملک ماکھو اور اُس کے تینوں بیٹوں کا جنازہ نکلے گا''......نبیل نے اتنی سنجیدگی سے یہ بات کہی کہ چاچا شریف سہم کر رہ گیا۔

''ضرور اُٹھے گا پتر......بچ نہیں سکیں گے وہ، مریں گے۔ ضرور مریں گے، پر ابھی نہیں......ابھی ہمیں ویلا سنبھالنا ہے''......شریف نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''چاچا! میں نے ہمیشہ تم لوگوں کو اس کام سے روکا تھا۔ سارا ضلع جانتا ہے میں اس قتل و غارت گری کے خلاف ہوں......ماکھو کو بھی اس بات کا علم ہے لیکن انہوں نے میرے بھائی کو مار ڈالا......ناں چاچا! مجھ پر کھانا حرام......جب تک سود سمیت قرض نہ چکاؤں گا......''

شریف کا بڑا بیٹا ملک دلاور جان گیا تھا کہ خون نبیل کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ خود وہ بھی غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ وہ تو احمد کا جنازہ اُٹھنے سے پہلے حساب چکانا چاہتا تھا لیکن باپ کے مجبور کرنے پر رک گیا۔

''گھوڑیاں تیار کر لو اوئے''......دلاور کی اونچی آواز نے ملک شریف کو چونکایا۔

''دلاور پتر......سماں دیکھ۔ پاگل نہ ہو۔ وہ تیاری کے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ پولیس کو بھی بلایا ہوگا''......شریف نے بیٹے کو سمجھانا چاہا۔

''ناں چاچا ناں......میں چاچی سے آنکھیں کیسے ملاؤں گا۔ اوئے ہمارا شیر دھوکے سے مار دیا۔ ماکھو اور اُس کے بیٹوں نے۔ تو کس طرح نبیل کو روک چاچا......میں رُکنے والا نہیں''......

دلاور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے منت سماجت کی لیکن بات نہ بنی۔ ملک شریف کے لئے اب خود پر کنٹرول رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک اُس نے ہاتھ کھڑا کر کے سارے گاؤں کو مخاطب کیا۔

''پنڈ والیو! بس آج یہ کھیل ختم ہو جائے گا۔ اب ملک بشیر کی اولاد رہے گی یا پھر ملک حیات کی۔ دلاور کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔ میرے تین پتر ابھی باقی ہیں۔ مر گیا تو حساب برابر کریں گے۔ لیکن ماکھو اور اُس کے لڑکوں کی لاشیں دیکھے بغیر واپس نہیں آؤں گا......بھل چک ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ کوئی لین دین ہوا تو میرا بھائی ملک ناصر میرے بعد کنبے کا سربراہ ہے۔ چل دلاورے۔ چل پتر......''

اگلے دس پندرہ منٹ بعد ملکاں وال سے ملک شریف کی سربراہی میں ''وار'' نکل رہی تھی۔ دس گھوڑیاں گھوڑے دو جیپ بندوقیں اور گولیوں کے پٹے......ملک شریف نے ہاتھ باندھ کر اپنے باقی بیٹوں کو روکا تھا لیکن وہ نبیل کو نہ روک سکا۔

ملک ماکھو کے ڈیرے پر اُس وقت حملہ ہوا جب وہ اپنے لڑکوں کے ساتھ احمد کی موت کا جشن منا رہا تھا۔ معمول کی کارروائی پوری کرنے کے لئے اُس نے اپنے دو ملازم پولیس کو سونپ کر گنتی پوری کر دی تھی۔ ملک ماکھو کے کارندے شراب کے نشے میں بدمست ہو کر فائرنگ کر رہے تھے اور دو طوائفیں شام ڈھلنے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ رات کو یہاں مجرے کا پروگرام بنا ہوا تھا جب ملک شریف آسمانی بجلی کی طرح اُن پر آن پڑا۔

دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو ملکوں کی فوجیں آپس میں ٹکرا گئی ہوں۔ ملک شریف بوڑھا ضرور ہو گیا تھا لیکن اُس کی انگلی جوانوں سے زیادہ تیزی سے بندوق کا ٹریگر دبا رہی تھی۔ وہ سائے کی طرح نبیل سے چپٹا ہوا تھا۔ جبکہ دلاور اپنے بندوں کے ساتھ للکارے مارتا ملک ماکھو کے ڈیرے میں گھس گیا تھا۔ نبیل چیتے کی طرح چوکنا تھا اُسے اپنے مخصوص شکار کی تلاش تھی۔ یہ بات اُس کے علم میں آ چکی تھی کہ اُس پر حملے کی کمان ماکھو کا چھوٹا لڑکا بشیر کر رہا تھا جو پولیس کے کاغذات میں اشتہاری لیکن دن رات اپنے گاؤں مکھو والی کی گلیوں اور بازاروں میں دندناتا پھرتا تھا۔

دس منٹ کی تگ و دو کے بعد نبیل اُس کے سر پر پہنچ چکا تھا اُن سے اپنی تربیت کے مطابق اگلے دو منٹ میں ملک بشیر کو زیر کر لیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ بشیر کو چند منٹ کے اندر نبیل نے بے بس کر کے گھوڑے پر ڈال لیا تھا۔ ابھی اُس نے گھوڑی کو ایڑ ہی لگائی تھی کہ ماکھو کے بندے چوکس ہو گئے ایک ہی وقت میں تین چار رائفلیں اس سمت گولیاں اُگلنے لگیں لیکن ملک شریف اور اُس کے دو ساتھی درمیان میں آ گئے۔ نبیل نے اپنے چچا کو گولیاں کھا کر گرتے دیکھا اور لپک کر اُن تک پہنچا۔ اس سے پہلے کہ وہ اُسے تھامے۔ ملک شریف نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

''نبیل پتر......تجھے رب دی سونہہ۔ اگر تیرا میرا کوئی خون کا رشتہ ہے تو گھوڑی لے کر ملکاں والی پہنچ جا......جا......نکل جا......جا......جا!''......وہ دیوانہ وار چیخ رہا تھا۔

نبیل نے ایک نظر اپنے چچا پر ڈالی اور رسیوں میں جکڑے بشیر کو بنڈل کی طرح اُٹھا کر گھوڑی پہ پھینک دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ملکاں والی کی طرف نکل گیا۔ ملک دلاور نے دو سوار اُس کی پشت محفوظ رکھنے کے لئے اُس کے ہمراہ کر دیئے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ خود بھی اپنے باپ اور دو ساتھیوں کی لاشیں اُٹھائے للکارے مارتا

ملکاں والی کی طرف واپس آ رہا تھا۔ انہوں نے آج ماکھو والی کے ملکوں پر ایسا وار کیا تھا کہ سالوں اپنے زخم چاٹتے رہیں۔ ملک ماکھو اور اُس کے دو بیٹوں کی لاشیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تھیں۔ بشیر کو نبیل باندھ کر لے گیا تھا اور ملک ماکھو کے باقی دونوں لڑکوں نے حویلی میں پناہ لے لی تھی۔ حویلی پر حملہ کرنا دونوں خاندانوں کی روایت کے خلاف تھا۔ آج تک دونوں میں سے کسی نے عورتوں اور بچوں پر حملہ نہیں کیا تھا۔

ملکاں والی کی ملکانیاں ہاتھوں میں پستول پکڑے حویلی کے دروازے پر کھڑی تھیں۔ ملک ناصر اور اُس کے بندے گاؤں کی طرف آنے والے راستے پر ملک ماکھو کی ممکنہ جوابی یلغار روکنے کے لئے موجود تھے۔ نبیل گھوڑی بھگاتا حویلی کے دروازے پر پہنچا اور رسیوں میں جکڑے ملک بشیر کو ماں کے قدموں پر پھینک دیا۔

”میں نے کہا تھا ماں...... احمد کی قبر کی مٹی سوکھنے سے پہلے اُس کا قاتل تیرے قدموں میں لے آؤں گا...... یہ لے۔ یہ ہے تیرے بیٹے کا قاتل“......

احمد کی ماں نے رسیوں میں جکڑے بشیر کے منہ پر تھوک دیا۔

”مار ڈال...... مار ڈال اسے...... میرے سامنے مار کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کر“...... غم و غصے سے بے قابو صغراں نے چیختے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھ ہی ماں بیٹا دونوں نے ملک بشیر پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ اگلے روز پولیس کو ملک بشیر کی لاش احمد کی قبر کے نزدیک پڑی ملی تھی۔

سارے ضلع کی پولیس نے ملکاں والی اور ماکھو والی کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ جب تک دونوں اطراف کے مردے دفن نہیں ہوئے پولیس موجود رہی۔ فریقین نے اپنے چار چار، پانچ پانچ ملازم گنتی پوری کرنے کے لئے پولیس کے حوالے کردیے تھے۔

ماں بیٹے نے مل کر بشیر کی لاش احمد کی قبر کے نزدیک پھینکی تھی جہاں ملکانی صغراں نے اپنے وڈے پتر ملک نبیل سے وعدہ لیا تھا کہ وہ پاکستان میں نہیں رہے گا اور تب تک واپس نہیں آئے گا جب تک وہ خود نہیں بلائے گی۔ اُس نے نبیل سے کہا تھا کہ اگر اس نے ماں کا حکم نہ مانا تو وہ اپنی دھاریں اُسے نہیں بخشے گی۔ نبیل کو بادل نخواستہ حکم کی تعمیل کرنا پڑی اور وہ راتوں رات گجرات سے نکل گیا۔

ملک ماکھو کے بیٹے نے ملکاں والی کے ملکوں کے خلاف جو پرچہ درج کروایا اُس میں نبیل کو نامزد ملزم قرار دیا گیا تھا۔ یہ اُن کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ دونوں پارٹیوں کے ایک دوسرے کے خلاف درجنوں مقدمات زیر سماعت تھے جن میں کئی ایسے ملزموں کے نام شامل تھے جو اب اس دنیا میں رہے ہی نہیں تھے۔ دونوں پارٹیاں عموماً ایک دوسرے کے خلاف مقدمہ درج کرواتے ہوئے اصلی ملزم کا نام لکھواتے ہی نہیں تھے کیونکہ عرصہ پہلے انہوں نے اپنے مقتولین کا انصاف حکومت پر چھوڑنے کے بجائے یہ نازک ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے رکھی تھی اور ایک دوسرے کے مطلوب قاتلوں کو اپنے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد ہی طمانیت محسوس کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک غیرت مندی کا تقاضہ یہ تھا کہ اپنے مقتول کا بدلہ قاتل سے خود لیں۔ اس چکر میں دونوں طرف سے اب تک تیس افراد موت کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور ابھی یہ سلسلہ جاری تھا۔

ملک نبیل کا نام پرچے میں خلاف روایت اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ پولیس کا ملازم تھا اور ملک ماکھو پارٹی کی پہلی کوشش یہی تھی کہ اُسے پولیس کی نوکری سے چھٹی دلوائیں۔ انہوں نے جان بوجھ کر ملک دلاور کو نامزد نہیں

کیا تھا کیونکہ اپنی فرسودہ روایات کے مطابق وہ اپنے باپ ملک ماکھو اور بھائی ملک بشیر کے قتل کا بدلہ اُسے اپنے ہاتھوں مار کر لینا چاہتے تھے۔

نبیل کے لئے ماں کا حکم اللہ کے حکم کے برابر تھا ورنہ وہ اس حالت میں کبھی اپنی ماں سے الگ نہ ہوتا۔ بھائی کے قتل کے بعد تو اُس نے پولیس کی نوکری بھی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن جن حالات میں اُس کی ماں نے اُسے جان بچا کر دوسرے کسی ملک میں جانے کا حکم دیا تھا۔ اُس کے بعد نبیل میں انکار کی جرأت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ اپنے باپ کی واحد اولاد نرینہ باقی رہ گیا ہے۔ ایک ہی بھائی احمد تھا جو مارا جا چکا تھا اور اُس کی ماں اور چچا مرحوم کی شدید خواہش رہی ہوگی کہ اس کے خاوند اور مرحوم بھائی کی ”سنتان“ چلتی رہے۔ اُن کے لئے اپنی نسل جاری رکھنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ ایک دوسرے کا کوئی قرض باقی نہ رہ جائے۔

نبیل راتوں رات گجرات سے سینکڑوں میل دور پہنچ گیا تھا۔

اُس کی ماں نے ایک بیگ میں کچھ کپڑے نوٹوں کی گڈیاں اور ایک سونے کا خاندانی کڑا رکھتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”زندہ رہ گئی تو تیرے سر پر سہرا سجاؤں گی۔ مرگئی تو یہ خاندانی کڑا اپنی دلہن کو پہنا دینا اور کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا...... پترا! تجھے کچھ ہوگیا تو روز حشر میں تیرے باپ کو منہ نہیں دکھا سکوں گی...... اُس کی شدید خواہش تھی کہ تم دونوں خاندانی دشمنی کے اس شیطانی چکر سے نکل جاؤ لیکن تقدیر کے آگے کس کا بس چلتا ہے...... ہائے ظالموں نے میرے احمد کو مار ڈالا......“

وہ سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

حرف حرف روشنی

ہمارے اندیشے ہمیں دھوکا دیتے ہیں اور ہمیں اُن اچھائیوں سے محروم رکھتے ہیں جن کو ہم اپنی کوشش سے حاصل کرتے ہیں۔ (شیکسپیئر)

جب موت ہمیں اپنے وقت میں سے ایک لمحہ بھی نہیں دیتی تو ہم کیوں موت کو اپنی زندگی سے کوئی لمحہ دیں۔ (بقراط)

عیاری ایک چھوٹے کمبل کی طرح ہے۔ اگر اس سے سر چھپاؤ تو پیر ننگے ہوں گے اور اگر پیر چھپاؤ گے تو سر برہنہ ہوجائے گا۔ (اسکاٹ)

بلند اور قابل قدر مقصد میں ناکام رہنا بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ (سقراط)

میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ دولت بولتی ہے۔ ایک دفعہ اس نے مجھے کہا۔ ”خدا حافظ“

شاہدہ شبیر۔ ہنومان گڑھ

”حوصلہ کرو ماں جی! آپ ہمت ہار گئیں تو سب ختم ہوجائے گا۔ ماں جی خدا کے لئے مجھے خود سے الگ نہ کریں۔ آپ اکیلی......“

”ناں پتر ناں......“ اُس کی ماں نے نارمل ہوتے ہوئے نبیل کی بات کاٹی...... ”یہ بات نہ کرنا حشر کے روز تیرے باپ کو منہ نہیں دکھا سکوں گی اگر تجھے کچھ ہوگیا......“

نبیل کو اُس کی ماں نے جس دل کے ساتھ خود سے الگ کیا اُسے کوئی ماں کا دل ہی جان سکتا تھا۔ بادل نخواستہ وہ ماں سے الگ ہوا۔

نبیل کا پہلا ٹھکانہ ملتان کے ایک نواحی علاقے میں اُس کے خالہ زاد بھائی کا گھر تھا۔ گو کہ اُسے یقین تھا کہ

اس ٹھکانے کا اُس کے دشمنوں کو علم نہیں لیکن احتیاطاً اُس نے اپنے کزن دلاور ملک کے لئے اگلا پیغام چھوڑ کر یہ ٹھکانہ تبدیل کرلیا اور اب وہ حیدر آباد آگیا تھا جہاں اگلے ہی روز اُس کی والدہ اور دلاور ملک ملاقات کے لئے آئے جنہوں نے اُسے فی الوقت منظر سے غائب ہونے کی تلقین کی تھی۔ دلاور نے بڑے دُکھی دل کے ساتھ اُسے الگ کیا تھا۔

اُن کے لئے نبیل کو کسی بھی دوسرے ملک میں اپنی دولت کے بل بوتے پر آباد رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

یہ دلاور اور ماں سے اُس کی آخری ملاقات تھی۔ جس کے بعد اس نے اپنے ٹارگٹ پر کام شروع کیا۔ فون پر اُس کا رابطہ دلاور اور گھر والوں سے آخر تک قائم رہا۔ اُس کا دوست سب انسپکٹر بھی دلاور ہی کے ذریعے اُس تک پہنچا جس کی مدد سے اُس نے یہ سارا بندوبست کیا تھا۔ نبیل اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کبھی بھی جائز طریقے سے ویزہ حاصل نہیں کرسکتا۔ ویزہ حاصل کرنا تو ایک طرف اُس کا اصلی پاسپورٹ نہیں بن سکتا تھا جو اُس نے اپنے دوست کی مدد سے جعلی طریقے سے بنوایا تھا۔

آج وہ بالآخر اپنے اگلے سفر پر گامزن تھا۔ اُسے اپنی منزل کا علم نہیں تھا بس یہ جانتا تھا کہ پاکستان سے باہر کسی بھی مغربی ملک میں اُسے پہنچادیا جائے گا۔ ایک مرتبہ کسی بھی ملک میں پہنچ کر وہ اپنے گھر رابطہ کرتا تو وہاں اُس کے لئے تمام بندوبست ہوجاتے۔ پیسے کی اُسے کمی نہیں تھی۔ آج بھی پانچ ہزار ڈالر اُس کی جیبوں میں محفوظ تھے۔

ویگن کے سفر کا خاتمہ سمندر سے کچھ فاصلے پر ہوا۔ جہاں اُن کے ہمراہی نے اُتر کر ٹارچ سے سامنے کی طرف سگنل دیا اور کچھ دیر بعد انہیں دو بندے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے۔ اُن کے ہمراہی نے نبیل اور اُس کے ساتھیوں کو ان بندوں کے حوالے کردیا۔ جو انہیں ایک بڑی لانچ تک لائے۔

یہ مچھلیاں پکڑنے کا ایک بڑا ٹرالر تھا۔ جس کی تمام لائٹیں آف تھیں۔ انہیں ایک کشتی کے ذریعے اس ٹرالر تک پہنچایا گیا اور تھوڑی دیر بعد ٹرالر اپنے سفرِ موت پر روانہ ہوگیا۔ چونکہ پہلے ہی سے انہیں مکمل بریفنگ دے دی گئی تھی اور یہ بھی بتادیا گیا تھا۔ اس لانچ میں اُن کے سفر کا دورانیہ چار تا پانچ گھنٹے ہوگا جہاں ساحلِ سمندر سے انہیں ایک ویگن اُنکے اگلے ٹھکانے پر لے جاتی جہاں سے تین روز کے بعد انہیں الگ الگ فلائٹوں کے ذریعے اُن ممالک کی طرف جانا تھا۔ کس کے حصے میں کون سا ملک آئے گا؟

اس سوال کا جواب انہیں فلائٹ سے دو روز پہلے ملنا تھا تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت اور اگلی منزل سے آگاہ کرسکیں۔

سمندر پرسکون تھا...... ایک دم شانت! نجانے کیوں نبیل کو اس سکون سے وحشت سی ہو رہی تھی۔ دور دور تک بظاہر کسی ذی روح کا نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا بس لانچ کے انجن کی آواز تھی وہ بھی شاید اس لئے سنائی دے رہی تھی کہ سمندر خاموش تھا۔

نبیل لانچ کے عرشے پر دو لڑکوں کے ساتھ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ ایک صف انہوں نے نیچے بچھا رکھی تھی جس سے قالین کا کام لے رہے تھے۔ اُن کے سامنے بڑے بڑے لوہے کے کنڈوں سے مضبوط رسے بندھے تھے جن سے ممکن ہے کبھی ”لنگر“ کا کام لیا جاتا ہو۔ لانچ کے عرشے کی ریلنگ کے ساتھ تین چار ربڑ ٹیوبیں بندھی تھیں جن کا استعمال شاید کبھی نہ ہوا ہو لیکن وہ ہر لانچ کا حصہ سمجھی جاتی ہیں۔

تینوں آپس میں باتیں کر رہے تھے جبکہ اُن کا ایک

نگران لانچ کے ایک کونے میں سمندر پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ پھر وہ انجن روم میں چلا گیا۔ نبیل خود کو اذیت ناک سوچوں سے بچانے کے لئے ان لوگوں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ دونوں جوش و خروش سے اپنا اپنا تعارف کروا رہے تھے جبکہ نبیل اُن کی صرف ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔ اچانک انہیں دور سے ایک دھاڑ سنائی دی سب گھبرا گئے پھر یہ دھاڑ نزدیک آنے لگی اور اب انہیں لانچ سے کچھ فاصلے پر نیلا سمندر سفید جھاگ میں تبدیل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

سمندر کا پانی رات کے سناٹے میں اس طرح دھاڑ رہا تھا جیسے عرصے بعد بھوکے شیر کو شکار دکھائی دیا ہو۔

”یہ کیک کیا ہے“...... نبیل کے ساتھ لانچ کی دیوار سے چپٹے لڑکے افضل نے پوچھا

”شاید طوفان کہتے ہیں اسے“...... نبیل کو اُس کی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔

”لیکن یہ تو...... یہ تو......؟“

”یار چپ نہیں بیٹھ سکتے تم...... میں کیا اندھا ہوں مجھے دکھائی نہیں دے رہا“...... نبیل نے غصے سے اُس کی بات اس طرح کاٹی کہ افضل سہم کر اپنے آپ میں سمٹنے لگا۔

اچانک ہی نبیل کو احساس ہوا کہ لانچ کا انجن بند ہوگیا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پوری طرح گرفت میں آچکے ہیں۔ کچھ فاصلے پر موجود عملے کے ایک ممبر پر نبیل نے نظریں جمائی ہوئی تھیں اچانک ہی لائف جیکٹ پہنے انجن روم سے اوپر آگیا تھا۔

نبیل کا ماتا ٹھنکا۔

وہ سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور یہ لوگ شاید انہیں بے یار و مددگار سمجھ کر اُن کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہوگئے ہیں۔ عملے کا ممبر لانچ کے دوسرے کونے پر مضبوط جنگلے کی ایک موٹی سلاخ کو پکڑے سمندر پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ نبیل نے کچھ سوچتے ہوئے اُس کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔

اچانک ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے لانچ ایک طرف اُلٹ گئی ہو۔ دوبارہ اُس نے وہی سہارا تھام لیا جسے اب تک پکڑے بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ موجود تینوں لڑکے اونچی اونچی آواز میں چیخنے چلانے لگے تھے اور نبیل کو اُن کی بزدلی پر غصہ آرہا تھا۔

”چپ کرو ورنہ یہ لوگ تمہیں گولی ماردیں گے“۔

اُس نے دونوں کو ڈانٹا جن کے چہرے پر موت کی زردی چاند کی چاندنی میں بھی نبیل کو دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا انہوں نے اپنے بیگ اپنے جسموں سے اس طرح چپکائے ہوئے تھے جیسے اُن کے ساتھ ہی سمندر میں مچھلیوں کی خوراک بننے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ لانچ اس پوزیشن پر کچھ دیر رہنے کے بعد دوسری سمت لگنے والے طوفانی تھپیڑے سے اچانک اپنی پوزیشن پر واپس آگئی تھی۔

دونوں خوفزدہ لڑکے فٹ بال کی طرح اپنے بیگوں سمیت لڑھکتے لانچ کی دوسری دیوار سے ٹکرائے اور اُس پوزیشن میں سہم کر لیٹے رہے۔ اُنہوں نے عرشے پر پڑے مضبوط رسوں کا سہارا لیا ہوا تھا۔

نبیل نے اپنا بیگ وہیں رہنے دیا۔ اپنی کمانڈو تربیت کے مطابق اس نے بیگ میں صرف کپڑے رکھے تھے۔ اپنے پیسے زیر جامے اور جیکٹ کی مختلف جیبوں میں تقسیم کرکے رکھے ہوئے تھے۔ ماہر کمانڈو کی طرح وہ عرشے پر قلابازی لگا کر عملے کے اُس ممبر تک پہنچا تھا جو نبیل کی آمد سے بالکل بے خبر کھڑا تھا۔ اُس نے ابھی تک اپنی لائف جیکٹ کی زپ بھی بند نہیں کی تھی۔

”انجن کیوں بند ہوگئے“...... نبیل نے اُس کے

نزدیک پہنچ کر زور سے چلاتے ہوئے اُسے مخاطب کیا۔

اُس نے نبیل کی طرف ایسے مڑ کر دیکھا جیسے کسی مافوق الفطرت ہستی سے تعارف ہو گیا ہو...... اور خاموش کھڑا رہا۔

''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے''...... نبیل کا غصہ بڑھنے لگا تھا اُس نے جیکٹ والے کے بازو پر گرفت مضبوط کر کے اُسے قریباً جھنجوڑتے ہوئے پوچھا نبیل کے اس حملے نے اُس پر گھبراہٹ طاری کر دی تھی۔

''طوفان بہت تیز ہے، انجن کام نہیں کر رہے، کچھ دیر میں نارمل ہو گا تو انجن چلیں گے''...... اُس نے صفائی پیش کر کے اپنی جان چھڑانی چاہی۔

''تم نے لائف جیکٹ گلے میں ڈال رکھی ہے...... کیا ہم ڈوبنے والے ہیں''۔

نبیل کے اگلے سوال نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا۔

''ن ن نہیں...... نہیں...... ایسی بات نہیں...... وہ دراصل ہم......''

اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے نبیل نے عقاب کی طرح جھپٹ کر اُس کے گلے سے لائف جیکٹ نکالی اور اپنے گلے میں ڈال لی۔

''ہماری جان تم سے زیادہ قیمتی ہے......'' نبیل نے غصے سے اُسے گالی دے کر کہا۔

''خبردار! خبردار! گولی ماردوں گا۔ واپس لا جیکٹ''...... اُس نے اچانک کمر سے لگا پستول نکال کر نبیل کی طرف سیدھا کر لیا۔

اس سے پہلے کہ نبیل کچھ ردعمل دکھائے اچانک ایک تیز لہر نے ان کا توازن بگاڑ دیا اور پستول بردار پستول سمیت اس طرح جنگلے کے اوپر سے اُچھل کر باہر گرا جیسے کسی نے اُسے اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیا ہو۔

رسوں سے لپٹے دونوں لڑکوں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ نبیل نے جنگلے کو مضبوطی سے تھام کر سمندر پر نظریں جمائیں جہاں جھاگ اُڑاتی خونخواہ لہروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے گرنے والے کو ایک غوطے کی مہلت بھی نصیب نہیں ہوئی جس برق رفتاری سے وہ لانچ کی چھت سے قریباً اُڑتا ہوا سمندر میں گرا تھا۔ نبیل کو یقین تھا کہ لانچ کے انجن روم میں بیٹھے ہوئے اُس کے دونوں ساتھیوں کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

نبیل نے لانچ کے عرشے پر لگے بڑے بڑے کنڈوں میں پھنسے رسوں میں سے ایک رسہ باقی دونوں لڑکوں کی طرح تھام کر اپنے گرد لپیٹ لیا تھا اس کے علاوہ وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اچانک ہی اُسے احساس ہوا کہ یہ لانچ اپنے تمام مسافروں سمیت غرق ہونے والی ہے اور جس نوعیت کا یہ طوفان ہے اُس میں کسی کے زندہ بچ جانے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

اُسے کچھ علم نہیں تھا کہ اُن لوگوں نے اپنے سفر کا آغاز کس مقام سے کیا تھا سوائے اس کے کہ وہ بلوچستان کے کسی ساحلی علاقے سے روانہ ہوئے تھے۔ وہ کہاں جا رہے تھے؟ کس علاقے سے گزر رہے تھے؟ یہاں سے ساحل کتنی دور ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کس ملک کی سرحد نزدیک ہے؟

نبیل کے پاس کسی سوال کا جواب موجود نہیں تھا۔ اُس کی تربیت اور گھریلو حالات نے بدترین حالات میں بھی اُسے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا ہوا تھا جس کے بل بوتے پر اُس کے حواس قائم تھے ورنہ تو اس کے تمام ساتھی قریباً نیم مردہ ہو چکے تھے اور نبیل یہ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ اگر لانچ ڈوب گئی یا خدانخواستہ کوئی اور حادثہ ہو گیا تو ان کے ساتھ کیا گزرے گی اور وہ کس طرح آنے والے حالات کا سامنا کریں گے؟

اُسے اپنے ساتھ سفر کرنے والے تمام لڑکوں سے دلی ہمدردی تھی وہ جانتا تھا یہ سب غریب اور بے بس لوگ ہیں۔ خدا جانے کس کس طرح پیسے جمع کر کے اُنہوں نے ایجنٹ کو ادائیگی کی ہو گی اور اب......!

''اوہ میرے خدایا''...... اُس نے سوچا اور سہم کر رہ گیا۔

''کیا ہم سب یہاں سمندر میں بے بسی سے گمنامی کی موت مر جائیں گے؟ اُس نے خود سے کہا...... اس سے تو بہتر تھا وہ ملک ماکھو کے بیٹوں سے لڑتا ہوا مارا جاتا۔ اس طرح کم از کم غریب الوطنی میں بے نامی کی موت کے طعنے سے تو بچ جاتا......!

اُس نے اپنی سروس داؤ پر لگا دی تھی...... وہ قانون رکھوالا تھا اور اب قانون کا مجرم...... جلد ہی اُسے ملک ماکھو کے بیٹے عدالت سے اشتہاری قرار دلوا لیں گے جس کے بعد ملک بشیر کی طرح اُس کی موت کا بھی کوئی مول نہ پڑتا۔

تیراکی اُس کا شوق تھا۔ بچپن سے وہ دریائے چناب کی لہروں سے کھیلتا آ رہا تھا۔ کالج کے زمانے میں اُس نے تیراکی اور کشتی رانی کے کئی انعامات جیتے تھے لیکن کیا وہ سمندر میں بھی تیر پائے گا؟ اور کب تک؟

اُس نے ہالی وڈ کی ایسی فلمیں تو دیکھی تھیں جن میں جہاز تباہ ہونے کے بعد کچھ جوان ہمت سمندر کی بے رحم لہروں سے لڑتے جھگڑتے موت کے پنجے سے زندہ بچ کر ساحل پر پہنچ جایا کرتے تھے لیکن کیا عملی زندگی میں بھی ایسا ممکن ہے؟

وہ دل ہی دل میں اپنے بچ جانے کی دعائیں اس لئے بھی کر رہا تھا کہ اگر اُس کی ماں کو نبیل کی خبر نہ ملی تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر پائے گی۔ احمد کی موت نے ہی اُسے زندہ درگور کر دیا تھا یہ تو نبیل کو اچھی طرح اندازہ اور علم تھا کہ اُس کی ماں نے کس طرح دل پر پتھر رکھ کر اُسے ملک چھوڑ کر جانے کے لئے کہا تھا۔

اچانک ہی نبیل کو ایسے لگا جیسے لانچ مکمل اُلٹ گئی ہو......!

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے موت کا فرشتہ اُن کی جان لینے سے پہلے اچھی طرح اُنہیں موت کی شدت کا احساس دلانے پر تلا ہوا ہے۔ لانچ پانی میں اس طرح جھولے لے رہی تھی جیسے تیز ہواؤں میں کوئی پتہ اُڑتا چلا جا رہا ہو۔

خدا جانے لانچ ڈرائیور کو کیا محسوس ہوا یا پھر اُس نے اپنے طویل تجربے کی بنیاد پر لانچ کا انجن اچانک سٹارٹ کیا اور اُسے سمندر کی لہروں کی سمت پر ڈال دیا۔ رسوں

سے چٹے نبیل کو یوں محسوس ہوا جیسے لانچ لہروں پر ناچنے لگی ہو۔ اُسے تو اب تک اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ لانچ ڈوبی کیوں نہیں؟ جس شدت کا یہ طوفان تھا اس میں تو اسے اب تک ٹکڑوں میں بٹ جانا چاہیے تھا۔

خدا جانے یہ طوفان میں پھنسے کسی بے بس کی دعاؤں کا ثمر تھا کہ اچانک انہیں لانچ کے سنبھلنے کا احساس ہوا۔ سمندر آہستہ آہستہ شانت ہونے لگا تھا۔

جس طرح برق رفتاری سے طوفان نے انہیں اپنی لپیٹ میں لیا تھا اس طرح اُس نے خاموشی بھی اختیار کر لی۔ انجن سٹارٹ ہونے کے قریباً آدھا گھنٹہ بعد سمندر شانت ہو گیا۔ لیکن، اب ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ پہلے تو انجن روم والوں نے اپنے ساتھی کی گمشدگی پر اُن کی طرف بندوقیں تان لیں لیکن نبیل کے علاوہ چونکہ کسی اور کو اس حادثے کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اُس نے بھی سمندر کے تیور بدلتے دیکھ کر وہ لائف جیکٹ اُتار کر سمندر میں پھینک دی تھی اس لئے کسی کو اُس پر بھی شک نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے وہ سمندر میں ڈوب گیا ہے...... میں نے آخری مرتبہ اُسے لانچ پر جھک کر سمندر کی طرف منہ کئے دیکھا تھا جب اچانک لانچ اس طرف اُلٹ گئی تھی......"

نبیل نے اطمینان سے انہیں کہا تو وہ قدرے مطمئن ہوئے کیونکہ مالک کی طرف سے انہیں نبیل کے متعلق یوں بھی خصوصی ہدایات ملی ہوئی تھیں اور نبیل نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ لوگ اُس کے ساتھ باقی لڑکوں کے مقابلے میں امتیازی سلوک کر رہے تھے......!

"ہم کہاں ہیں...... اور ابھی منزل کتنی دور ہے......" اُس نے انہیں نارمل محسوس کرتے ہوئے اچانک ہی سوال کیا۔

"ابھی ہم کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے"......

آدھے سفید سر والے قادر بھائی نے جواب دیا جو ایک طرح سے اس لانچ کا کیپٹن بھی تھا......"

"میں سمجھا نہیں"...... نبیل نے اُچھلتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو یہ راستہ ہمارے لئے بالکل نیا ہے...... میں گزشتہ دس سال سے اس علاقے میں لانچ چلا رہا ہوں...... لیکن آج تک ایسے طوفان کا سامنا نہیں ہوا۔ ہم اپنے راستے سے بھٹک کر کہاں آ گئے ہیں۔ اس کا بالکل اندازہ نہیں ہو سکتا......" قادر بھائی نے جواب دیا۔

"ہمارا کیا بنے گا"؟...... ایک لڑکے نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہے...... آپ کو بحفاظت منزل تک پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے لیکن اس وقت ہم سب مصیبت کے شکار ہیں۔ ابھی رات ہے۔ میں لانچ کا انجن بند کر رہا ہوں۔ صبح ہونے پر ہم اندازہ لگانے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس علاقے میں ہمارا ریڈیو بھی کام نہیں کر رہا......" قادر بھائی نے انہیں سمجھایا۔

قادر بھائی بڑا سمجھدار اور بہادر آدمی لگتا تھا۔ اس نے بڑے نفسیاتی طریقے سے انہیں نارمل کیا تھا اور یہ احساس دلا دیا تھا کہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ انہیں فی الوقت صبر کرنا اور اچھے وقت کا انتظار کرنا ہے۔ اس نے اپنے ایک آدمی کو فوراً چائے تیار کرنے کا حکم دیا تھا اور تھوڑی دیر بعد وہ سب لانچ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے......

قادر بھائی اُس کا ساتھی لانچ کے ریڈیو پر مختلف سوئچ گھما رہے تھے۔ ریڈیو سے مختلف نوعیت کی آوازیں بھی نکل رہی تھیں لیکن ابھی تک وہ ریڈیو سے کوئی مدد لینے

کے قابل نہیں ہوئے تھے۔

"بے فکر رہو...... انشاء اللہ تھوڑی دیر بعد یہ سگنل پکڑ لے گا۔ کبھی کبھی سمندر میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں کم طاقت والا ہمارے جیسا ریڈیو کام نہیں کرتا......"

اُس نے انجن روم میں اپنے قریب ایک کرسی پر بیٹھے نبیل سے کہا جس نے چائے کا آخری لمبا گھونٹ بھر کر اپنا مگ ایک طرف رکھ دیا تھا۔ اچانک ہی قادر بھائی کے ساتھ ساتھ نبیل کا چہرہ بھی کھل اُٹھا جب اُنہوں نے ریڈیو کی "غوں غاں شوں شاں" کے درمیان ایک قدرے واضح آواز سنی۔

"مے ڈے...... مے ڈے...... مے ڈے......"

قادر بھائی نے مائیک میں اونچے اونچے بولنا شروع کیا...... اس کے ساتھ ہی اُس نے ہاتھ میں پکڑے مائیک کا آواز سننے والا بٹن دو مرتبہ دبایا شاید دوسری طرف سے رابطہ ہو رہا تھا۔

"راجر...... راجر...... پوزیشن بتاؤ...... کون ہو تم......" دوسری طرف سے جس لہجے میں پوچھا گیا اُس نے نبیل کو ضرور چونکا دیا۔ کوئی انگریزی میں بات کر رہا تھا لیکن اُس کا لہجہ دیسی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا......

شاید اس خطرے کا احساس قادر بھائی کو بھی ہو گیا تھا...... اُس نے ریڈیو فوراً آف کر دیا۔

"ہم کسی کی مدد نہیں لے سکتے...... مجھے یہ کوئی پاکستانی شپ لگتا ہے۔ پکڑے گئے تو مارے جائیں گے۔ ہم اپنی حدود سے بہت آگے آ چکے ہیں اور یہ غیر قانونی سفر ہے......" قادر بھائی نے کہتے ہوئے نبیل اور دوسرے دو لڑکوں کی طرف دیکھا جو انجن روم میں اُس کے ساتھ ہی بیٹھے تھے

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہم کسی اور مصیبت میں نہ پھنس جائیں"...... نبیل نے باقی دونوں لڑکوں کی ترجمانی کرتے ہوئے قادر بھائی سے کہا۔

سب خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک بے نام سے خوف نے اُن کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ رات دو پہر بیت رہی تھی۔ سمندر اب نارمل ہو گیا تھا اور سامنے کا منظر بھی قدرے نمایاں ہونے لگا تھا۔ ابھی تک اُنہوں نے انجن سٹارٹ نہیں کیا تھا اور لانچ سمندری لہروں پر ہی سفر کر رہی تھی۔

اچانک ہی لانچ کے عرشے سے قادر بھائی کا وہ ساتھی قریباً بھاگتا ہوا انجن رم میں آیا جس کے پاس نائٹ ویژن دوربین تھی...... یہ تھی تو اندھیرے میں

دیکھنے والی دوربین لیکن کسی بہت گھٹیا کمپنی کی بنی ہوئی تھی اور ایک خاص حد سے آگے اس سے دیکھنا ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ قدرے گھبرایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا"......؟ قادر بھائی نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا قادر بھائی ایک چھوٹا جہاز ہماری طرف آ رہا ہے......" اُس نے گھبراہٹ میں کہا۔

"کیا"...... بیک وقت وہاں موجود چار لوگوں کی زبان سے نکلا۔

"میں دیکھتا ہوں اوپر جاکر...... تو انجن سٹارٹ کر......" یہ کہتے ہوئے وہ قریباً بھاگتا ہوا اُس کے ہاتھ سے دوربین لے کر اوپر چلا گیا۔

انجن سٹارٹ ہوگیا اور سب بے چینی سے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگے جب قادر بھائی نیچے آیا "شاید میری ٹائم والے ہیں۔" ہم سرنڈر نہیں کر سکتے"......

یہ کہتے ہوئے اُس نے انجن وہیل کو اپنی بائیں سمت تیزی سے گھمایا اور لانچ بھگا دی......

نبیل بھاگتا ہوا اوپر چلا گیا۔ وہ بھی دوربین والے کے ہمراہ سامنے نظریں جمائے کھڑا تھا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی لیکن سمندر پر روشنی اُترنے لگی تھی اور سامنے کا منظر نمایاں ہونے لگا تھا۔ جس میں ایک تیز رفتار نیوی کی بوٹ اُن کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔

قادر بھائی ایک سمت لانچ بھگاتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک نبیل کو یوں محسوس ہوا جیسے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔ لانچ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔ بوٹ سے وارننگ دیئے بغیر اُن پر فائرنگ کی جارہی تھی۔ نبیل فوراً رسوں سے چپک گیا اور اگلا منظر اُس کے لئے لرزا دینے والا تھا۔ یہاں موجود تین نوجوان ایک کے بعد ایک گولیوں کا نشانہ بن کر ماہی بے آب کی طرح پہلے کچھ تڑپے اور پھر ٹھنڈے ہو گئے۔

بوٹ سے اُن پر اندھا دھند گولیاں برس رہی تھیں۔ نبیل کے لئے واحد راستہ سمندر میں چھلانگ لگانے کا بچ رہ گیا تھا اور ایسا ہی ہوا اُس نے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

اُس کی آنکھوں نے آخری منظر یہی دیکھا کہ لانچ میں آگ لگ چکی تھی اور اُس سے چیخوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لانچ تیزی سے اُس سے دور ہٹ رہی تھی اور بوٹ اُس کے تعاقب میں فائرنگ کرتی جارہی تھی۔ نبیل اُن دونوں سے قدرے فاصلے پر ایک سمت بہتا چلا جارہا تھا وہ بے حس لہروں پر پڑا تھا اور اُس نے خود کو مکمل حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔

اُس کی ہوشیاری تھی یا خوش قسمتی کہ اُس نے سمندر میں کودنے سے پہلے لانچ کی ریلنگ سے بندھی ٹیوبوں میں سے ایک اپنے گلے میں ڈال لی تھی اور اب اسی پر پڑا وہ سمندر کی لہروں کے ساتھ ساتھ بہتا چلا جارہا تھا...... کہاں؟

اس سوال کا جواب اُس کے پاس نہیں تھا۔ اُس نے اپنی آنکھوں سے جس طرح لانچ کو فائرنگ کے بعد آگ لگنے اور پھر دھماکے سے پھٹتے دیکھا تھا اس کے بعد وہ آسانی سے یہ کہہ سکتا تھا کہ اُس میں موجود کوئی شخص زندہ نہیں رہا ہوگا۔

اُسے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا اگر یہ "میری ٹائم" کی بوٹ تھی تو انہوں نے بغیر وارننگ کے لانچ پر اندھا دھند فائرنگ کر کے اُسے تباہ کیوں کر دیا۔ حواس باختہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بوٹ پر ایسا کوئی نشان یا جھنڈا نہیں دیکھ سکا جس سے اُس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔

کون تھے یہ لوگ؟ اگر یہ حکومت پاکستان کوئی

ایجنسی کے لوگ تھے تو انہیں وارننگ دینی چاہیے تھی......

اُس نے سوچا اور خود کو لہروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

گن بوٹ غائب ہو چکی تھی...... صبح ہو رہی تھی......

اُسے وقت کا اندازہ صرف ہاتھ پر بندھی گھڑی سے ہوا جس نے بتایا کہ اُسے لہروں پر تیرتے ڈھائی گھنٹے ہوگئے ہیں۔ اچانک ایک اُمید کی کرن دکھائی دی جب اُس نے کچھ سمندری پرندوں کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا اس کے ساتھ ہی حد نظر پر پہاڑی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جس سے اُسے قدرے حوصلہ ملا۔ اب کم از کم وہ ساحل سمندر تک تو پہنچ گیا تھا......

اُسے یہ تو اندازہ نہیں تھا کہ یہ ساحل کے ساتھ کون سا ملک آباد ہے لیکن اُسے اس بات کا یقین ضرور تھا کہ مڈل ایسٹ کے کسی بھی ملک میں ایک دفعہ پہنچ جانے کے بعد وہ محفوظ ہو سکتا تھا اور بعد کے معاملات اُس کے خاندان والے سنبھال سکتے تھے۔ ابھی تک اُس کے جسم سے جیکٹ چپکی ہوئی تھی۔ جس میں اُس نے ڈالر سنبھال کر رکھے تھے۔ ان ہی پر اُس کا دارومدار تھا ان کی مدد سے وہ اپنی سمت بڑھتے تباہی و بربادی کے سونامی کو بھلے کچھ دیر ہی کے لئے سہی روک ضرور سکتا تھا۔

ساحل پر پہنچنے تک اُسے سوائے پرندوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ ساحل سے کچھ فاصلے پر درختوں کا گھنا سلسلہ تھا۔ نبیل نے ٹیوب سے ہوا نکال کر اُسے وہیں ریت میں دفن کیا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔

یہاں پہنچتے تک وہ بری طرح تھک گیا تھا۔ ایک قدرے ہموار جگہ دیکھ کر نبیل وہاں لیٹ گیا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اس نیند سے وہ بیدار بھی اپنی مرضی سے نہیں ہوا تھا۔ ایک زوردار ٹھوکر جو اُس کی پسلیوں پر لگی تھی نے اُسے ہڑبڑا کر اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ نبیل نے آنکھ کھلنے پر جو پہلا منظر دیکھا وہ اتنا بھیانک تھا کہ اُس کا جی چاہا دوبارہ آنکھیں بند کر لے لیکن اب اُس کا کوئی عمل اختیاری نہیں رہا تھا۔

دوسری پسلی پر لگنے والی ٹھوکر نے اُس کے چودہ طبق روشن کر دیئے اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی طرف دو گنیں بیک وقت تنی ہوئی تھیں جبکہ بھارتی نیوی کے یونیفارم پہنے پانچ جوان اور افسر اُس کے سرہانے کھڑے تھے۔ کچھ فاصلے پر انڈین نیوی کی ایک جیپ کھڑی تھی جس کے وائرلیس سیٹ پر ایک جوان کسی سے بات کر رہا تھا غالباً وہ یہ اطلاع اپنے ہیڈ کوارٹر کو دے رہا تھا۔

"Stand up" (کھڑے ہو جاؤ) اُن کے آفیسر نے نبیل کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

نبیل بمشکل اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا جب اچانک اُنہوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے ایک پلاسٹک کی ڈوری سے باندھ دیا اس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اب وہ اُسے بازو سے پکڑ کر قریباً گھسیٹتے اور مارتے ہوئے اُس جیپ کی طرف لا رہے تھے۔

جیپ کا پچھلا دروازہ کھلا اور اُنہوں نے گٹھڑی کی طرح نبیل کو اُٹھا کر پیچھے پھینک دیا۔ اُس کے دونوں اطراف مسلح جوان سیٹوں پر بیٹھ گئے جنہوں نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ اُس پر رکھے ہوئے تھے۔

جیپ کا انجن سٹارٹ ہوا اور جھٹکے سے چل دی۔ نبیل کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہوا اُسے صرف ایک ہی ڈر کھائے جارہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ قسمت اُسے کہاں سے کہاں لے جارہی تھی۔

(جاری ہے)

تعاقب

خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے والے ایک نوجوان کی کہانی جو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا تھا

تعاقب

پہلی قسط کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہو کر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 2

اس تکلیف دہ سفر کا اختتام قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوا۔ اُس کے پاس وقت دیکھنے کی کوئی گھڑی تو نہیں تھی نہ ہی اُس کی جسمانی حالت اس قابل رہی تھی کہ وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکے۔ اُس کے جسم پر بھاری بھرکم ٹانگوں اور فوجی بوٹوں کا بوجھ تھا یہ اُس کی کمانڈو تربیت تھی جس نے ابھی تک اُس کے اوسان بحال رکھے تھے بصورت دیگر تو اس حالت میں شاید وہ دم گھٹنے سے مر جاتا۔

جیپ رُک گئی تھی اور اُس کے جسم پر پڑا بوجھ بھی ہٹنے لگا تھا سب ایک ایک کر کے جیپ سے باہر آ گئے تھے...... نبیل نے قدرے سکون کی سانس لی اور اُسی پوزیشن میں لیٹا رہا اچانک دو مضبوط ہاتھوں نے اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا اور جیسے ہی قدم زمین سے لگے اُس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاروں فوجیوں نے اُسے فٹ بال بنا لیا تھا۔

وہ اُسے مارتے اور گھسیٹتے ہوئے ایک بلڈنگ میں داخل ہوئے تھے۔ نبیل کے لئے صورتحال ناقابل برداشت ہو چکی تھی لیکن وہ مزاحمت سے گریز کر رہا تھا۔ ابھی تک وہ صورتحال کو سمجھنے ہی کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ اُسے ہو گیا تھا کہ اُن کی لانچ سمندری طوفان کی وجہ سے راستہ بھٹک کر بھارتی نیوی کے ہتھے چڑھ گئی تھی اور اُسے بھارتی نیوی نے ہی گرفتار کیا ہے۔ مسلسل مار پیٹ سے اُس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے تھے اُسے اپنے اردگرد موجود فوجی ہیولوں میں بدلتے دکھائی دے رہے تھے۔ عالم ہوش میں اُس کے لاشعور میں جو آخری منظر محفوظ ہوا وہ کسی کال کوٹھڑی کا سلاخوں والا دروازہ تھا۔ جسے کھول کر انہوں نے بے ہوش نبیل کو اندر پھینک دیا اور دروازے کو تالا لگا کر واپس لوٹ گئے۔

نبیل کب بے ہوش ہوا۔ اُسے کب ہوش آیا۔ کچھ خبر نہ تھی۔ ہوش آنے پر اُس نے خود کو ایک سیل میں بند پایا

جس پر سلاخوں پر مشتمل ایک مضبوط لوہے کا دروازہ نصب تھا۔ نبیل نے اس طرح کے سیل اور دروازے اپنی پولیس سروس میں دیکھے تھے۔ اسی لئے اُسے کوئی حیرانگی نہیں ہوئی وہ جانتا تھا ایک بڑی مصیبت سے نپٹنے کے لئے وہ اُس سے زیادہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور یہاں سوائے وہ اپنی تقدیر پر بھروسہ کرنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے فریاد کرنے کے اور کچھ کرنے پر قادر ہی نہیں۔

وہ کوٹھڑی کے ننگے فرش پر کمر کے بل لیٹا تھا جب اُس نے ہمت کرکے اُٹھنا چاہا تو بے اختیار منہ سے "ہائے" نکل گئی۔ اُسے یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کے ہتھوڑے سے اُس کے جسم کے قریباً ہر حصے پر ضربات لگائی ہیں۔ اُس کا جسم بری طرح دکھ رہا تھا کسی نہ کسی طرح ہمت کرکے وہ کوٹھڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور آنے والے حالات کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔

ابھی اُسے بمشکل اس پوزیشن میں بیٹھے دو تین منٹ گزرے ہوں گے جب تین چار ہٹے کٹے سفید پوش کوٹھڑی کی سمت بڑھتے دکھائی دیے۔ اُن میں سے ایک نے لوہے کے دروازے پر لگا تالا کھولا اور اندر آ گئے اندر آنے والے تین اہلکاروں میں سے دو نے اُسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا تیسرے نے ہتھکڑی پھرتی سے اُس کے ہاتھوں میں پہنادی جس کے بعد اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور وہ اُسے دوبارہ گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے۔

یہ کوئی بڑی عمارت تھی جس میں قریباً تین چار منٹ تک چلنے کے بعد اُسے ایک بڑے کمرے میں لایا گیا جہاں آنکھوں سے پٹی اُتار کر اُسے کمرے کے ایک کونے میں دھرے لوہے کے سٹول پر بٹھادیا گیا۔ اُس سے کچھ فاصلے پر ایک میز کے عقب میں پڑی کرسی پر ایک کرخت چہرے والا اہلکار اُسے مسلسل گھور رہا تھا اور میز پر اس کی تلاشی لینے سے ملنے والا سارا سامان رکھا تھا جس میں وہ ڈالر بھی تھے جو اُس نے بڑی احتیاط سے چھپائے ہوئے تھے۔

میز کے عقب میں بیٹھے افسر کے اشارے پر اُسے اندر لانے والوں نے اُس کی ہتھکڑی کھول دی۔ اس سے پہلے کے نبیل کو کچھ سمجھ آئے انہوں نے اُس کے دونوں بازو کمر کے پیچھے کرکے اُلٹی ہتھکڑی لگادی۔ اب وہ کسی بھی طرح اپنے اوپر ہونے والے کسی حملے کو روکنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

"کیا نام ہے تیرا"؟ کرسی کے عقب سے گھورتی آنکھوں نے اُس سے سوال کیا۔

"ملک نبیل احمد"...... نبیل نے اپنا نام بتایا۔

اس کے بعد اُس نے بڑی تیزی سے نبیل سے اُس کے گھربار، خاندان وغیرہ کے متعلق سوالات کرنے شروع کردیے۔ جن کا نبیل نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ جواب اور سوال ریکارڈ ہورہے ہیں۔

"ہندوستان میں کیا کرنے آئے تھے؟"

اچانک ہی نبیل کے عقب سے آواز سنائی دی۔ نبیل نے قدرے گردن گھما کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن گردن پر لگنے والی زبردست ضرب نے اُسے دوبارہ سامنے دیکھنے پر مجبور کردیا۔

"خبردار اگر اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی کوشش کی"...... عقب سے پھنکار سنائی دی اور اُس کے ساتھ ہی ایک اور بڑی بڑی مونچھوں والا انسان نما درندہ اُس کے عقب سے نکل کر سامنے آ گیا۔

"کیا کرنے آئے تھے ہندوستان"؟...... اس نے سوال دھرایا۔

نبیل کو بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہ شخص کس وقت اُس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

"میں ہندوستان نہیں دوبئی جا رہا تھا"......

نبیل نے اپنی دانست میں بڑے اعتماد سے کہا

"بکواس کرتے ہو تم؟"...... اس مرتبہ میز کے پیچھے والا پہلے سے یہاں موجود افسر غرایا۔

"دیکھئے آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ میرا ہندوستان سے کیا لینا دینا میں ایک ایجنٹ کو پیسے دے کر یورپ جا رہا تھا اور وہ ہمیں لانچ کے ذریعے دوبئی لے جانا چاہتا تھا جہاں سے ہم نے آگے کا سفر کرنا تھا جس کا ہمیں تو علم بھی نہیں تھا...... اچانک طوفان نے...... ابھی اُس کی بات نامکمل تھی جب اُس کی پشت پر کسی نے اتنی زور سے ڈنڈہ مارا کہ نبیل سٹول سے منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ اُس کی ناک پر چوٹ آئی تھی جس سے خون بھی جاری ہوگیا تھا لیکن وہ اپنا ناک بھی صاف نہیں کرسکتا تھا۔

دونوں اہلکاروں نے دوبارہ اُسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا اور لوہے کے اس سٹول پر بٹھادیا۔

"بکواس کرتے ہو تم...... جھوٹ بول رہے ہو تم......؟" تفتیشی افسر نے غصے سے کھولتے ہوئے کہا......

نبیل کا دل چاہا کہ ابھی اس کا ٹینٹوا دبا کر اس کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش کردے لیکن وہ اپنی اسی حسرت کو دل ہی میں دفن کرکے چپ رہا کیونکہ اپنی مرضی سے اُس کے لئے یہاں سے ہلنا بھی فی الحال ممکن نہیں تھا۔

"یہ ہزاروں ڈالر اپنے ساتھ لے کر تم بھارت میں کیا کرنا چاہتے تھے؟...... کہاں بھیجا گیا تھا تمہیں؟...... کس ایجنسی نے بھیجا ہے تمہیں؟ اس کے ساتھ ہی دوسرے افسر نے تابڑتوڑ سوالات شروع کردیے۔

نبیل کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کس عذاب میں پھنس گیا ہے۔ ابھی کچھ روز پہلے ہی ہندوستان میں تخریب کاری کی ایک اہم واردات کرنے والوں نے بھارتی ایجنسیوں کو بتایا تھا کہ وہ سمندر کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور نبیل کو سمجھ آ گئی کہ یہ لوگ اس کا تعلق بھی کسی ایسے ہی دہشت گرد گروپ سے جوڑ رہے ہیں جو سراسر غلط اور بے بنیاد تھا۔

دونوں افسران اُس پر تین گھنٹے تک پے در پے سوالات کرتے رہے نبیل کا جواب خلاف توقع ہونے پر وہاں موجود اہلکار اُسے جانوروں کی طرح پیٹتے رہے۔ اس دوران ایک مرتبہ پھر وہ بے ہوش ہوگیا تھا لیکن ہوش میں آنے کے فوراً بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ اپنی گرفتاری سے ابھی تک کسی نے اُسے کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں دیا تھا۔

تین گھنٹے تک اُس پر وحشیانہ تشدد کرنے کے بعد جب انہیں یقین ہوگیا کہ اس کے بعد نبیل پر مزید تشدد

کی گنجائش فی الوقت باقی نہیں رہی تو وہ اُسے دوبارہ ڈنڈا ڈولی کرکے اُس کوٹھڑی میں پھینک گئے۔

نبیل کا جسم دُکھتا ہوا پھوڑا بن گیا تھا۔

کسی بھی کروٹ ڈھنگ سے زمین پر بیٹھنا بھی اُس کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔ دُکھ تکلیف سے زیادہ احساس بے بسی اُس پر غالب تھا۔ رہ رہ کر ایک ہی پچھتاوا اُس کی جان کو آ گیا تھا کہ اُسے ایک ناکردہ جرم کی سزا مل رہی ہے۔ اگر وہ کسی پاکستانی ایجنسی کی طرف سے کسی مشن پر بھارت آتا اور گرفتار ہونے پر اُس کے ساتھ اس طرح تشدد ہوتا تو اُسے اس پر فخر ہوتا لیکن یہاں تک وہ جن حالات و واقعات کا شکار ہوکر پہنچا تھا اُس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

نبیل کا تعلق ایک بہادر اور دشمن دار گھرانے سے تھا۔ دُکھ تکلیف تھانہ کچہری اُن لوگوں کے لئے کبھی کوئی نئی بات نہیں رہی تھی لیکن یہاں تو صورتحال بالکل ہی خلاف توقع اور انتہائی پریشان کن تھی۔ ایک پولیس افسر ہونے کے ناطے اُسے اس بات کا بھی شدت سے احساس تھا کہ وہ جاسوسی اور تخریب کاری کے جرم میں گرفتار ہوا ہے اور جلد یا بدیر بھارتی حکومت اُسے پریس کے سامنے ایک پاکستانی دہشت گرد کی حیثیت سے پیش کردے گی۔ اُس کا نام پتہ بالکل درست تھا جس طرح آج کل بھارتی حکومت نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ جنگ بھرپور انداز سے شروع کی ہوئی ہے اُس کے بعد ان سے کسی خیر کی توقع ہی عبث تھی۔

نبیل نے تو اپنا صحیح نام پتہ اس لئے بھی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی اصلیت چھپا کر اپنے لئے مزید مصیبتیں کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اُسے کیا علم تھا کہ جس مصیبت سے بچنے کے لئے اس نے سچ بولا تھا وہ اب کئی گنا مزید بڑھ کر اُس کے گلے کا ہار بننے والی ہے۔

اُسے ایک پولیس آفیسر اور صحافت کا سابق طالبعلم ہونے کے ناطے اس تلخ حقیقت کا ادراک بھی تھا کہ پاکستان کا نوزائیدہ الیکٹرانک میڈیا ابھی تک قومی معاملات اور حساس معاملات کو دیگر معاملات سے الگ کرکے دیکھنے کے قابل نہیں ہوا اور جیسے ہی اُس کی تصویر آن ائر ہوئی ایک طوفان بدتمیزی اُس کے اپنے ملک کا غیر ذمہ دار میڈیا ہی کہیں اُس کے خلاف کھڑا نہ کردے کیونکہ کچھ دن پہلے ہی جب بھارتی میڈیا سے ممبئی حملے کے ایک ملزم کی تصویر جاری ہوئی تو پاکستان ہی کچھ انتہائی غیر ذمہ دار صحافی غیر ملکی ایجنسیوں سے پہلے اُس کا گھر تلاش کرکے اُسے اپنا ''کارنامہ'' بنا کر اپنی دانست میں تو ''نمبرون'' بن رہے تھے جبکہ اصل میں انہوں نے دشمن کے ہاتھوں میں آہنی دستانے پہنا دیے تھے جن سے اُس نے پھر جی بھر کے پاکستانی سالمیت پر مکہ بازی کے جوہر دکھائے۔ اُسے رہ رہ کر یہی غم کھا رہا تھا کہ اُس کے مسئلے پر بھی یہی تاریخ نہ دھرا دی جائے۔

نبیل کے خیالات کا سلسلہ کوٹھڑی کی سمت آتے قدموں کی آواز سے ٹوٹا۔ یہاں راہداری میں اسی طرح کی چار کوٹھڑیاں تھیں جن میں سے صرف ایک میں وہ بند تھا جبکہ باقی خالی تھیں اُسے اس بات کا علم یا احساس بھی نہیں تھا کہ اس وقت دن کا کون سا پہر ہے۔ دن ہے یا رات...... کیونکہ جب سے اُسے یہاں پھینکا گیا تھا تب سے اب تک اُس نے آسمان نہیں دیکھا تھا۔ اُسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی لایا اور واپس لے جایا گیا تھا۔

قدموں کی آواز نمایاں ہو رہی تھی پھر اُسے بلب کی روشنی میں دو پہرے دار اس طرف آتے دکھائی دیے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑی سی بالٹی اور دوسرے کے ہاتھوں میں کچھ برتن پانی کی ایک بالٹی پکڑی ہوئی تھی۔

نبیل کے سیل کے نزدیک پہنچ کر دونوں رُک گئے۔

ایک نے سلاخوں سے پلاسٹک کی ایک گندی سی پلیٹ اور ایک کپ اندر پھینک دیا۔

''روٹی لے لے اوئے''...... دوسرے نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا نبیل کے لئے گو کہ یہ سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ لیکن فی الوقت اُسے اپنی توانائیاں بحال رکھنی تھیں۔ وہ سوائے دیکھنے اور انتظار کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا تھا اور اُس نے یہی کیا۔

پلاسٹک کی گندی پلیٹ اُس نے سلاخوں سے لگائی جس میں ایک لمبی سی کپی کے ذریعے آنے والوں میں سے ایک نے دال کی ایک کرچھی بھر کر اُس کی پلیٹ میں ڈال دی۔ کپڑے میں بندھی بڑی بڑی روٹیوں میں سے ایک روٹی نکال کر اس پر پھینک دی جب کہ دوسرے نے اس طرح اُس کا پانی والا کپ بھر دیا۔

''ہم لنگر آگے تقسیم کرکے ابھی واپس آرہے ہیں۔ کپ چائے کے لئے خالی رکھنا''...... کہہ کر وہ آگے چلے گئے۔

نبیل کو اب اندازہ ہوا کہ یہاں اُس کی طرح اور لوگ بھی بند ہیں لیکن ابھی تک اُسے اور کسی کی موجودگی کا نہ تو علم تھا نہ احساس۔

نبیل نے سب سے پہلے پانی کے چند گھونٹ گلے میں اُتارے اور خود کو قدرے نارمل کیا جس کے بعد آنکھیں بند کرکے لقمے زہر مار کرنے لگا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اس سے بدتر کھانے کا تصور نہیں کیا تھا۔ ایک پاکستانی پولیس آفیسر ہونے کے ناطے وہ ان سب معاملات سے آگاہ تھا لیکن اُسے یاد نہیں تھا کہ دوران تفتیش کم از کم کھانے کے معاملے پر کسی پاکستانی یا غیر ملکی ملزم سے اُس کی موجودگی میں ایسا سلوک کیا گیا ہو۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہی لنگر تقسیم کرنے والے واپس آ گئے نبیل نے اُن سے دوبارہ پانی کا ایک بڑا کپ لے کر اپنے حلق میں انڈیلا اور وہ چائے کے نام پر کوئی گرم سا محلول اُس کے کپ میں ڈال کر وہاں سے چلے گئے۔

یہ گرم محلول بھی اُس نے جیسے تیسے زہر مار کرلیا اور زمین پر ہی لیٹ گیا۔ گرمی سردی کا احساس دم توڑ چکا تھا۔ کھانے کے چند لقمے اور پانی اس کے معدے میں جانے سے اُس کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ جانے کب سے وہ مسلسل اذیت کا نشانہ بن رہا تھا گو کہ وہ ایک مضبوط جسم اور دل کا مالک تھا لیکن انسانی جسم کی برداشت کی بھی یقیناً کوئی حد تھی۔

اپنے ایک بازو کا سرہانہ بنا کر وہ کسی نہ کسی طرح کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ رات یا دن کا کون سا پہر تھا جب اس کی چند لمحوں کو ہی آنکھ لگی تھی جب اچانک کمر میں لگنے والی ایک زوردار ٹھوکر سے اُس کی آنکھ کھل گئی اُس کے سیل میں وحشی درندے گھس آئے تھے جو اُسے دوبارہ ہتھکڑی لگا کر آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھسیٹتے ہوئے کوٹھڑی سے باہر لے گئے۔

اس مرتبہ اُسے جس کمرے میں لے جایا گیا وہ شاید یہاں کا کوئی عقوبت خانہ تھا۔ نبیل کے دونوں ہتھکڑی میں بندھے ہاتھوں کو لوہے کی ایک مضبوط سلاخ سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ اس کے لئے حرکت کرنا بھی ممکن نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی اُس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جانے لگے۔

نبیل کے جسم کو ڈنڈوں سے اس بے رحمی سے پیٹا گیا کہ اُس کو اپنی نس نس میں خون کے بجائے دور رینگتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے نبیل کے خلاف ہر وہ غیر انسانی ہتھکنڈہ اپنایا جس کا تصور بھی کوئی مہذب انسان نہیں کرسکتا۔ تھرڈ ڈگری تشدد کا یہ سلسلہ کب شروع ہوا اور کب ختم ہوا اس کا نبیل کو کچھ اندازہ نہیں تھا اُس نے یہ ساری مدت نیم بے ہوشی کے عالم میں گزاری۔ جب بھی اُسے ہوش آیا اُس نے خود کو اسی عالم میں پایا۔ جانے کتنے دنوں بعد انہوں نے جب بالآخر یہ یقین کرلیا

کہ نبیل جو کہہ رہا ہے اس کے علاوہ اُس کے منہ سے کچھ بھی نہیں اُگلوا پائیں گے کیونکہ نبیل نے بھی یہ ٹھان لی تھی کہ وہ اپنی طرف سے اپنے ملک پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا اور جب تک اُس کے جسم میں جان باقی ہے وہ پاکستانی دہشت گرد ہونے کا جھوٹا اقرار نہیں کرے گا۔ اُسے آخری دنوں میں بار بار یہی احساس دلایا گیا کہ اُسے بہر حال یہ اقرار کرنا پڑے گا اور ایک ایسے بیان پر دستخط کرنا پڑیں گے جس میں وہ اپنے پاکستانی دہشت گرد ہونے اور خود کو پاکستان کی انٹیلی جنس ایجنسی کی طرف سے بھارت میں داخل کیے جانے کا اقرار کرے گا۔

نبیل کی تفتیش پر مامور بھارتی اینٹی ٹیررسٹ ایجنسی کے ماہرین کا پالا زندگی میں ایسے کسی ملزم سے نہیں پڑا تھا انھوں نے جس جس نوعیت کے مظالم نبیل پر ڈھائے تھے وہ تو پتھروں کو بھی زبان دے دیا کرتے تھے لیکن وہ جب بھی ہوش میں آتا ایک ہی بیان دیتا کہ وہ لانچ کے ذریعے دوبئی جا رہا تھا جب اُن پر فائرنگ شروع ہوگئی۔

ایجنسی کے ماہرین کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے انہوں نے نبیل پر بالآخر ''پولی گراف ٹسٹ'' (جھوٹ پکڑنے والا ٹیسٹ) بھی آزمایا تھا اور اُسے سچا پایا، لیکن ایک مرتبہ قابو آجانے والے اس ''مرغے'' کو جو اندھے کے ہاتھ میں بٹیر کی طرح پھنس چکا تھا وہ اس طرح جانے نہیں دے سکتے تھے ''ہائی کمان'' کی طرف سے حکم تھا کہ اُس سے ہر صورت اپنی مرضی کا بیان لیا جائے کیونکہ انہیں اس وقت ایسے کسی ''مرغے'' کی سخت ضرورت تھی جس کے ریکارڈڈ بیان کو وہ امریکیوں کے سامنے پیش کرکے پاکستان پر پہلے سے موجود دباؤ کو کئی گنا بڑھا کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر سکتے تھے۔

بھارتی انٹیلی جنس کی 'ہائی کمان' جو کرنا چاہتی تھی وہ نبیل بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اور وہ جیتے جی کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کھیل کا حصہ بنے۔ اُس کے خاندان نے کبھی زندگی میں اپنے ذاتی دشمنوں کے سامنے شکست قبول نہیں کی تھی اور اس چکر میں اپنا آدھا خاندان مروا لیا تھا اب وہ اپنے ملک کے دشمنوں کے سامنے کس طرح ہتھیار ڈالتا یہ اُس کی مردانہ غیرت کی توہین تھی۔

بھارتی انٹیلی جنس نے بظاہر تو نبیل کے آہنی عزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن اپنا گھناؤنا کھیل جاری رکھا۔

○

سلطان پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی کہ لانچ بھی تباہ ہوگئی اور اس کی تمام سواریاں بھی غائب ہیں۔ وہ گزشتہ بیس سال سے انسانوں کی غیر قانونی سمگلنگ کے دھندے سے وابستہ تھا اس دوران کئی مرتبہ اُسے ایف آئی اے نے گرفتار اور عدالت نے رہا کیا تھا جس کا بڑا سبب اُس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے پیشے کا چیمپئن سمجھا جاتا تھا اُس نے انسانوں کی سمگلنگ کا غیر قانونی دھندہ تو کیا تھا لیکن انسانی جانوں کا دھندہ کبھی نہیں کیا تھا۔ اس کے بھیجے بندے دو تین مرتبہ دنیا کے مختلف ائر پورٹس سے گرفتار تو ہوئے تھے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اُس کے کسی بندے کی جان گئی ہو......

آج جب اُسے یہ خبر ملی تو اُس نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنے ماتھے پر مارا تھا۔

ساری زندگی کی ساکھ داؤ پر لگ گئی تھی...... اس پیشے سے اُس نے کروڑوں روپے کی جائیدادیں پاکستان اور غیر ممالک میں بنائی تھیں اور درجنوں لوگ نوٹوں کے بنڈل اُٹھا کر اُس کے پیچھے گھوما کرتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنی دانست میں انہیں غیر قانونی طریقے ہی سے سہی اپنی منزل تک پہنچانے میں کبھی غیر ذمہ داری کا

مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا اب تک اُس کے ذریعے دنیا کے مختلف ممالک میں پہنچنے والوں کی تعداد درجنوں سے اب سینکڑوں میں ہوگئی تھی لیکن آج کے حادثے نے اُس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

اس کی وجہ صرف جانوں کا ضیاع تھا اُسے اپنی لانچ کا قطعاً کوئی افسوس نہیں تھا اور ان انسانوں میں ملک نبیل بھی شامل تھا۔ ملک نبیل اُس کے پاس جن بندوں کے ذریعے پہنچا تھا اگر انہیں اس بات کی بھنک بھی لگ گئی کہ نبیل غائب ہے تو سلطان کے لیے دنیا کا کوئی کونہ محفوظ نہیں رہے گا وہ اُسے زندہ زمین میں گاڑ دیتے۔ گو کہ ابھی تک صرف تین لاشوں کی اطلاع پریس کے ذریعے سامنے آئی تھی لیکن ایک بے نام سے خوف نے اُسے اپنے حصار میں لے لیا تھا اور اب وہ بے چینی سے ''وریام'' کا منتظر تھا جس کو اُس نے لانچ اور اُس کے مسافروں کی خیر خبر کی ذمہ داری سونپی تھی۔

وریام سی آئی ڈی میں انسپکٹر اور سلطان کا لنگوٹیا یار تھا۔ وریام کی رسائی بسا اوقات اتنی معلومات تک ہوجاتی تھی جن تک عام حالات میں بڑے بڑوں کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ بڑی بے چینی سے اُسے وریام کے فون کا انتظار تھا۔ خدا خدا کرکے بالآخر موبائل پر وریام کا وہ نمبر جگمگایا جو اُس کے حلقۂ خاص کے لیے مختص تھا اور محکمہ تو دور کی بات اُس کے گھر والوں کو بھی اس نمبر کا علم نہیں تھا۔

''ہاں کیا خبر ہے''؟

سلطان نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''بڑی حیران کن اطلاعات ہیں سلطانے!'' وریام کی آواز سے تشویش عیاں تھی۔

''یار کچھ بتائے گا بھی یا......''

''حوصلہ کیا کر...... تیرا یہی اُتاؤلا پن تجھے کسی دن لے ڈوبے گا''...... وریام نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا......''سمندر میں خلاف توقع طوفان آیا تھا تم جانتے ہو سال میں دو تین مرتبہ اس روٹ پر ایسا ہوجاتا ہے۔ راستہ بھول کر تمہاری لانچ بھارتی بحریہ کے جال میں پھنس گئی جنہوں نے اُس پر فائرنگ بھی کی تھی''......

''فائرنگ؟'' میرا مطلب ہے یار...... فائرنگ کیوں؟ وہ اسے گرفتار کر سکتے تھے...... آسانی سے......''

سلطان نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں...... لیکن معاملات آج کل کچھ اور طرح سے چل رہے ہیں بھارتی حکومت انہیں دہشت گرد اور گھس بیٹھیے قرار دے کر اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کرے گی اور ایسا کرنے کے لیے انہیں مارنا اور لانچ پر قبضہ کرنا ضروری تھا...... ممکن ہے کوئی زندہ بھی گرفتار ہوگیا

سنہری باتیں

جس نے کبھی دشمن نہیں بنایا۔ وہ کبھی دوست بھی نہیں بنا سکتا۔ (لارڈ ٹینی سن)

انسان کو بلندی پر لے جانا مشکل ہے، گرا دینا مشکل نہیں۔ (روسی کہاوت)

ماں باپ کی مسرتیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور وہ اپنے غموں کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ (بیکن)

ضمیر کی خلش اس دنیا کو ہی دوزخ بنا دیتی ہے۔ (یورمو)

جو شخص اپنے ارادے کا پکا ہو، وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ (گوئٹے)

(زینب صدیقی، کوٹ ادو)

ہو؟......

وریام نے بتایا۔

”وریام یہ تمہارے دوست کا کی زندگی موت کا مسئلہ ہے جس طرح سے ممکن ہو مجھے زندہ بچنے والوں کے نام بتادو......“

سلطان کا لہجہ اُس کے دوست وریام کے لئے بالکل اجنبی تھا اُس نے آج تک سلطان کو اتنا پریشان نہیں دیکھا تھا۔

”یار کیا بزدلوں کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں سلطان خان تم......“

”وریام تم معاملہ کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہے......“ اُس نے وریام کی بات کاٹتے ہوئے ملک نبیل کے خاندان کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

”میرا سارا خاندان گجرات میں آباد ہے۔ یہ ملک چن چن کر ایک ایک کو مار ڈالیں گے“......

خاصا سیریس معاملہ تھا وریام اس وقت فون پر اُس کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا وہ فون پر زیادہ بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”اس وقت زیادہ بات ممکن نہیں تم کل پرسوں تک مجھ سے ملو پھر بات کرتے ہیں۔ مطمئن رہنا تمہارا دوست تمہارے ساتھ ہے“......

وریام نے فون آف کر دیا۔

سلطان کی پریشانی مزید بڑھ گئی تھی وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ بچ جانے والا نبیل ہو اس کے بعد تو ممکن ہے وہ اپنے انڈر ورلڈ کے دوستوں کے ذریعے کچھ کر سکے۔ کچھ بھی ایسا جو اُس کے خاندان کو تباہی و بربادی سے بچا سکے۔

O

کمانڈر عاطف کے لئے یہ اطلاع بڑی حیران کن تھی جو اُسے سمندر پر ریکی کرنے والے نیوی کے سکواڈرن انچارج کی طرف سے ملی تھی جس نے ایک تباہ حال پاکستانی لانچ کو سمندر کی لہروں پر ڈوبتے اُبھرتے دیکھا تھا۔ پائلٹ نے اپنے جہاز میں موجود انتہائی حساس کیمروں سے اس لانچ کی تمام جزئیات اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں اور اب وہ تصویروں کی شکل میں کمانڈر عاطف کے سامنے دھری تھیں۔

نیوی انٹیلی جنس کے اس ایڈوانس یونٹ کی ذمہ داری سمندری نقل و حرکت اور اس علاقے میں ہونے والی غیر قانونی سرگرمیوں کو مانیٹر کرنا تھا۔

سمندری حدود پر کوئی کانٹے دار تار تو لپٹی نہیں ہوئی تھی نہ ہی رات کے اندھیرے یا دن کے اُجالے میں وہاں نشاندہی کے لئے کوئی ٹاور نصب تھے اس لئے دونوں ممالک کے مچھیرے کبھی کبھی شکار کرتے ایک دوسرے کے علاقے میں گھس جاتے تھے۔ جنہیں بھارتی اور پاکستان نیوی کی گشتی گن بوٹس گھیر کر اپنے اپنے ایریا سے گرفتار کر لیا کرتی تھیں۔

یہ معمول کی کارروائی تھی جو گزشتہ چالیس پچاس سال سے جاری تھی پہلے پہل تو ان مچھیروں کو وارننگ دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ لیکن دونوں ممالک کے درمیان دو بڑی جنگوں اور پھر موجودہ حالات میں جاری سرد جنگ کی وجہ سے اب حالات نے اچانک پلٹا کھایا تھا جس کی وجہ سے ان مچھیروں کی کم بختی آ گئی تھی۔ گرفتاری کی صورت میں نہ صرف اُن کی شکاری لانچیں ضبط ہو جاتی تھیں بلکہ انہیں کئی کئی سال دونوں ممالک کی جیلوں میں کاٹنے پڑتے تھے۔ سزا مکمل ہونے پر بھی قسمت سے ہی رہائی ملتی تھی۔

کمانڈر عاطف کے لئے یہ خبر موجودہ حالات میں کچھ زیادہ ہی تشویشناک تھی جس کی وجہ گزشتہ ماہ ممبئی میں

ہونے والے واقعات تھے جن کے ملزمان کو بھارتی انٹیلی جنس نے پاکستانی ثابت کر کے پاکستان کے لئے نئے مسائل کھڑے کر دیئے تھے۔ بھارتی بضد تھے کہ حملہ آور کشتی کے ذریعے سمندری راستے سے بھارت میں داخل ہوئے اور دہشت گردی کے مرتکب ہوئے۔

یہ لوگ کون تھے؟

کہاں سے آئے تھے؟

انہیں کس نے بھارت بھیجا تھا؟

ان سوالات کے جوابات ابھی تک انہیں نہیں مل سکے تھے لیکن اس حادثے کے بعد سے پاکستانی ساحلوں کے نزدیک بھارتی بحریہ کی گشت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا بسا واقعات تو بھارتی نیوی کی بوٹس اور جہاز ساحلوں کے اتنے نزدیک آ جاتے کہ ”ریڈ الرٹ“ جیسی پوزیشن بن جایا کرتی تھی انہیں بروقت ”سٹینڈ بائی“ رہنا پڑتا تھا ایک لمحے کی غفلت سے کچھ بھی ممکن تھا۔ ملک جن حالات سے گزر رہا تھا اُس کی سنگینی کا ایک فوجی افسر ہونے کے ناطے کمانڈر عاطف سے زیادہ اور کسے احساس ہو سکتا تھا۔

یہ لانچ پاکستانی تھی جس پر وہ سب متفق تھے اور نیوی افسران اور ماہرین ہونے کے ناطے انہیں یہ ثبوت بھی مل گئے تھے کہ اسے گولہ باری کے ذریعے تباہ کیا گیا ہے۔ بھارتی ساحلوں کے نزدیک موجود اپنے ”سورس“ سے رابطے اور حاصل معلومات کے بعد بالآخر اُس نے دوسرے دن اپنے ہیڈ کوارٹر کو مکمل انکوائری رپورٹ فائل کر دی تھی جس کے مطابق یہ لانچ دو روز پہلے سمندر اچانک آنے والے طوفان میں راستہ بھٹک کر بھارتی علاقے میں داخل ہو گئی تھی جہاں گشت پر موجود بھارتی گن بوٹ نے اسے فائرنگ کر کے تباہ کر دیا۔

یہ لانچ کس کی تھی؟ اس میں کتنے سوار تھے؟ یہ لوگ کہاں جا رہے تھے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ بین الاقوامی سمندر کے جس روٹ پر وہ سفر کر رہے تھے اس راستے پر عموماً کوئی عام لانچ نہیں جایا کرتی تھی۔

کمانڈر عاطف نے ”میری ٹائم ایجنسی“ کی گن بوٹ میں سوار ہو کر سمندر کے انتہائی خطرناک علاقے میں آخری حد تک جا کر صورتحال کا جائزہ لیا تھا۔ نیوی کا ایک دلیر افسر ہونے کے ناطے اسے کبھی اپنی جان کی پرواہ نہیں رہی تھی یہی اس کی تربیت تھی۔ اُسے اس لانچ کی تباہی کا بھید جاننا تھا جس کے بعد ہی کوئی اگلی حکمت عملی مرتب ہو سکتی تھی۔ جس گھٹیا دشمن سے اُن کا سامنا تھا وہ اس معمولی واقعے کی آڑ میں کیا طوفان کھڑا کر سکتا تھا اس کا اندازہ بھی انہیں اچھی طرح ہو چکا تھا۔

لیفٹیننٹ کمانڈر جاوید کو اُس نے خصوصی ٹاسک دے کر اُس ساحلی بستی کی طرف بھیجا تھا جس سے متعلق نیول انٹیلی جنس کو یہ ثبوت مل چکا تھا کہ یہاں کے کچھ لوگ انسانی سمگلنگ کے دھندے میں ملوث ہیں گو کہ اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ سمندر کے راستے انسانوں کی سمگلنگ بہت خطرناک سمجھی جاتی تھی لیکن ملک میں بڑھتی غربت اور بے روزگاری نے ایسے جنونی پیدا کر دیئے تھے جو چند ٹکوں کے عوض اپنی اور دوسروں کی جان سے کھیل جانا معمولی بات سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے ابھی تک وہ اس گھناؤنے دھندے کو مکمل طور پر ختم کرنے میں ناکام رہے تھے اب بھی لوگ سمندری راستوں سے داؤ لگا کر خلیج کی ریاستوں میں نکل جایا کرتے تھے۔

یہ بات تو کمانڈر عاطف بھی اچھی طرح سمجھتا تھا کہ کم از کم پاکستان سے بھارت کی طرف سمندری راستے سے انسانی سمگلنگ نہیں ہو سکتی اور کوئی بیوقوف اس قسم کا خطرہ کبھی مول نہیں لے گا۔ ابھی وہ کوئی مفروضہ قائم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں کئی سوالات اور

امکانات پیدا ہو رہے تھے لیکن کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے وہ بے چینی سے لیفٹیننٹ کمانڈر جاوید کی رپورٹ کا منتظر تھا۔

کمانڈر عاطف کو جاوید کی آمد کی اطلاع شام چھ بجے کے بعد ملی تھی وہ ابھی تک خلاف معمول اس "سیف ہاؤس" Safe house میں موجود تھا جو اُن کا خفیہ آفس تھا۔ جاوید کی آمد اپنے مقامی "سورس" پنّل کے ساتھ ہوئی تھی۔

پنّل کا تعلق اُس ساحلی علاقے سے تھا جس میں رہنے والے قریباً تمام لوگ سمندر کے پیٹ سے ہی اپنا رزق تلاش کیا کرتے تھے۔ پنّل عرصے سے اُن کے لئے "ملکی خدمات" انجام دے رہا تھا۔ مقامی کونسلر ہونے کے ناطے وہ علاقائی صورتحال سے بخوبی آگاہی رکھتا تھا اور قریباً اُن تمام افراد کو جانتا تھا جو لانچوں کے مالک تھے۔ وہ اپنی بستی ہی نہیں اردگرد کے پانچ چھ بستیوں کا بھی "چوہدری" بنا ہوا تھا۔ لوگ جانتے تھے مقامی پولیس اور وڈیروں سے اُن کی جان پنّل ہی چھڑا سکتا ہے۔

کمانڈر عاطف کو جاوید نے پہلے کچھ بریفنگ دے دی تھی اور اب وہ پنّل کے ساتھ میٹنگ کر رہا تھا۔

"صاحب ہم نے تین چار بستیاں جو ہمارے اردگرد موجود ہیں ان کا سروے مکمل کر لیا ہے۔ اپنے ہاں تو کوئی ایسا بندہ نہیں ملا البتہ بلوچ بستی والا جمن خان چار روز سے اپنی لانچ سمیت غائب ہے۔" پنّل نے عاطف کو بتایا۔

"اوہ......" بے ساختہ عاطف کے منہ سے نکلا۔

"سر! یہ لوگ چار پانچ روز تک بھی سیزن کے دنوں میں سمندر میں رہتے ہیں اور اچھا شکار جمع کرنے کے بعد ہی واپس آتے ہیں......"

جاوید نے بتایا۔

"صاحب! جمن خان کے ساتھی لوٹ آئے ہیں۔ پھر بھی ہمیں ایک دن اور اُس کا انتظار کرنا چاہیے......" پنّل نے رائے پیش کی۔

عاطف اور جاوید نے اُس کی تمام باتیں بڑے غور سے سننے کے بعد اُسے رخصت کیا تھا اور اب دونوں مشاورت کر رہے تھے "کوئی پولیس ریکارڈ ہے اس کا"...... کمانڈر عاطف نے پوچھا۔

"نو سر! یہی تو حیرانگی کی بات ہے۔ میں نے اچھی طرح اس بات کی انکوائری کی ہے کہ جمن خان سے متعلق کوئی بھی بات ہمارے علم میں رہے۔ لیکن سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ سمندر میں دور تک شکار کرنے جاتا ہے اور اُس کی کوشش ہوتی ہے کہ اچھا شکار کر کے ہی واپس لوٹے...... میں نے اس کا موبائل نمبر لے لیا تھا سر! اُس کا نمبر ہم Bug کر رہے ہیں......"

لیفٹیننٹ کمانڈر جاوید نے بتایا۔

"ویل ڈن...... جیسے ہی کلوگلو Clue ملے مجھے فوراً اطلاع دو......

اس مسئلے کو ہیڈ کوارٹر بہت سیریس لے رہا ہے"......

کمانڈر عاطف نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔

"یس سر!"...... جاوید نے اُسے تعظیم دی۔

دونوں کی واحد اُمید اب وہ موبائل فون تھا جو جمن خان اپنے گھر چھوڑ گیا تھا کیونکہ سمندر میں ایک حد تک ہی سگنل آیا کرتے تھے۔

اس فون پر آنے والی کوئی بھی کال ٹریس کرنے سے ممکن ہے انہیں کوئی کلو مل سکتا۔ فی الوقت وہ دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر ہی عمل کر سکتے تھے۔

ملکانی زینب اچانک ہڑبڑا کر اُٹھی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو اور سردی کی شدت میں بھی جسم پسینے میں ڈوب رہا تھا۔ رات کے اس پہر نیند سے اُس کی آنکھ

کھانا یوں تو کچھ عجیب بات نہیں تھی لیکن جس ڈراؤنے خواب نے اُسے جگایا اُس نے زینب کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اُس نے اپنے لاڈلے بیٹے ملک نبیل کو سمندر میں ڈوبتے اور اپنی ماں کو مدد کے لئے پکارتے سنا تھا اُس نے دیکھا سمندر کی پرشور اور غضب ناک لہروں میں نبیل غوطے کھا رہا ہے اور وہ کچھ فاصلے پر بے بسی سے کھڑی اُس کے ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہی ہے کیونکہ اس سے زیادہ کچھ کرنے پر وہ قادر ہی نہیں تھی۔

کمرے میں اکیلی ہونے کی وجہ سے کسی اور نے اُس کے اس طرح اچانک بیدار ہونے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ زینب کا دل ابھی تک قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو دشمنی کی اس آگ کا ایندھن بننے سے بچانے کے لئے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ کر پاکستان سے باہر بھیجا تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اپنے چھوٹے بھائی اور باپ کی طرح نبیل بھی اس آگ کا ایندھن بن جائے جس کی شدت میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کمی آنے کے بجائے مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔

چارپائی سے اُٹھ کر اُس نے کمرے کے دوسرے کونے میں موجود گھڑونچی سے پانی پیا تو قدرے نارمل ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اذان کی آواز بلند ہوئی تو نجانے کیوں ملکانی زینب کا دل دھک سے رہ گیا اُس نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ فجر کی نماز کے وقت آنے والا خواب کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ وہ روایتی گھرانے کی بہو ہونے کے ناطے ایک دین دار عورت تھی۔ لڑکپن سے جوانی اور اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم دھرنے تک اُس نے کبھی نماز سے غفلت نہیں برتی تھی یہ تو ممکن تھا کہ کبھی زندگی میں ناگزیر وجوہات کی بنا پر اُس کی کا نماز قضا ہو گئی ہو لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ اُس نے نماز پڑھنے میں کوتاہی کی ہو۔ ایک زینب ہی کیا اس حویلی کی کوئی چھوٹی بڑی لڑکی یا عورت ایسی کسی کوتاہی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

نبیل اُسے ہر دوسرے تیسرے دن فون کر کے اُس کی اور اپنی خیریت سے آگاہ رہتا تھا لیکن آج پانچواں دن تھا اور ابھی تک اسے نبیل کی طرف سے فون نہیں آیا تھا۔ نبیل کے کزن اور اب گھر کے بڑے ملک نے اُسے بتایا تھا کہ اگر پانچ سات دن تک نبیل کا فون نہ آئے تو گھبرانے والی کوئی بات نہیں کیونکہ وہ حالت سفر میں ہے اور اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر ضرور کال کرے گا لیکن اب نجانے کیوں اُسے تشویش ہونے لگی تھی۔

وضو کر کے اُس نے معمول کے مطابق اپنے کمرے میں نماز ادا کی اور دل سے اپنے بچے کی سلامتی کی دعائیں مانگنے کے بعد اب اس بڑے کمرے میں آ گئی تھی جہاں

گھر کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو کر صبح کی چائے پیتے اور ناشتہ کرتے تھے۔ دن میں صرف یہی وہ پل تھے جب اس گھر کی عورتوں اور مردوں کی آپس میں ملاقات ہوتی تھی ورنہ تو اُن کے مرد زیادہ وقت اپنے ڈیروں اور عدالتوں کچہریوں ہی میں بسر کرتے تھے۔

ملک ناصر نے چاچی زینب کو دیکھتے ہی احترام سے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''وعلیکم سلام۔ جیوندہ رہ''۔ ملکانی زینب نے حسب روایت اُسے سلام کا جواب اور دعائیں دیتے ہوئے پہلے سے چینک میں دھری چائے پیالے میں اُنڈیلی اور کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

''پتر آج چھ دن ہو گئے نبیل کا فون نہیں آیا''......

اُس سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ اُس نے کہہ دیا۔

''چاچی جی! فکر والی کوئی بات نہیں...... انشاء اللہ۔ آج کل میں آ جائے گا اُس نے احتیاط نہیں کیا ہوگا۔''

ناصر نے اپنی دانست میں چاچی کو مطمئن کرنے کے لئے کہا تھا لیکن ملکانی زینب کو یوں محسوس ہوا جیسے ناصر جھوٹ بول کر اُسے مطمئن کرنا چاہتا ہے۔

''ناصر پتر توں خبر لے اُس کی میرا دل نہیں ٹکتا''۔

اُس نے اپنی بے چینی ناصر پر ظاہر کر دی تھی۔

ناصر کا شعور بالغ تھا تب وہ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا جب چاچی زینب کے سرتاج ملک حنیف کی لاش گھر آئی تھی۔ اس کے بعد اُس کی چاچی نے اپنے خاوند کی آخری نشانی ملک احمد کی لاش دیکھی تھی۔ صبر و رضا کی پیکر چاچی زینب کبھی اُن کے سامنے نہیں روئی تھی جب اُس کا دل بوجھل ہوتا حویلی کے کسی کونے کھدرے میں الگ تھلگ بیٹھ کر آنسو بہا لیتی۔

ملک حنیف اُس کا سرتاج اور کزن بھی تھا وہ ملک حنیف کے ماموں ملک ممتاز کی بیٹی تھی ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اُس کو مزید پڑھنے کا شوق چُرایا تھا لیکن خاندانی روایات کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی اور ایک روز اسے ڈولی میں بٹھا کر نبیل کے والد ملک حنیف کے ساتھ ملکاں والی روانہ کر دیا گیا۔

زندگی کے دس سال کیسے گزر گئے؟ اُسے کبھی اس کا احساس ہی نہ ہوا ملک حنیف اپنے بھائیوں کے برعکس انتہائی دھیمے مزاج کا اور گریجویٹ نوجوان تھا اُس نے فوج میں کمیشن لینا چاہا تو ملک معراج دین نے سختی سے منع کر دیا۔

''ناں پتر ناں...... تو ملکوں کی اولاد ہے۔ ہم کسی کو سیلوٹ نہیں کیا کرتے...... اپنی کھیتی باڑی کر...... نوکری کیوں کرے گا تو سرکاری......''

حویلی کے سربراہ نے مختصر سا حکم جاری کیا اور ملک حنیف نے سر جھکا دیا۔ اُسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا جب تک زندہ رہا گھر میں دو تین اخبار رسالے آتے رہے۔ اُس نے اپنی چھوٹی سی لائبریری بنا رکھی تھی۔ جہاں بہترین کتابیں موجود تھیں جو بعد میں احمد، نبیل اور اُن کی بہن مریم کے کام آتی رہیں۔ ملک حنیف کی خواہش پر ہی ملک شریف نے بادل نخواستہ نبیل کو پولیس میں بھرتی ہونے کی اجازت دی تھی ورنہ تو وہ بھی اپنے باپ ملک معراج دین کی پوری پوری کاپی تھا۔

''چاچی جی پریشان نہ ہونا۔ میں آج خود بات کروں گا سلطان سے...... اپنا بندہ ہے۔ وہ بہت خیال رکھے گا نبیل کا...... شام تک انشاء اللہ کوئی خبر آ جائے گی......''

ملک ناصر نے اپنی چاچی کو یہ کہہ تو دیا تھا لیکن اب وہ بھی یہ سوچ رہا تھا کہ سلطان نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا ایک مرتبہ لانچ میں سوار ہونے کے بعد پھر ملک نبیل خود ہی اُن سے رابطہ کرے گا...... اب وہ سلطان سے کیا پوچھے۔

''کچھ بھی ہو...... مجھے چاچی کو تو مطمئن کرنا ہی

ہے''...... اُس نے دل ہی دل میں کہا۔

دوپہر کے بعد اُس نے اپنے ڈیرے سے سلطان کو فون کیا تھا دوسری طرف فون کی گھنٹی بجتی رہی کسی نے فون اٹنڈ نہیں کیا۔

''ممکن ہے وہ سو رہا ہو''...... ناصر نے خود کو تسلی دی شام تک اُس نے قریباً دس مرتبہ سلطان کو فون کیا تھا جس کے بعد دوسری طرف سے فون آف کر دیا گیا۔ ناصر کے دل کو اب کھٹکا لگا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

ورنہ اب تک رابطہ ہو جانا چاہیے تھا۔

''کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا''......

اُس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

اخبار کا مطالعہ وہ بھی مسلسل کر رہا تھا اور اُسے بھی کبھی کبھی اخبار کے کسی کونے میں غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کرنے یا دوسرے ممالک میں داخل ہونے والے پاکستانی بدقسمت مسافروں کے متعلق ایسی ایسی اطلاعات ملتی تھیں جن کو پڑھ کر ہی وہ پریشان ہو جایا کرتا تھا۔ ابھی چار پانچ روز پہلے ہی اُس نے اپنے ڈیرے پر کسی ٹی وی چینل پر غیر قانونی طور پہ باہر جانے والوں کے متعلق ایک ایسا پروگرام دیکھا تھا جس کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا اس پروگرام میں بتایا گیا تھا کہ غیر قانونی طور پہ باہر جانے والوں کو لے جانے والے انسانی سمگلر اُنہیں ایران میں دوسرے سمگلروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں جو اُنہیں قیدی بنا کر اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے ہیں اُن کے لواحقین سے کروڑوں روپے تاوان طلب کرتے ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیسے وصول کرنے کے بعد مغوی کو مار دیتے ہیں۔

ملک ناصر کا دل دھک سے رہ گیا۔ اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ ابھی نزدیک ہی واقع سلطان خان کے گاؤں کا رُخ کرے اور ملک دلاور کو ساتھ لے کر خود ہی اُن کی خیریت دریافت کرے لیکن اُس نے مصلحت کے تحت فی الوقت خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر جانا۔

کموڈور گپتا نے دوسری مرتبہ اپنے سامنے دھری فائل کا مطالعہ کیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ نبیل سے متعلق جو آبزرویشنز دی گئی ہیں وہی سچائی ہے۔ نیول انٹیلی جنس کی خصوصی وینٹ کا کمانڈر ہونے کے ناطے اُسے خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے اپنے انہی اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے اس نے ابھی تک نبیل کو نیول انٹیلی جنس کے قبضے میں رکھا تھا جبکہ حکومت نے اس کے لئے خصوصی جوائنٹ انٹیلی جنس سیل بنایا تھا جو ملک کے کسی بھی کونے سے گرفتار ہونے والے پاکستانی ''گھس بیٹھیے'' کی تفتیش کیا کرتے تھے۔

کموڈور گپتا کی ٹیم نے ہر ممکن غیر انسانی حربہ ملک نبیل پر اپنا لیا تھا لیکن اُس نے ابھی تک اپنا بیان تبدیل نہیں کیا تھا اور آخر میں انہوں نے بطور خاص اُس کا ''پولی گراف'' ٹسٹ بھی کر لیا تھا۔ جھوٹ پکڑنے والی مشین کے اس ٹیسٹ نے بھی یہی ثابت کیا تھا کہ ملک نبیل اُن کے ساتھ جھوٹ نہیں بول رہا وہ کوئی کوٹھ Cover سٹوری نہیں سنا رہا بلکہ جو سچ ہے وہی بیان کر رہا ہے۔

کموڈور گپتا نے اپنی ان سفارشات کے ساتھ اُسے جوائنٹ انٹروگیشن ٹیم کے حوالے کیا تھا کہ وہ ملک نبیل کے متعلق یقین کر چکا ہے کہ وہ کوئی دہشت گرد نہیں بلکہ وہی ہے جو بیان کر رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ جانتا تھا کہ ''جے آئی ٹی'' والے اس کی کسی بات پر یقین نہیں کریں گے اور ملک نبیل کو دوبارہ ان تمام مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

کموڈور گپتا کو نجانے کیوں ملک نبیل پر ترس آنے لگا تھا وہ خود پنجابی تھا اور جانتا تھا اُس کے باپ نے خاندانی دشمنی سے بچنے کے لئے پنجاب سے یوپی میں

مراجعت کی تھی جہاں انہوں نے دوبارہ کھیتی باڑی شروع کی اور کموڈور گپتا اور اُس کے بھائی آج حکومت کے مختلف محکموں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

فائل پر اپنے ریمارکس دے کر اُس نے فائل آگے روانہ کردی اور دوسرے ہی روز ''جے آئی ٹی'' وہاں پہنچ گئی اس میں پانچ انٹیلی جنس ایجنسیوں کے مختلف افسران موجود تھے جن میں نیوی کا بھی ایک اعلیٰ افسر شامل تھا۔

نیم مردہ ملک نبیل کے بے حس و حرکت جسم سے وہ تین روز تک طبع آزمائی کرتے رہے جس کے بعد انہوں نے کموڈور گپتا کی Findings کو من وعن قبول کرلیا۔

ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کموڈور گپتا نے اُن کی رپورٹ پڑھی۔ اب ملزم کی قسمت کا فیصلہ ''را'' کے اُس خصوصی ونگ نے کرنا تھا جس تک بہت کم افسروں کو رسائی میسر تھی۔ کموڈور گپتا کو اس خصوصی ونگ کی طرف سے عجیب وغریب قسم کی ہدایات ملی تھیں جن میں کہا گیا تھا کہ وہ ملزم ملک نبیل کے جسم پر تشدد کے نمایاں نشانات ختم کروائے۔ اُسے عام ملزموں کی طرح کڑی نگرانی میں رکھا جائے لیکن اب اس پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔

''را'' کے اس خصوصی ونگ کے انچارج بریگیڈیئر کوکو شنک دھنی نے اچانک ہاتھ لگی اس ''مایا'' کا بروقت اور بہترین استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ تین چار روز بعد اُس کے ماہرین نیول انٹیلی جنس کے ہیڈکوارٹر میں پہنچ گئے جہاں انہوں نے قدرے نارمل ہوجانے والے ملک نبیل کی مختلف زاویوں سے کئی تصاویر اُتاریں، اُس کی ویڈیو ریکارڈنگ کی اور اُسے دوبارہ کموڈور گپتا کے گلے باندھ کر اپنی راہ لی۔

بریگیڈیئر کوشنک دھنی نے اپنے چانکیائی کھیل کا گھناؤنا آغاز کردیا تھا......

○

اُس روز شام کو بھارتی اور انٹرنیشنل خصوصاً امریکہ اور لندن کے میڈیا نے بڑی سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ ملک نبیل کی تصاویر، ایڈریس، اُس سے برآمد ہونے والے امریکن ڈالر، تباہ کن دھماکہ خیز مواد، بھارتی تنصیبات کا نقشہ، ممبئی اور احمد آباد کی تصاویر، ایک ٹائپ شدہ کاغذ جس پر ان تنصیبات اور پبلک مقامات کو تباہ کرنے سے متعلق ہدایات، منصوبہ بندی وغیرہ کی تفصیلات دی گئی تھیں کی نمائش شروع کردی۔

بھارتی پولیس کے اعلیٰ افسر نے ایک اہم پریس کانفرنس میں گرفتار ہونے والے اس پاکستانی دہشت گرد سے متعلق ایسی ایسی تفصیلات انٹرنیشنل پریس کو بتائی تھیں کہ وہ لرز کر رہ گئے چونکہ ممبئی حادثہ گزرے ابھی بمشکل تین چار ماہ ہی ہوئے تھے اس لئے پاکستان کی دہشت گرد حکومت اور خصوصاً آئی ایس آئی کے خلاف ساری دنیا کے چینلز نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھالیا تھا۔ بھارتی حکومت کے ترجمان نے پاکستان پر رٹے رٹائے الزمات کو دہراتے ہوئے خصوصاً مغربی دنیا اور امریکہ سے اپیل کی تھی کہ وہ پاکستان کو دہشت گرد ملک قرار دلانے کے لئے یو این او میں باقاعدہ قرارداد پیش کریں۔

اُسی روز رات دیر گئے پاکستانی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے اس جھوٹی خبر پر رونا روتے ہوئے اسے دشمن ملک کی چال قرار دیا، ملک نبیل نامی شخص کی شناخت سے انکار کردیا اور یہ بھی ماننے سے انکار کردیا کہ وہ کسی بھی پاکستان کے سرکاری محکمے میں ملازم رہا ہے۔

آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر کے اینٹی ٹیررسٹ مانیٹرنگ سیل میں یہ دھماکہ خیز نیوز سنتے ہی ''ریڈ الرٹ'' کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ گرم (ہاٹ لائن) اور ٹھنڈے دونوں قسم کے ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں ملک کے مختلف کونوں

میں بجنے لگی تھیں۔ اینٹی ٹیررسٹ سیل نے ''نان سٹیٹ ایکٹرز'' کے ریکارڈ کھنگالنے شروع کردیئے تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں ماضی کے ''مجاہد'' آج کے دہشت گردوں کی کمبختی آگئی تھی۔ ملک کے کونے کونے خصوصاً جنوبی پنجاب کے مختلف مدارس پر سفید پوش پولیس نے چھاپے مارنے شروع کردیئے تھے۔

○

گجرات کا DET کمانڈر بھی ''متاثرین خبر'' میں شامل تھا اپنی سروس میں پہلی مرتبہ اُسے اس صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ نبیل کا مکمل جغرافیہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اُسے ملک نبیل کے پل پل کی خبر چاہیے تھی۔ اُس کے خاندان کا مکمل تعارف درکار تھا اور ''ملکاں والی'' گاؤں کے اردگرد ماضی کے کسی بھی ''مجاہد'' کی موجودگی، کوئی مشتبہ مسجد، کوئی مشتبہ حکومت کی طرف سے پابندی کے ضمن میں آنے والی سابق جہادی تنظیم کا رُکن، یہاں کے لوگوں کے مذہبی عقائد، خیالات، نظریات، مذہبی، سیاسی وابستگیاں غرض ایک ایک پہلو پر مکمل رپورٹ درکار تھی۔

DET کمانڈر نے لاہور DET سے خصوصی درخواست پر ماہرین کو اپنی مدد کے لئے بلالیا تھا اور خبر آؤٹ ہونے کے بمشکل ایک گھنٹہ بعد ملک کی تین چار انٹیلی جنس ایجنسیوں کے متعدد اہلکاروں نے ''ملکاں والی'' پر یلغار کردی تھی۔

ہیڈکوارٹر کو ایک ایک لمحے کی رپورٹ دی جارہی تھی جہاں اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے بنائے گئے خصوصی ہسپتال کے انچارج ایک میجر جنرل صاحب نے قریباً ایمرجنسی نافذ کی ہوئی تھی۔

ملک ناصر نے دوسرے روز پھر سلطان سے رابطے کی کوشش کی لیکن اس طرف سے اب فون کا رابطہ بھی ختم کردیا گیا تھا جس نے ملک ناصر کا پارہ آسمان پر چڑھادیا۔ اُس نے تین چار مرتبہ رابطہ نہ ملنے پر اپنے بندوں کو سلطان خان کے گاؤں روانہ کردیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اُس کے گھر پر موجود تمام مردوں کو اُٹھا کر ڈیرے پر لے آئیں۔ ملک ناصر کے حکم کی تعمیل میں بمشکل دو گھنٹے لگے تھے اور اب اُس کے ڈیرے پر سلطان خان کا بڑا بھائی جہان خان اور اُس کا والد بوسے خان موجود تھے۔ دونوں کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ انہیں کس جرم کی پاداشت میں اُن کے گھروں سے اُٹھایا گیا ہے وہ سلطان خان کے والد اور بھائی ضرور تھے لیکن آج تک انہیں اس بات کا بھی ڈھنگ سے علم نہیں ہوا تھا کہ سلطان خان کرتا کیا ہے۔ اُس کا ذریعہ آمدن کیا ہے؟ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ سلطان نے کراچی اور دوبئی میں اپنے کاروباری دفتر

قائم کر رکھے ہیں۔ اُس کے بیوی بچے بھی وہیں اُس کے ساتھ رہتے ہیں اور سال میں بمشکل کبھی عید شبرات پر وہ اپنے گاؤں آیا کرتا تھا البتہ وہ اپنے بوڑھے باپ اور غریب بھائی کی مدد کبھی کبھی ضرور کر دیا کرتا تھا۔ خاندان کی شاید ہی کسی تقریب میں اُس نے کبھی شرکت کی تھی بیشتر تقریبات پر اُس کے بیوی بچے ہی شریک ہوتے تھے ابھی دو ماہ پہلے جب اُس کی بیوہ بہن نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی کی تو سلطان کو متعدد مرتبہ فون کر کے لازمی شرکت کے لئے کہا تھا لیکن سلطان کی طرف سے بیس ہزار روپے دولہا، دلہن اور ماں کے جوڑے تو آ گئے لیکن وہ خود نہیں آیا جس کا اُس کی بہن کو اتنا صدمہ لگا کہ اُس نے بیس ہزار روپے اپنی بھابھی کو واپس لوٹاتے ہوئے کہہ دیا سلطان سے کہہ دینا اگر مر گئی تو میرے جنازے کو ہاتھ نہ لگائے۔ بھابھی نے منت سماجت اور معافیاں مانگتے ہوئے روپے واپس لٹائے اور وعدہ کیا کہ وہ خود سلطان کو اُس کے گھر معافی مانگنے کے لئے لائے گی آج دو ماہ ہو رہے تھے لیکن سلطان نہیں آیا تھا۔

ملک ناصر کو وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے اور یہ بھی اُن کے علم میں تھا کہ ملک ناصر جیسے شخص کو ناراض کرنے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ مصیبت اُن پر کس جرم کی پاداش میں نازل ہوئی ہے۔

"میں نے کبھی کمزور بندے پر ہاتھ نہیں اُٹھایا بزرگو! یہاں ڈیرے پر رہو۔ موجیں کرو لیکن اپنے بیٹے سلطان سے ہر صورت میرا رابطہ کرواؤ۔ ضمانت کے لئے تمہارے چھوٹے بیٹے کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے اگر کل تک تمہارا رابطہ اپنے بڑے بیٹے سلطان سے ہو جائے تو میری اُس سے بات کروا دینا...... ورنہ اگلے روز اپنے چھوٹے بیٹے کی لاش وصول کر لینا......"

ملک ناصر نے خوف سے کپکپاتے سلطان کے باپ سے کہا جس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی اُس کا دم گھٹ جائے گا۔

"چھوڑ آؤ بزرگوں کو واپس......" اس نے اپنے بندوں سے کہا۔

سلطان کے باپ نے بڑی منت سماجت کی لیکن ملک ناصر نے اُس کی ایک نہ سنی اور اُسے واپس گھر پہنچا دیا۔ بے چارے بوڑھے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے۔ گھر پہنچتے ہی اُس نے اپنی بہو کو فون کیا اور ساری صورتحال سے آگاہ کر کے بتایا کہ اگر سلطان نے ملک ناصر سے رابطہ نہ کیا تو اس خاندان کا ایک ایک فرد مارا جائے گا اور کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔

بہو نے اپنے بے چارے سسر کے دُکھ کو اچھی طرح سمجھا وہ اُن کی خاصی ہمدرد تھی اُس نے سسر کو یقین دلایا کہ کچھ نہیں ہوگا اور وہ آج ہی کسی نہ کسی طرح سلطان سے فون کروا دے گی۔

○

سلطان کے والد کو گھر روانہ کر کے ملک ناصر ڈیرے سے حویلی کی طرف جا رہا تھا ابھی وہ بمشکل گھر کے دروازے پر پہنچا ہوگا جب اچانک اُسے چار پانچ جیپوں نے گھیرے میں لے لیا۔

ملک ناصر زمانہ ساز آدمی تھا اُسے اندازہ ہو گیا کہ یہ نہ تو ملک ماکھو کے بندے ہیں نہ ہی پولیس والے یہ کوئی اور ہی لوگ ہیں۔ اُس کے گن مین چوکس ہوئے لیکن سلطان نے انہیں روک دیا اور گاڑی سے باہر آ گیا اُس کے سامنے ایک لمبا تڑنگا ورزشی جسم کا کڑیل جوان کھڑا تھا۔

"میرا نام کرنل خان ہے" اُس نے ناصر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

(اس سنسنی خیز کہانی کی اگلی قسط شمارہ مارچ میں ملاحظہ کریں)

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہو کر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ ملک نبیل کی تفتیش ہوتی ہے دہشت گردی کا الزام لگتا ہے لیکن ثابت نہیں ہوتا جس پر انڈین انٹیلی جنس اُسے پاکستان کے خلاف بطور پراپیگنڈا استعمال کرتی ہے اور عالمی پریس کے سامنے اُسے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں یہ خبر نبیل کے کزن ملک ناصر کو پاکستان انٹیلی جنس کے ذریعے ملتی ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 3

تھوڑی دیر بعد وہ ملک ناصر کے ڈیرے پر موجود تھے۔ ملک ناصر کو اب سمجھ آئی تھی کہ چاچی زینب کیوں پریشان ہو رہی ہے۔ قدرت نے انہیں ایک بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اُس نے تو آج ٹی وی نہیں دیکھا تھا لیکن کرنل خان نے اُسے جو کچھ بتایا تھا اُس نے ملک ناصر کو پریشان کر دیا۔ زندگی میں ہی کبھی اس طرح کی صورتحال کا سامنا اُس نے نہیں کیا تھا۔ اُس کے دل میں سب سے پہلے چاچی زینب کا خیال آیا کہ اُسے کیا منہ دکھائے گا۔

"کرنل صاحب" اُس نے بلا کم و کاست ساری کہانی کرنل خان کو سنانے کے بعد کہا..... "جو مجھے معلوم تھا اور یہی سچ بھی ہے وہ میں نے عرض کر دیا..... میں آپ سے صرف ایک بات کہہ سکتا ہوں پورے اعتماد سے....."

کرنل نے اُس کی طرف سرد اور استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"ساری دنیا کے ہندو مل کر بھی ملک نبیل کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلوا سکتے جس سے پاکستان کی سالمیت، عزت آبرو پھر کوئی آنچ آئے..... میں نے ابھی تک ٹی وی پہ خبر نہیں دیکھی لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ملک نبیل کی زبان سے نکلا کوئی بیان کبھی کسی ٹی وی چینل پر دکھائی یا سنائی نہیں دے گا۔ وہ وہاں تک کیسے پہنچ گیا یہ تو سلطان ہی بہتر بتا سکتا ہے جو سلطان نے ہمیں بتایا تھا وہ میں نے آپ سے عرض کر دیا"..... اُس نے اپنی بات مکمل کر کے کرنل خان کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔

کرنل خان گزشتہ بارہ برس سے کسی نہ کسی حیثیت میں انٹیلی جنس کے مختلف شعبوں سے وابستہ رہا تھا۔ کاؤنٹر انٹیلی جنس میں اُس کا تجربہ بے مثال اور ناقابلِ چیلنج تھا۔ اُس نے ملک ناصر سے شکل دیکھتے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ وہ کسی ٹٹ پونجیے نہیں بلکہ ایک مرد سے بات کر رہا ہے۔ ایک ایسے دلیر اور جوان آدمی سے جو اپنی بات کی آبرو رکھنے کے لیے اپنی جان سے بھی گزر سکتا ہے۔

"ملک صاحب! میں جانتا ہوں آپ جھوٹ نہیں بول رہے لیکن ہمارا واسطہ بڑے کمینے دشمن سے پڑا ہے۔ اُس کے لیے تو ملک نبیل کی اس طرح گرفتاری اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے والی بات ہے اور وہ جی بھر کر ہمیں اس مسئلے پر ذلیل کرے گا...... آپ پڑھے لکھے بندے ہیں اندازہ لگا سکتے ہیں"......

کرنل خان نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا

"کرنل صاحب خاندانی دشمنی کی قیمت تو ہم کئی سالوں سے ادا کر رہے ہیں لیکن ایسی قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی ہم نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں آپ کو صرف یہ یقین دلا سکتا ہوں کہ دنیا کی کسی عدالت میں ملک نبیل کی زبان سے وہ ایک لفظ بھی پاکستان کی سالمیت کے خلاف نہیں اُگلوا سکتے ...... اور ہاں! ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں لیکن میرا دل گواہی دیتا ہے کہ جلد یا بدیر ہم نبیل کو اُن کے شکنجے سے نکال لیں گے"......

ملک ناصر نے کچھ ایسے لہجے میں یہ بات کہی تھی کہ کرنل خان متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

دونوں کے درمیان خاصی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی جس کے بعد کرنل خان کی درخواست پر ملک ناصر نے اُس کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کردی تھی۔ اس کے بھائی جواب ڈیرے پر پہنچ چکے تھے بضد تھے کہ وہ اکیلا کہیں نہ جائے۔ ملک ناصر کے محافظوں نے اُس کے ساتھ ہی جینے مرنے کی رٹ لگا رکھی تھی لیکن کرنل خان نے ملک ناصر اور اُس کے بھائیوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ملک ناصر کو جس طرح لے جا رہے ہیں اسی طرح بحفاظت اور بخیر و عافیت واپس پہنچائیں گے لیکن اُس کے بھائی تیار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بالآخر ملک ناصر کو مداخلت کرنا پڑی اُس نے اپنے بھائیوں کو سمجھایا کہ یہ نیشنل سکیورٹی کا معاملہ ہے اور انہیں بہرصورت ان سے تعاون کرنا چاہیے۔ اس کے بھائیوں کو جب اصلی بات کا علم ہوا تو وہ راضی ہوئے لیکن ملک ناصر نے اُن سے کہا تھا کہ چاچی زینب کو ابھی کوئی بات نہ بتائیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے بادلِ نخواستہ ملک ناصر کو ان لوگوں کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔

○

عابد حیات کے لیے یہ تیسرا چینل تھا جہاں وہ زیادہ تنخواہ کے چکر میں آ گیا تھا پارٹی موٹی تھی اور عابد حیات جیسا زمانہ ساز صحافی ایسے گدھوں کی تلاش میں رہتا تھا جنہیں اپنی مرضی سے ہانکا جا سکے۔ چینل کو لانچ ہوئے ابھی تین چار ماہ ہی گزرے تھے اس دوران عابد حیات نے تین چار سنسنی خیز سٹوریاں چلا کر اپنا سکہ جما لیا تھا لیکن گزشتہ ایک ماہ سے کوئی بڑا اسکینڈل ہاتھ نہ لگنے کی وجہ سے وہ مالکوں کی لسٹ میں کافی نیچے آ گیا تھا۔

اُس روز وہ معمول کے مطابق رپورٹنگ ڈیسک پر ٹی وی کے سامنے بیٹھا تھا جب اچانک ملک نبیل کے متعلق ایک بھارتی چینل نے یہ بریکنگ نیوز چلائی۔

"وہ مارا"...... بے ساختہ عابد حیات کے منہ سے نکلا۔

"سر جی! کیا ہوا"...... قریب ہی چائے کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے اس کے پرانے ساتھی کیمرہ مین بھٹی نے دریافت کیا۔

"بھٹی...... چل پتر......" عابد حیات نے بھٹی کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"سر جی چائے تو پی لوں......" بھٹی نے گرم گرم چائے کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"بھٹی پترا یہ "سکوپ" لگ گیا ناں تو ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کرلیں گے"...... اُس نے بڑے جوشیلے انداز میں کہا۔

بھٹی اُس کا پرانا ساتھی اور منجھا ہوا کیمرہ مین تھا۔ عابد حیات نے اُس کی مدد سے بڑی بڑی "دیہاڑیاں" لگائی تھیں۔ وہ عموماً بھٹی کے ساتھ شکار پر نکلا کرتا تھا۔ کسی بھی معمولی نوعیت کی غیر قانونی سرگرمی کی اطلاع پر وہ متعلقہ جگہ پر پہنچ کر ایسا ٹیرر Terror پھیلاتے کہ "شکار" اُن کے ہاتھوں بلیک میل پر مجبور ہو جاتا۔

عابد حیات کی یہ بات بھٹی کو بہت پسند تھی کہ وہ کسی بھی "شکار" سے ملنے والی رقم کا چالیس فی صد ایمانداری سے اُسی وقت اُس کے حوالے کر دیتا تھا۔ عموماً باقی رپورٹر ایسا نہیں کرتے تھے اگر وہ دس ہزار کی "واردات" ڈالتے تو بمشکل پانچ سو روپے کیمرہ مین کو دیا کرتے تھے۔

"چلو سر جی"...... بھٹی نے ترائی پاٹ اور کیمرہ سنبھالتے ہوئے کہا تھوڑی دیر بعد دونوں موٹر سائیکل پر ملکاں والی کی طرف عازمِ سفر تھے۔ انہوں نے آفس کو بھی اطلاع نہیں دی تھی کہ کہاں جا رہے ہیں۔ شفٹ انچارج کو صرف اس بات کی خبر تھی کہ عابد حیات کوئی بڑا "سکوپ" مارنے جا رہا ہے۔

موٹر سائیکل انہوں نے اس لئے ساتھ رکھی تھی کہ دفتر والوں کو یہ شک نہ ہونے دیں وہ شہر سے باہر جا رہے ہیں۔ انہوں نے انتہائی احتیاط ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے چینل کی گاڑی بھی نہیں لی تھی۔

موٹر سائیکل انہوں نے اپنے ایک پرائیویٹ ٹھکانے پر کھڑی کی اور اب وہ ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے ملکاں والی جا رہے تھے۔ سفر تھا ہی کتنا...... اگلے دو گھنٹے بعد وہ ملک ناصر کے ڈیرے پر موجود تھے جہاں اُن کی ملاقات ملک دلاور سے کروائی گئی۔

عابد حیات نے فوراً مائیک اُس کے منہ کے سامنے لہراتے ہوئے اُس سے "دہشت گرد ملک نبیل کے متعلق سوالات شروع کر دیے جو بھارت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

ملک نبیل کا تعلق کس دہشت گرد جماعت سے ہے؟

اس نے کہاں سے ٹریننگ لی؟

پاکستان سے کب سے غائب ہے؟

اُس کے کتنے بچے ہیں؟

گھر بار کی تفصیلات کیا ہیں؟

ملک دلاور جو ابھی اپنے بھائی کے ساتھ ہونے والے اس سانحے سے بمشکل سنبھل ہی پایا تھا پہلے تو غصے

اور حیرت سے اُس کا منہ دیکھتا رہا۔ اُس نے عابد حیات کو بتایا کہ وہ اس نام کے کسی بندے کو نہیں جانتے اور اس طرح کے سوالات کرکے وہ آخر کس کی مدد کرنا چاہتا ہے؟ لیکن عابد حیات نے اُسے ''معمول کے گاہک'' کی طرح لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کرتا رہا۔ اس دوران بھٹی اپنے کیمرے کے کرتب دکھانے لگا۔ ملک دلاور کے بندوں نے اُسے ریکارڈنگ سے روکنے کی کوشش کی لیکن بھٹی کہاں قابو آنے والا تھا وہ تو بڑا لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں یہاں آئے تھے۔

''اوئے بندہ بن جا...... تینوں سمجھ نہیں آ رہی۔''

اچانک ہی ملک دلاور کا ماتھا گھوم گیا۔

اُن کے نزدیک یہ پریس اور چینل کیا حیثیت رکھتے تھے اُن کی زندگی تو ہمیشہ ہی داؤ پر لگی رہتی تھی۔

''تمہیں میرے سوالات کا جواب دینا پڑے گا''...... عابد حیات نے اپنی دانست میں بڑی دھونس جمانے کی کوشش کی تھی لیکن اگلے ہی لمحے اُس کے چودہ طبق روشن ہو گئے جب ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے کانوں کے نیچے لگا جس نے اُسے چکرا کر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس پر گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش ہونے لگی۔ بھٹی کے ساتھ بھی کچھ اس قسم کا سلوک ہو رہا تھا جو مسلسل مار کھاتے ہوئے عابد حیات کو گالیاں دے رہا تھا اور ایک ہی فقرہ تسلسل سے دہرا رہا تھا کہ وہ تو اپنے پروڈیوسر کے حکم کا پابند ہے۔ اُسے تو کسی بات کا علم ہی نہیں اور وہ صرف ملک حیات کا ماتحت ہونے کی وجہ سے اُس کے ساتھ آیا تھا۔

انہوں نے دونوں کی اچھی خاصی تواضع کرنے کے بعد بھٹی کے کیمرے سے وہ ''ڈی۔وی'' نکال کر ضائع کر دی تھی جس پر ریکارڈنگ کی گئی تھی۔ جب ملک ناصر ڈیرے پر پہنچا تو دونوں کو انہوں نے کان پکڑوائے ہوئے تھے۔ کار ڈرائیور کو باندھ کر بٹھایا ہوا تھا۔

ملک ناصر کو کیمرہ اور مائیک وغیرہ دیکھتے ہی سمجھ آ گئی تھی کہ کیا مسئلہ ہے اور یہ کون لوگ ہیں۔ اُس نے بدمعاشی کے ساتھ کچھ سیاست بھی سیکھ لی تھی۔ اپنے بھائیوں کو بظاہر ڈانٹتے ہوئے اُس نے عابد حیات اور بھٹی کو قدرے نارمل کیا۔ انہیں چائے وغیرہ زبردستی پلائی اور دس ہزار روپے عابد حیات کو ایک کونے میں لے جا کر دیتے ہوئے کہا۔

''برادرِ عزیز تم بھی ہماری طرح پاکستانی ہو۔ ہمارا بھائی دہشت گرد نہیں۔ حادثاتی طور پر وہ انڈین کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ جس کا وہ ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ اس معاملے کو ''سکینڈلائز'' کرنے کے بجائے ملکی سالمیت کا زیادہ خیال رکھو''......

عابد حیات نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے اُس وقت تو یہی تاثر دیا کہ اس نے ملک ناصر کی بات مان لی ہے اور جیب میں نوٹ رکھ کر وہاں سے چل دیا لیکن وہ یہاں دس ہزار نہیں کم از کم ایک لاکھ کی دیہاڑی لگانے آیا تھا اور اب اپنا دوسرا ''آپشن'' استعمال کرنے ''ملھووالی'' جا رہا تھا۔

''چوہدری صاحب یار...... ابھی تو پہلی ٹھکائی سے بھی جسم بری طرح دُکھ رہا ہے۔ کہیں اور......''

بھٹی قدرے گھبرایا ہوا تھا۔

''بھٹی! اپنے پیشے میں مار کھانا بھی ''کریڈٹ'' بنتا ہے۔ کسی کو کیا خبر کہ اصل چکر کیا ہے؟ اب ہم جہاں جا رہے ہیں تم اُن کے سلوک پر حیران رہ جاؤ گے...... اوئے میں یہاں مونگ پھلیاں اکٹھی کرنے نہیں آیا...... لمبی دیہاڑی لگانے آیا ہوں...... کیا سمجھے؟''

عابد حیات بڑا پرامید دکھائی دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ جیسے کہتے ہیں۔ مان لیتے ہیں......'' بھٹی لائن میں آ گیا۔

''ملھووالی'' کے ملکوں کے لئے اُن کی آمد اندھے کے ہاتھ بٹیر لگنے والی بات تھی۔ ملک جگی نے فوراً اُن کے لئے چائے، پانی اور کھانے کا بندوبست کروایا۔ انہیں اپنے ڈیرے پر موجود باتھ روم کی سہولت بہم پہنچائی۔ ان کے ساتھ اُن کے توقعات سے بڑھ کر حسن سلوک کیا اور اپنے گاؤں کے چار پانچ بندوں کی ریکارڈنگ ملک نبیل کے حوالے سے کروا دی۔ ان لوگوں نے اپنے بیانات میں بتایا تھا کہ ملک نبیل کا تعلق واقعی ''ملکاں والی'' سے ہے۔ انہوں نے ملک نبیل کے سارے خاندان کے نام بتائے تھے۔ اُن کی غنڈہ گردی کی داستانیں سنانے کے بعد کہا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق حکومت کی طرف سے پابندی لگنے والی ایک بڑی دہشت گرد تنظیم سے ہے۔ ملک نبیل نے پولیس ملازمت کی صرف آڑ لے رکھی تھی لیکن وہ اصل میں دہشت گرد ہے اور مقامی پولیس اُن کے ساتھ ملی ہوئی ہے۔

انہوں نے عابد حیات کے ساتھ ''ملکاں والی'' میں ہونے والے بہیمانہ سلوک پر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُن کے ہوتے کوئی عابد حیات کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ وہ بلاخوف اپنے ''صحافتی فرائض'' انجام دے۔ اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے ملک جگی نے ''ناں ناں'' کرنے کے باوجود عابد حیات کو بیس ہزار روپے بھی تھما دیے تھے اور وعدہ لیا تھا کہ وہ حرف بحرف تمام تفصیلات ''آن ائر'' کرے گا۔ عابد حیات نے بڑھ چڑھ کر وعدہ کیا تھا اور اب قدرے مطمئن ہو کر آفس واپس جا رہا تھا۔

اُس نے اپنی دانست میں اپنی صحافتی زندگی کا بڑا سکوپ مارا تھا اور راستے میں اپنا وہ پانچ منٹ کا ''پیکج پلان'' کر رہا تھا جو اُس نے تیار کرکے آن ائر کرنا تھا۔ یہ ''پیکج'' اُن کی چینل کی Excpusive بھی ہوتی۔

O

ملک ناصر نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ جو شخص ملک نبیل کو ڈھونڈتا بڑی ''دیہاڑی'' لگانے کے چکر میں اُن کے ڈیرے تک پہنچ گیا ہے وہ یہاں سے ذلیل ہونے کے بعد اُن کے دشمنوں تک ضرور رسائی حاصل کرے گا جو اُسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیں گے۔ اُسے اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ ملک جگی اُن کے خلاف کیا کچھ کرے گا لیکن وہ اس بات سے ضرور خوفزدہ تھا کہ اب یہ ملکی سلامتی کا معاملہ بن گیا ہے۔ پاکستان پر پہلے ہی انڈیا کی طرف سے دہشت گردی کے حوالے سے عجیب و غریب بیانات کی بھرمار کا سلسلہ جاری ہے کہیں اُن کے خاندان کی وجہ سے اُس کا ملک کسی مصیبت سے دوچار نہ

ہو جائے۔ وہ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے لیکن یہ اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھا کہ "ملکاں والی" کے ملکوں کی وجہ سے اُن کے ملک کی بدنامی ہو......

اُس نے اور اُس کے بزرگوں نے ساری زندگی میں کبھی اپنے دشمنوں کے خلاف کسی بھی قسم کی مدد حاصل کرنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی لڑائی خود لڑنے کے قائل تھے لیکن اب مسئلہ ملکی سلامتی کا تھا......

یہی کچھ سوچتے ہوئے اُس نے اپنے موبائل سے کرنل خان کا نمبر ملایا جس نے اُسے میڈیا سے متعلق خصوصی ہدایات دے کر واپس بھیجا تھا۔ انہیں آپس میں تعاون کے ذریعے ہی اس آفت کا مقابلہ کرنا تھا۔

کرنل خان کو اس نے عابد حیات سے متعلق ساری بات بتاتے ہوئے یہ اطلاع بھی دے دی تھی کہ وہ اُن کے مخبر کی اطلاع کے مطابق اُن کے دشمنوں کے ڈیرے پہ پہنچ چکا ہے جہاں کچھ بھی ممکن ہے۔

کرنل خان نے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چوکس رہنے کی درخواست کی اور فون بند کردیا۔ اب اُسے فوراً اگلی حکمتِ عملی تیار کرنی تھی۔

عابد حیات "ملکاں والی" سے گاڑی پہ بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکاتا اب جی ٹی روڈ پر پہنچ چکا تھا۔

ڈرائیور نے جی ٹی روڈ پر آنے والے پہلے پٹرول پمپ سے گاڑی میں گیس بھرائی۔ بھٹی نے باتھ روم استعمال کیا اور اب وہ تازہ دم ہوکر اپنے آفس کی طرف جا رہے تھے جو یہاں سے بمشکل ڈیڑھ گھنٹے کی دوری پر موجود تھا ابھی وہ بمشکل دو تین کلومیٹر آگے ہی نکلے ہوں گے جب ایک ناکے پر انہیں گاڑی روکنی پڑی۔

سڑکوں پر ایسے "ناکے" معمول کی بات تھی اُن سے آگے دو اور گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی تلاشی لینے کے بعد انہیں آگے جا۔ نے کی اجازت مل گئی تھی۔ بھٹی نے ایک کونے میں سیاہ شیشوں والی ایک لینڈ کروزر دیکھی ضرور تھی لیکن اُسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ اس لینڈ کروزر میں سے برآمد ہونے والے تین لمبے تڑنگے سفید پوش اُن کی طرف کیوں آ رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ عابد حیات ناکے پر موجود پولیس سے اپنا تعارف کرواتا۔ اُن میں سے ایک ڈرائیور کی طرف آیا اور اُسے گاڑی ایک سائیڈ پر کرنے کے لئے کہا گو کہ اس سفید پوش نے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا لیکن اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ڈرائیور کے ہوش اُڑ گئے تھے۔

"اوکے سر جی...... اوکے سر جی"...... کہتے ہوئے اُس نے کسی میکانکی عمل کے تابع گاڑی اُس کے ہاتھ کے اشارے پر لینڈ کروزر سے آگے کھڑی کردی تھی۔

گاڑی میں کیمرہ مین بھٹی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا جبکہ عابد حیات گاڑی کے باہر موجود پولیس پر رعب جھاڑ رہا تھا۔

"سر جی! ہم آپ کے تابعدار ہیں لیکن پلیز آپ اُن سے بات کرلیں......"

ناکہ انچارج نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کیا تو عابد حیات اُس طرف متوجہ ہوا۔ اُس کے قدم بے اختیار اپنی گاڑی کی طرف بڑھے جس میں سے ڈرائیور اور کیمرہ مین اُتر کر کچھ سفید پوشوں کے ساتھ ایک کونے میں بنے چھوٹے سے محکمہ ایکسائز کے دفتر نما کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ غصے میں بھرا عابد حیات اگلے ہی لمحے اُن تک پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے؟ کون لوگ ہو تم! میں چینل کا پروڈیوسر ہوں...... عابد حیات......"

"سر جی! اندر تشریف لے جائیں......"

اُس کی بات کاٹتے ہوئے ایک سفید پوش جس نے سیاہ شیشوں والی عینک لگائی ہوئی تھی اُس سے ایسے لہجے

میں مخاطب ہوا کہ دوسرے ہی لمحے عابد حیات کو نارمل ہونا پڑا۔

اگلے ہی لمحے وہ کمرے میں موجود تھا جہاں مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے ایک اور سفید پوش اُس کا منتظر تھا۔ اُس کے دونوں ساتھی دوسرے کمرے میں پہنچا دیے گئے تھے۔

"تشریف رکھیں عابد حیات صاحب"...... مسکراتے ہوئے اُس نے عابد کو مخاطب کیا۔

اُمید ہے آپ نے ہمیں جان تو لیا ہوگا؟" حیرت زدہ گھبراہٹ کے شکار عابد حیات کی طرف اُس نے اگلا فقرہ اُچھالا۔

عابد حیات اچھی طرح جان گیا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟

گزشتہ پندرہ سال سے وہ صحافت میں جھک نہیں مار رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو شناخت کرنے کا فن ہی تو سیکھا تھا پھر بھی اُس نے مصلحت سے کام لیا۔

"نن نو سر!...... میں آپ کو نہیں جانتا"...... اُس نے اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"نو پرابلم...... تعارف سے کام زیادہ ضروری ہے" کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

اُس نے بمشکل پانچ منٹ عابد حیات سے بات کی تھی جس کے بعد عابد حیات کو اپنا جسم بے جان محسوس ہونے لگا تھا اُس کا حلق مسلسل خشک ہو رہا تھا حالانکہ سفید پوش نے اُسے پانی کا گلاس بھی پینے کے لئے دیا تھا۔

اُسے "پیغام" دیا گیا تھا کہ جو ایڈونچر وہ کرکے آیا ہے اُسے بھول جائے۔ یہ سمجھ لے کہ آج کا دن اُس کی زندگی میں آیا ہی نہیں تھا اور اس ساری واردات کی ریکارڈنگ ضبط کی جا رہی ہے۔ اُسے نصیحت کی گئی تھی کہ آج کے بعد بھی اس کام سے ان دیہاتوں کے نزدیک بھی نہ پھٹکے اور آخر میں درخواست کی گئی تھی کہ ملکی سالمیت اور سکیورٹی تقاضوں کے پیشِ نظر یہ اقدام ناگزیر ہے۔ اُسے دو چوائس دی گئی تھیں ایک تو یہ کہ وہ چپ چاپ یہاں سے چلا جائے اور کسی سے زندگی بھر اس "حادثے" کا ذکر بھی نہ کرے۔ بصورت دیگر وہ لوگ اُسے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور حالات "نارمل" ہونے تک وہ اُن کا مہمان رہے گا۔

"its up to you" (یہ تم پر منحصر ہے) اُسے چوائس دی گئی۔

عابد حیات بڑا کائیاں جرنلسٹ تھا۔ ایک تھرڈ کلاس اخبار کے پروف ریڈر سے وہ اپنی چالاکی ہوشیاری کے ساتھ تیزی سے ترقی کی سیڑھیاں پھلانگتا اس چینل کا پروڈیوسر بنا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا ان سفید پوشوں سے متھا لگانے کا مطلب سوائے چھتر کھانے اور ذلیل ہونے کے

خوشبو کی زبان

زبان غیر ہی لکھا ہے تو نے خط مجھ کو
بہت عجیب عبارت، بڑی ادق تحریر
یہ سارے حرف مری حد فہم سے باہر
میں ایک لفظ بھی محسوس کر نہیں سکتی
مجھے یہ لگتا ہے جیسے میں جانتی ہوں انہیں
ازل سے میری سماعت ہے آشنا ان سے
کہ تری سوچ کی قربت نصیب ہے ان کو
یہ وہ زبان ہے جسے ترا لمس حاصل ہے
ترے قلم نے بڑے پیار سے لکھا ہے انہیں
رچی ہوئی ہے ہر اک لفظ میں تری خوشبو
تری وفا کی مہک، ترے پیار کی خوشبو
زبان کوئی بھی ہو خوشبو کی وہ بھلی ہوگی

وحید سلم۔ تیہ

اور کچھ نہیں یوں بھی اُسے "مجاہد صحافت" بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اُس نے یہ جان لیا تھا کہ اُس نے جو ایڈونچر کیا تھا وہ دراصل "مس ایڈونچر" تھا اور اب اُس کے لئے سوائے "سرنڈر" کے اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔

کیا اُس کا یہ "پھیرا" خالی جائے گا؟ اور سب کے بڑھ کر ملک جگاو جس نے 20 ہزار اُسے دیا تھا وہ تو اس کی ہڈی پسلی برابر کر دے گا۔ اُسے کم از کم کوئی سکیورٹی تو ملے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس نے گھنگارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور سفید پوش سے مخاطب ہوا۔

"دیکھیے سر! مجھے اس بات کا اندازہ نہیں تھا جو آپ نے بتائی ہے۔ میں ایک محب وطن پاکستانی ہوں آپ کی طرح اور کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ میرے کسی عمل سے ملک و قوم کو کچھ نقصان پہنچے لیکن سر ایک درخواست ہے......" اس نے کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی۔

"yes" سفید پوش نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"وہ کھاں والی" کے ملک۔ جن کی ہم نے ریکارڈنگ کی ہے بڑے بدمعاش لوگ ہیں کہیں وہ......"

"بھول جاؤ انہیں...... آج کے دن کو اپنی زندگی سے نکال دو...... تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا......"

اُس کی نامکمل بات کاٹ دی گئی۔

"اوکے سر...... تیس ہزار کی گارنٹی ملنے کے بعد اُس نے اطمینان ظاہر کیا۔

"خدا حافظ"...... یہ کہتے ہوئے سفید پوش نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"شکریہ سر! خدا حافظ......" عابد حیات نے اُس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

جب وہ باہر آیا تو خوف سے کپکپاتے بھٹی اور ڈرائیور اس کے منتظر تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کی طرف جا رہے تھے ڈرائیور کو انہوں نے راستے ہی میں فارغ کر دیا تھا اور رکشہ لے کر موٹر سائیکل تک آئے تھے۔

"بھٹی یار...... معاملہ سکیورٹی کا تھا...... تم نے اس بات کو بھول جانا کہ ہم دونوں اکٹھے کہیں گئے تھے۔ اگر بھولے سے بھی کبھی اس کا ذکر کر دیا تو......" اُس نے بات نامکمل چھوڑ کر بھٹی کو دس ہزار روپے تھما دیے۔

بھٹی نے جھپٹ کر نوٹ اپنی جیب میں رکھے اور موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے لگا۔ O

ملک نبیل کا چالان یہاں سے دلی جا رہا تھا۔ اُسے دلی سے جانے کے لئے نارنگ اور چوہان گارد لے کر آئے تھے۔ نارنگ کو بطور خاص اس طرف بھیجا گیا تھا۔ جبکہ چوہان کے لئے یہ ساری فضولں کی ایکسرسائز تھی "را" کا آفیسر اور "پاکستانی ڈیسک" سے منسلک ہونے کے بعد اُس کے نزدیک اب ملک نبیل چلا ہوا کارتوس تھا اور اُسے مار دینا چاہیے تھا۔

"میں تو کہتا ہوں ختم کرو اس ٹنٹے کو...... جو ہم نے اس سے نکالنا تھا نکال لیا"......

چوہان نے بددلی سے نارنگ کو مخاطب کیا۔

"تو"...... نارنگ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہی تو ایک کمی ہے تو میں چوہان۔ بہت اُتاؤلے ہو جاتے ہو کبھی کبھی...... شکار کو ٹھنڈا کر کے کھانے کا مزہ نہیں جانتے ناں تم...... باؤلے! یہ تو بہت قیمتی ہیرا ہے۔ نارنگ تو کھوٹے سکے بھی چلانے کا فن جانتا ہے...... ابھی ہم نے اسے بہت جگہ Cash کروانا ہے...... اسے سنبھال کر رکھو...... میرا دل گواہی دیتا ہے چوہان یہ کوئی عام "ناگرک" (شہری) نہیں۔ بڑا سخت جان ہے۔ ضرور اس کا تعلق پاکستان کے کسی نہ کسی ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ سے رہا ہے......"

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اُس نے حسب عادت چوہان کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک بے بسی اُسے صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جواب میں چوہان صرف کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

"او کے باس"...... اُس نے مختصر الفاظ میں اپنی بات مکمل کی۔ وہ جانتا تھا نارنگ واقعی کھوٹے سکے چلانے کا فن جانتا ہے۔ "را" میں "پاکستان ڈیسک" کا ڈپٹی ڈائریکٹر ہونے کے ناطے وہ نارنگ کے بڑے بڑے کمالات سے آگاہ تھا۔ سمندری ماہی گیروں کو گھیر کر بھارتی سمندروں میں لانا۔ انہیں گرفتار کرنا اور عام ماہی گیر سے دہشت گرد بنانا اُس کے دائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ہاتھ میں آئے بٹیرے ملک نبیل کو پاکستان انٹیلی جنس کے لئے مکمل سردرد بنانے کا کارنامہ ہی نارنگ کی زیر کمان ہی انجام پایا تھا اس کا شیطانی دماغ ایسے منصوبے بنانے میں کمال رکھتا تھا۔

پولیس گارد وہ اپنے ساتھ ہی دلی سے لے کر آئے تھے اور مقامی مجسٹریٹ سے ملک نبیل کی حوالگی اور دلی منتقلی کے احکامات اُن کے پاس پہلے سے موجود تھے۔ چوہان کو زیادہ تو اس بات کی فکر کھائے جا رہی تھی کہ نارنگ نے کچھ دیر بعد ایک فلائٹ کے ذریعے دلی پہنچ جانا تھا اور اُسے دو ٹرینیں تبدیل کرنے کے بعد قریباً 40 گھنٹے کے تکلیف آزما مراحل سے ابھی گزرنا تھا۔ جس میں پولیس گارد کے چار جوان اور نبیل اُس کی ذمہ داری تھے۔

اُس نے بڑی کوشش کی تھی کہ نبیل کو بھی نارنگ اپنے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے ہی دلی لے جائے لیکن سرکاری معاملات میں وہ ایک حد تک ہی مداخلت کر سکتا تھا۔ جس کے بعد معاملات بگڑ بھی سکتے تھے۔ ملک نبیل اگر واقعی دہشت گرد ہوتا تو ضرور "را" اُسے ہوائی جہاز کا سفر کرواتی لیکن ایک چلے ہوئے کارتوس پر سرکار اس طرح تو پیسہ لٹانے سے رہی انہیں تھرڈ کلاس میں سفر کرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچنا تھا جبکہ چوہان نے اس بات کا بندوبست کر لیا تھا کہ وہ کم از کم تھرڈ کلاس میں سفر نہیں کرے گا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

اُس نے بادل نخواستہ ان کے ساتھ سفر کرنے کی ہامی تو بھر لی تھی لیکن اس امر کا اہتمام کر لیا تھا کہ جس ٹرین میں بھی وہ جائیں گے۔ ملزم نبیل اور گارڈ کے جوان تو ضرور تھرڈ کلاس میں سفر کریں گے جبکہ وہ خود اسی ٹرین کے فسٹ کلاس میں بیٹھے گا۔ البتہ وقتاً فوقتاً اُن کی خیریت کی خبر ضرور لیتا رہے گا۔

اقوال زریں

1۔ بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں، اندھے ہو جاتے ہیں۔
(فرمان باری تعالیٰ: سورۃ الحج)

2۔ اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ (ارشاد نبوی ﷺ مشکوٰۃ شریف)

3۔ زبان کو شکوہ سے روک، خوشی کی زندگی عطا ہو گی۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

4۔ جو شخص اپنا راز پوشیدہ رکھتا ہے، وہ گویا اپنی سلامتی اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

5۔ ایسی بات نہ کہو جسے سننے والا سمجھ نہ سکے۔
(حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

6۔ اگر تم کمزور کو کچھ نہیں دے سکتے تو ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آؤ۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

تھوڑی دیر بعد نارنگ نیوی کی ایک جیپ پر بیٹھ کر ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوگیا جبکہ گارڈز کے تینوں جوان، نبیل اور چوہان ایک پولیس وین میں ریلوے سٹیشن کی طرف چل دیے۔ جہاں انہیں ایسے طویل اور تکلیف دہ سفر کا آغاز کرنا تھا۔ انہوں نے ابھی تک نبیل کو کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی نبیل نے اُن سے کچھ دریافت کیا تھا۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے نبیل سے زیادہ حالات کی سنگینی کا احساس اور کسے ہوسکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں سے کوئی سوال کرنا ہی فضول ہے۔ نہ ہی ان سے کسی خیر کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔

اُس نے تو عرصہ پہلے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس بات کا اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب اس کی جان تفتیش سے چھوٹ گئی ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کو جیوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔

ملک نبیل کو لے جانے کے لئے آنے والی گارڈ کے دو سپاہی پنجابی اور ایک اے ایس آئی شاید ہریانہ کا رہنے والا تھا۔ اُنہوں نے ملک نبیل کی جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگالیا تھا کہ اُن کا ملزم اُن کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرے گا۔

حوالدار سالگ رام اور اُس کے ساتھیوں کو حیرت ہورہی تھی کہ روانگی پر انہیں جو بریفنگ دی گئی تھی یہاں اُس سے بالکل مختلف صورتحال تھی۔ انہیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ وہ ایک خطرناک ''اُگروادی'' (دہشت گرد) کو دلی لے جانے کے لئے آئے ہیں لیکن یہاں تو ایک زخمی اور تقریباً چلنے سے لاچار پنجابی نوجوان اُن کے ساتھ موجود تھا۔

''کیا نام ہے تیرا اوئے''...... سالگ رام نے اُس کی ہتھکڑی اپنے ساتھی عجائب سنگھ حوالدار کو تھماتے ہوئے پوچھا

''بتایا نہیں کسی نے......'' ملک نبیل نے اُس کی طرف قدرے غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے اس طرح کہا کہ سالگ رام کو دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

''دیکھو یارا تم جوان آدمی ہو۔ ہمارا تمہارا کوئی لینا دینا نہیں۔ ہم تو سرکاری ملازم ہیں۔ حکم کی تعمیل کررہے ہیں نہ ہم تمہیں پکڑنے والے ہیں نہ پکڑوانے والے...... آگے لمبا سفر ہے۔ اچھا کٹ جائے تو بہتر......''
عجائب سنگھ نے نبیل کے لہجے سے اُس کے پنجابی ہونے کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی''......
نبیل نے پنجابی میں ہی جواب دیا

''چلو پھر چلیں''...... کہتے ہوئے عجائب سنگھ نے قدم آگے بڑھایا۔

چاروں اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سالگ رام کو رہ رہ کر چوہان پر غصہ آرہا تھا جو یہ بلا اُن کے گلے منڈھ کر خود اکیلا ہی ریلوے سٹیشن چلا گیا تھا اُس نے پہلے ہی انہیں بتایا تھا کہ وہ اُن سے الگ فسٹ کلاس میں سفر کرے گا۔ جس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ یہاں سے دلی تک انہیں اپنا خرچہ خود برداشت کرنا ہوگا جس کا تصور ہی سالگ رام کے لئے بڑا ہولناک تھا۔

اُسے مقامی تھانے سے پولیس لائن میں آئے تیسرا مہینہ ہونے کو آرہا تھا۔ پولیس لائن میں آنے کے بعد اپنی تنخواہ سے ہی زندگی کے سارے معاملات چلانے پڑتے تھے جو سالگ رام کے لئے ناممکن تھا۔

انہیں ملزم کو دلی لانے کے لئے سرکار کی طرف سے منظور شدہ جو رقم ملی تھی اس سے تو بمشکل ایک دو وقت کا کھانا ہی ممکن تھا۔ چالیس گھنٹے کا سفر اور زادِ راہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

سالگ رام اور اس کی گارڈ کے باقی ساتھیوں کی ان حالات میں واحد اُمید وہ ملزمان ہوتے تھے۔ جنہیں وہ جیلوں سے عدالت اور پھر عدالت سے واپس جیل لے جایا کرتے تھے۔ مقامی ملزمان کے لواحقین جو انہیں تاریخ پیشی پر ملنے آیا کرتے تھے۔ پولیس گارڈ کے بہترین گاہک ہوتے تھے اُن کا دال دلیا ان کے وسیلے سے ہی چلتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی کسی ملزم کو لینے جاتے بھگوان سے ایک ہی پرارتھنا کرتے تھے کہ اُن کا واسطہ کسی غریب ملزم کے بجائے کسی بڑے اور تگڑے ملزم سے پڑے جو انہیں راستے میں عیاشی کرواسکے لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل مختلف تھا۔

اُن کا ملزم غیر ملکی اور وہ بھی پاکستانی جس کے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اُن کے پلے سے باندھ دیا گیا تھا اور اُمید کی تھوڑی بہت کرن جو اے ایس آئی سالگ رام کو چوہان کی صورت دکھائی دے رہی تھی اس نے ابتدا ہی میں بندر کی بلا طویلے کے سر ڈال کر اپنی جان بخشی کروالی تھی اور اب سالگ رام کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ چالیس گھنٹے کے اس سفر میں کمائیں گے کیا اور کھائیں گے کیا؟

پولیس وین نے انہیں سٹیشن تک پہنچا دیا تھا۔ دلی سے یہاں تک آنے جانے کے سرکاری چالان اور ٹکٹ پہلے سے اُن کے پاس موجود تھے۔ ملزم نبیل ملک کے ساتھ وہ سٹیشن کے اندر چلے گئے۔ ولایتی رام سپاہی نے مقامی مسافروں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اُن سے پلیٹ فارم کے ایک کونے میں دھرے دو لکڑی کے بنچ خالی کروالیے تھے اور اب دونوں اُن کے تصرف میں تھے ایک پر سالگ رام اور ولایتی رام بیٹھ گئے جبکہ دوسرے بنچ پر عجائب سنگھ اور اُس کا ساتھی نبیل کو درمیان میں بٹھا کر خود براجمان ہوگیا تھا۔

ٹرین آنے میں کچھ دیر تھی لیکن اسٹیشن میں خاصی رونق دکھائی دے رہی تھی۔

نبیل ملک خاموشی سے سر جھکائے صورتحال کا جائزہ لے رہا تھا اور یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ جب اُس کی ماں کو اُس کی انڈیا میں گرفتاری کی اطلاع ملے گی تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ اپنے گاؤں اور وہاں کے حالات کے متعلق سوچتے سوچتے اچانک ہی

اُسے خیال آیا کہ اس کا مستقبل کیا ہے؟

اگر پولیس کے مروجہ نظام کے مطابق دیکھا جاتا تو اُسے اب تک رہا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اُس نے اتنی مار کھانے کے باوجود بھی تفتیش کرنے والوں کی طرف سے اُس کے منہ میں ڈالے گئے کسی بھی جرم کا اعتراف نہیں کیا تھا اور اسی بات پر ڈٹا رہا تھا کہ اُن کی کشتی پر فائرنگ کر کے انہیں ڈبویا گیا تھا۔ اصولی طور پر تو اب تک اُسے رہا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھارتی پولیس کے اندازے یا الزام کے مطابق دہشت گرد ثابت نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی وہ یہاں کوئی تخریب کاری کرنے آیا تھا وہ تو زندگی میں کبھی انڈیا آنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"بُرے پھنسے نبیل ملک"...... اُس نے خود سے کہا۔

اُسے یاد آگیا جب لاہور میں دورانِ تربیت وہ ایک مرتبہ واہگہ بارڈر سے بھارت کی طرف سے رہا کردہ پاکستانی ماہی گیروں کو لینے کے لئے پولیس کو سکواڈ کے ساتھ گیا تھا اور انہوں نے بھارت کی قید سے رہائی پانے والے ماہی گیروں سے وہاں کے حالات پوچھے تو وہ حیران رہ گیا۔ جب اُسے علم ہوا کہ بھارتی فوجی انہیں گھیر کر گرفتار کرنے کے بعد اُن کے ساتھ کتنا برا سلوک کرتے ہیں۔ اُن میں سے کئی ماہی گیر ایسے تھے جنہیں چھ سات سال بعد رہائی نصیب ہوئی تھی۔

انہوں نے نبیل کو بتایا تھا کہ دلی کی "تیہاڑ" جیل میں ایسے پاکستانی قیدی موجود ہیں جو گزشتہ پندرہ سولہ سال سے وہاں جرمِ بے گناہی میں قید کاٹ رہے ہیں۔ انہیں صرف شک کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا تھا اور آج تک رہا نہیں کیا گیا۔ ایک مرتبہ بھارتی پولیس کے قابو آنے والے کسی بھی پاکستانی کو رہائی نصیب ہونے تک اپنے کسی رشتہ دار کی شکل تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی وہ بے چارے ہزاروں لاکھوں روپے صرف اپنے پیاروں سے چند منٹ ملاقات کی بھینٹ چڑھانے کے بعد تھک ہار کر تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔

"کیا یہی کچھ اُس کا بھی نصیب بننے والا ہے؟"......

ملک نبیل نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے کسی نادیدہ قوت نے اُسے حوصلہ دے کر نئی زندگی اُس کے تن بدن میں پھونک دی۔

"میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا"...... اُس نے خود سے ہی فیصلہ کن لہجے میں کہا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کی گرفت سے نکل کر بھاگ جائے گا۔ اگر وہ ایک مرتبہ ان موذیوں کے شکنجے سے نکل جاتا اور اپنے گھر سے کسی بھی طرح رابطہ کر لیتا تو اُس کے کزن اُسے بحفاظت یہاں سے نکالنے کے لئے دنیا کا ہر ممکن طریقہ اپنا سکتے تھے۔

ابھی تک اُسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ اُسے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ لیکن ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سفر لمبا ہوگا۔ جس میں اُسے یقیناً بھاگنے کا موقع مل سکتا ہے۔ اُس کی جسمانی حالت تو اس قابل نہیں تھی وہ ایسی کسی بات کا تصور بھی کر سکتا لیکن جس مٹی سے اس کا خمیر اُٹھا تھا وہاں "سرنڈر" کی گنجائش کبھی تھی ہی نہیں۔

بچپن سے جوانی تک اس نے اپنے بزرگوں کو لڑتے مرتے ہی دیکھا تھا۔ پولیس کی نوکری اور کمانڈو ٹریننگ کو اس نے اُسے زندگی کے ہر چیلنج سے ٹکرا جانے کا حوصلہ دے رکھا تھا۔ وہ جانتا تھا اُسے یہاں سے دور کسی بڑے عقوبت خانے یا جیل میں لے جایا جا رہا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں اُسے آسانی سے فرار کا موقع مل سکتا۔ اگر کوئی ایسا موقع ملا تو بس یہی ٹرین کے سفر میں ملے گا۔ اُس نے کن انکھیوں سے اپنے چاروں پولیس والے ساتھیوں کا جائزہ لیا۔ ایک اے ایس آئی ایک حوالدار اور دو سپاہی۔ ان میں سے حوالدار اور ایک سپاہی تو سکھ تھے جن کی فطری ہمدردیاں اُس کے ساتھ تھیں۔ باقی دونوں بھی نیم پنجابی دکھائی دے رہے تھے زبان آشنائی کی وجہ سے وہ اُس کے لئے نرم گوشہ بھی رکھ سکتے تھے۔

اپنی پولیس سروس کے دوران یہ بات تو نبیل ملک کو اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ پولیس میں لائن حاضر ملازمین خود کو جہنم کے مکین ہی سمجھتے ہیں۔ نہ وہاں تھانے جیسے کلچر سے اُڑانے کا موقع ملتا ہے نہ ہی اس طرح کا موج میلا۔ عموماً یہاں سے وہ ملازمین آتے ہیں جنہیں بطور سزا بھیجا جائے اور پاکستان انڈیا کی پولیس کا مزاج اور نفسیات قریباً ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ خود سے بیزار دکھائی دے رہے تھے اور جلد از جلد اس مصیبت سے جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔ اپنی تربیت کے بل بوتے پر وہ اس کا اندازہ لگا چکا تھا کہ جب تک ان کے پاس موجود تھری ناٹ تھری کی فرسودہ رائفلوں کو لوڈ اور پوزیشن کرنے کی نوبت آتی وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ یوں بھی پولیس کے یہ "لائن حاضر ملازمین" کسی ملزم کو گولی مارنے کا حوصلہ کبھی نہیں کرتے کیونکہ بعد میں ساری زندگی تفتیش بھگتنے میں گزر جاتی ہے۔

اپنے کزن ملک ناصر کے ساتھ کچھ سکھوں کے خصوصی تعلقات کی وجہ سے قریباً ہر سال اُن کے گھر کوئی نہ کوئی سکھ فیملی ضرور آتی رہتی تھی اور ملک نبیل کو بھی اُن سے گفتگو کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں ایک منصوبہ بنایا اور اللہ سے دعا کی کہ وہ اُسے کامیابی نصیب فرما دے۔ اس منصوبے میں سب سے اہم کردار اُس کے ساتھ جڑے حوالدار عجائب سنگھ نے ادا کرنا تھا جس کی اپنے لئے ہمدردی کے جذبات کا اندازہ اُسے ابتدا ہی میں ہو گیا تھا۔

سارنگ رام بڑی اُلجھن کا شکار تھا اور قدرے منہ بسورے دوسرے بینچ پر بیٹھا تھا جب اُسے چوہان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جس نے سارنگ رام کو اشارے سے اپنی طرف بلایا تھا۔ سارنگ رام اُٹھ کر چلا گیا اور یہی بات کرنے کا بہترین موقع تھا۔

"جوان آدمی لگتے ہو...... میں بھی جٹ ہوں۔ اجازت ہو تو کچھ بات کر لوں"...... اُس نے قریباً سرگوشی کے انداز میں سپاہی سنگھ کو مخاطب کیا عجائب سنگھ نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے؟"...... اس نے نبیل سے پنجابی میں ہی پوچھا۔

"میں نے دو ماہ سے زیادہ تفتیش کاٹی ہے لیکن ایک لفظ نہیں کہا...... چونکہ سرداروں سے میرے خاندانی مراسم ہیں ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اگر اسے امانت سمجھ کر صرف اپنے تک محدود رکھو......"

اُس نے پہلا تیر چلایا جو سیدھا نشانے پر لگا۔

"میں دی کھتریوں کا لڑ کا نہیں سرداروں کا بیٹا ہوں"...... عجائب سنگھ کی سکھی غیرت نے کروٹ لی۔

"ہم لوگ دراصل اُدھر پنجاب میں ہی ہیروئن اور سونے کا کام کرتے ہیں......" اس نے اتنی بات کہہ کر عجائب سنگھ کا ردِعمل جاننے کے لئے اُس کے چہرے پر نظریں جمائیں جو ہمہ تن گوش تھا۔

"اموں سیہاں...... چار کپ چائے پکڑ لا......"

اچانک ہی عجائب سنگھ نے اپنے ساتھی سپاہی کو دس روپے کا نوٹ تھما کر کچھ فاصلے پر موجود ریلوے اسٹیشن پر لگے چائے کے سٹال کی طرف اشارہ کیا۔

اموں سنگھ شاید چائے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ نوٹ پکڑتے ہی وہ سٹال کی طرف چلا

گیا۔ ملک نبیل کو یقین ہو گیا کہ قدرت اُس کی مدد کر رہی ہے۔

"کی ناں اے اپنا؟"...... عجائب سنگھ نے اچانک اُس سے پوچھا۔

"نذیر وڑائچ...... لیکن انکو میں نے اپنا نام ملک نبیل بتایا ہے"...... نبیل نے کہانی آگے بڑھانے کے لئے فوراً پنتر ابدلا۔ سکھ کے سامنے جٹ بننا ضروری تھا۔

جیسے ہی اُس کی بات مکمل ہوئی عجائب سنگھ نے ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

"میں بھی وڑائچ آں"......

دونوں نے ہاتھ ملا کر فوراً لگ کر لیے۔

"کھل کے بات کرو...... ہم یاروں کے یار ہیں"...... عجائب سنگھ کے لئے پاکستانی ہیروئن اور سونے کا سمگلر کسی انعام سے کم کہاں تھا۔ اُس نے ان لوگوں کی بڑی بڑی کہانیاں سن رکھی تھیں اور اُس کے تین چار دوست ان کی مدد کر کے مالا مال بھی ہو چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اُس نے نذیر وڑائچ کا صرف پیغام ہی اُس کے یہاں موجود لوگوں تک پہنچا دیا تو اُس کی دو دس سال کی تنخواہوں سے زیادہ رقم انعام کی صورت مل جائے گی۔

"عجائب سیہاں!...... نبیل نے بے تکلفی سے کہا...... پنجاب کے سارے بارڈر سیل ہیں تو بڑی چنگی طرح جانتا ہے۔ ہم لوگ دوبئی اور انڈیا میں لانچوں کے ذریعے کام کرتے ہیں۔ میں مال لے کر آ رہا تھا۔ سمندری طوفان سے راستہ بھول کر ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ لانچ تو وہیں غرق ہو گئی ورنہ اور مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ میں البتہ ان کے قابو آ گیا ہوں......"

عجائب سنگھ کی دلچسپی سے اُسے اندازہ ہو گیا کہ معاملہ جم گیا ہے اور اب وہ عجائب سنگھ پر اچھی طرح طبع آزمائی کر سکتا ہے۔

میرے لئی کیا حکم ہے مہاراج"...... عجائب سنگھ نے بے چینی سے پوچھا۔

"یہ بتا دو...... ہم کہاں جا رہے ہیں"؟ ہوشیاری سے نبیل نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

"دلی"...... مختصر جواب ملا۔

"تب تو بات بن گئی......" نبیل نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا...... "تمہیں صرف میرا پیغام ایک سردار تک دلی اور ممبئی میں پہنچانا ہے۔ میں تمہارا وڑائچ بھائی ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ ساری زندگی تمہارا احسان نہیں بھولوں گا اور تمہیں اس کا انعام بھی تمہاری توقع سے بڑھ کر ملے گا"......

"مہاراج گل ای کوئی نہیں (کوئی بات نہیں)"......

ابھی اُس نے بات مکمل ہی کی تھی جب اچانک ایک ٹرے میں چائے کے چار گلاس رکھے امول سنگھ اُن کے سر پر پہنچ گیا۔ جسے دیکھتے ہی دونوں نارمل ہو گئے۔

عجائب سنگھ نے ولایتی روم اور امول سنگھ کو ایک ایک گلاس تھمانے کے بعد ایک گلاس نبیل کو بھی دے دیا۔ نبیل نے شکریہ کہہ کر گلاس ہونٹوں سے لگایا تو باقی ملازمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"پردیسی ہے بے چارہ......" عجائب سنگھ کی بات پر تینوں نے سر ہلا کر صاد کیا اور مفت کی چائے پینے لگے۔

O

سالگ رام کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی پولیس کا چھوٹا موٹا افسر تھا ٹھیک ہے چوہان صاحب انٹیلی جنس کے بڑے افسر رہے ہوں گے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ انہیں بے رخی سے نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ بالکل کمیوں والا سلوک شروع کر دیں۔ اُسے چوہان کا اس طرح اشارے سے اپنی

طرف بلانا اچھا نہیں لگا تھا۔

چوہان کے قریب پہنچ کر وہ خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ جب اچانک ہی شاید چوہان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تھی اور وہ فون پر کسی سے بات کرنے لگا غالباً اُس کی گھر والی کا فون تھا کیونکہ وہ سالگ رام سے کچھ فاصلے پر جا کر بات کر رہا تھا۔ سالگ رام براہمن ہونے کے باوجود اُچھوتوں کی طرح ایک طرف کھڑا تھا۔ تین چار منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"ہاں بھئی سالگ رام...... سب اچھا ہے ناں"...... اس نے بڑے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"جی صاحب"...... سالگ رام نے مختصر جواب دیا۔

"دیکھو میں تم سے تیسرے ڈبے میں موجود ہوں۔ فسٹ کلاس کا ڈبہ ہو گا کوئی پرابلم ہو مجھے فوراً بتاؤ"...... اگلا حکم ملا۔

"اوکے سر"......

"اچھا میں چلتا ہوں......" یہ کہہ کر چوہان نے مڑنا چاہا لیکن اچانک ہی سالگ رام کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

"سر! ایک بینتی (درخواست) تھی"...... اُس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

"کیا! کیا! مسئلہ ہے"...... چوہان نے ایسے جواب دیا جیسے اس نے سالگ رام کی اس حرکت کا برا منایا ہو۔

"وہ سر جی! راستے میں خرچہ وغیرہ...... اس نے بات اُدھوری چھوڑ کر چوہان کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا غصے سے رنگ بدل گیا تھا۔

"کیا بک رہے ہو؟"...... چوہان نے انگریزی میں قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا...... "تمہیں خرچہ نہیں ملتا کیا؟"

محبت

محبت کوشش یا محنت سے حاصل نہیں ہوتی یہ عطا ہے، یہ نصیب ہے بلکہ بڑے ہی نصیب کی بات ہے۔ زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ 'محبت' ہی ہے۔

(رضی بلال...... لاہور)

"سر جی...... وہ تو معمولی سے پیسے ہوتے ہیں۔ رات کا سفر ہے۔ ملزم کو بھی کھانے پینے کے لئے کچھ تو......"

"یہ تمہارا درد سر ہے میرا نہیں"...... چوہان نے غصے سے اُس کی بات کاٹ دی۔ تم نے نوکری پولیس میں کی ہے یا جھک مارتے رہے ہو...... اوئے دلی کی پولیس والے ہو شرم نہیں آتی خرچے کی بات کرتے تمہیں تو میرا بھی بندوبست کرنا چاہیے تھا۔"

"سر جی! یہ دلی تو نہیں ہے...... آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ چالیس گھنٹے کا سفر ہے ٹرین بھی تبدیل کرنی ہے...... ہم غریب آدمی ہیں"...... سالگ رام نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا تھا۔

"میری طرف سے تم سب جاؤ جہنم میں...... اگر زیادہ گڑبڑ کی تو اے ایس آئی سے حوالدار بنوا دوں گا...... سمجھ گئے ناں......" اُس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا اور سالگ رام کا جواب سننے سے پہلے ہی دوسری طرف مڑ گیا۔

سالگ رام کا جی چاہا کہ اُس کے منہ پر پوری زور سے تھپڑ رسید کرے۔ وہ بھی کوئی ٹٹ پونجیا نہیں دلی پولیس کا اے ایس آئی تھا لیکن جانتا تھا ان "سکیورٹی" والوں سے متھا لگانے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔

"کوئی بات نہیں بیٹا"...... اُس نے دل ہی دل میں کہا...... "کہیں میرے قابو آ گئے تو رگڑ کر رکھ دوں

گا‘‘.....

غصے کی اسی کیفیت میں وہ اپنے ساتھیوں تک پہنچا جو ملازم سمیت چائے کے گلاس منہ سے لگائے بیٹھے تھے۔

’’اچھا تو یہاں گلچھرے اڑائے جا رہے ہیں۔ اور وہ بھی اکیلے اکیلے... اس نے انہیں گھورتے ہوئے کہا۔

’’سر جی! تابعدار ہیں آپ کے..... چل بھئی ولایتی روم صاحب کے لئے ایک گرما گرم چائے لا..... ملائی مار کے.....‘‘ اس نے دس کا نوٹ نکال کر ولایتی روم کو دیا جو اپنا گلاس پکڑے ہی وہاں سے چل دیا۔

سالگ رام کے لئے فی الوقت اتنا کافی تھا وہ اپنی جگہ پر منہ بسورے بیٹھ گیا۔

’’خیر تو ہے ناں مالکو!‘‘..... عجائب سنگھ نے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’بس یار عجائب سیہاں..... خیر ہی ہے..... پتہ نہیں یہ انٹیلی جنس والے اپنے کو سمجھتے کیا ہیں‘‘..... اُس نے چوہان کو پولیس کی روایتی زبان میں گالی دے کر کہا۔

’’اوہ سر جی! سمجھتے ہوں گے۔ بڑے بڑے دیکھے ہیں ہم نے یہ سیکیورٹی والے..... ہم بھی دلی پلس والے ہیں.....‘‘ عجائب سنگھ نے نفسیاتی حربہ آزمایا۔

’’اور کیا..... سالا قابو آجائے کسی چکر میں..... اس کی اوقات نہ یاد دلا دی تو براھمن کی اولاد نہیں.....‘‘

سالگ رام نے غصے سے کہا..... ’’یہ کر دوہ کرو..... چونی پلے سے لگانے کو تیار نہیں..... ناں ہم کہاں سے خرچہ کریں ملازم کا‘‘ سالگ رام نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’صاحب جی مسئلہ اِی کوئی نہیں..... آپ کا داس (نوکر) عجائب سنگھ حوالدار موجود ہے۔ خرچہ کی پرواہ نہ کریں۔ سر جی! ہمارے ساتھ بھی چنگا بندہ ہے۔ تقدیر کے قابو آ گیا ہے بے چارہ.....‘‘

اُس نے پہلی مرتبہ ہمت کر کے نبیل کی بات آگے بڑھائی۔

سالگ رام نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا جن میں حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔

’’سر جی! وڑائچ جٹ ہے۔ ادھر باڈر ایریا کے نزدیک ہی اس کا گاؤں ہے۔ اپنا ہم ذات ہے جی‘‘..... عجائب سنگھ کو جوش چڑھا ہوا تھا۔

’’اوئے عقل کر..... عجائب سیہاں پاگل تو نہیں ہو گیا تو..... نوکری سے چھٹی کروائے گا ہم سب کی..... اوئے وہ ہمارے ساتھ ہی سفر کر رہا ہے..... بھگوان کے لئے اس کے سامنے بالکل منہ نہ کھولنا‘‘.....

’’ناں سر جی ناں..... آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ مجھے کیا ضرورت ہے اس کے منہ لگنے کی‘‘ عجائب سنگھ نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

’’ہماری کوئی کسی سے دشمنی نہیں عجائب سیہاں..... ہم تو ملازم ہیں سرکار کے..... ہمارا کسی سے کیا لینا دینا‘‘..... سالگ رام نے نبیل کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر کہا۔

نبیل نے اپنے منصوبے کے پہلے حصے پر کامیابی سے عمل کر لیا تھا۔ اب اُسے اگلے مراحل کے لئے عجائب سنگھ وڑائچ پر انحصار کرنا تھا۔ اُس کی کوشش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہے زیادہ سے زیادہ جگہ عجائب سنگھ کے دل میں اپنے لئے بنا لے۔

ٹرین کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔

پلیٹ فارم پر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ پھر نبیل کو ٹرین آتی دکھائی دی جس کے رُکتے ہی قلیوں نے اُس پر ہلہ بول دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنی گارد کے ساتھ اُٹھ کر اُس ڈبے کی طرف جا رہا تھا جس میں اُن کی سیٹیں بک تھیں۔ اس درمیان نبیل نے کن اکھیوں سے چوہان کو دیکھ لیا تھا جو اُس پر ایک کونے میں نظریں گاڑے کھڑا تھا۔

خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے والے ایک نوجوان کی کہانی جو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا تھا

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک ناصر سے پاکستان انٹیلی جنس رابطہ کرتی ہے وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اُس کا بھائی کوئی دہشت گرد یا جرائم پیشہ نہیں گردش حالات نے اُسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ انٹیلی جنس والے اُس کی بات مان لیتے ہیں۔ انسانی سمگلر سلطان خان کو لانچ تباہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہے۔ نبیل کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور اب پولیس اس کا چالان دلی کی تہاڑ جیل کے لئے لے جا رہی ہے، ملک نبیل حوالدار عجائب سنگھ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے۔

اب آگے پڑھیے

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 4

چوہان نے انہیں تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوتے دیکھ لیا تھا اور اب وہ کھڑکی کی طرف آ رہا تھا جہاں آمنے سامنے کی دو برتھیں اُن کے لئے بک کی گئی تھیں، سالگ رام کھڑکی سے لگا باہر جھانک رہا تھا۔

"سفر کے دوران کھڑکی بند رکھنا اور آنکھیں کھلی رکھنا......

چوہان نے اُس کے نزدیک پہنچ کر سالگ رام کو ہدایت کی تو اُس کے تن بدن میں غصے سے آگ لگ گئی۔ چوہان اُن سے افسر ماتحت کے بجائے کمیوں جیسا سلوک کر رہا تھا۔ اُس کا جی تو چاہا کہ اس کا ٹینٹوا دبا دے اور اُسے بتائے کہ سالگ رام نے جھک نہیں ماری۔ آدھی زندگی پولیس ملازمت میں لگا دی ہے۔ کسی ملزم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح منتقل کرنا ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ لیکن وہ ایسا صرف سوچ سکتا تھا۔
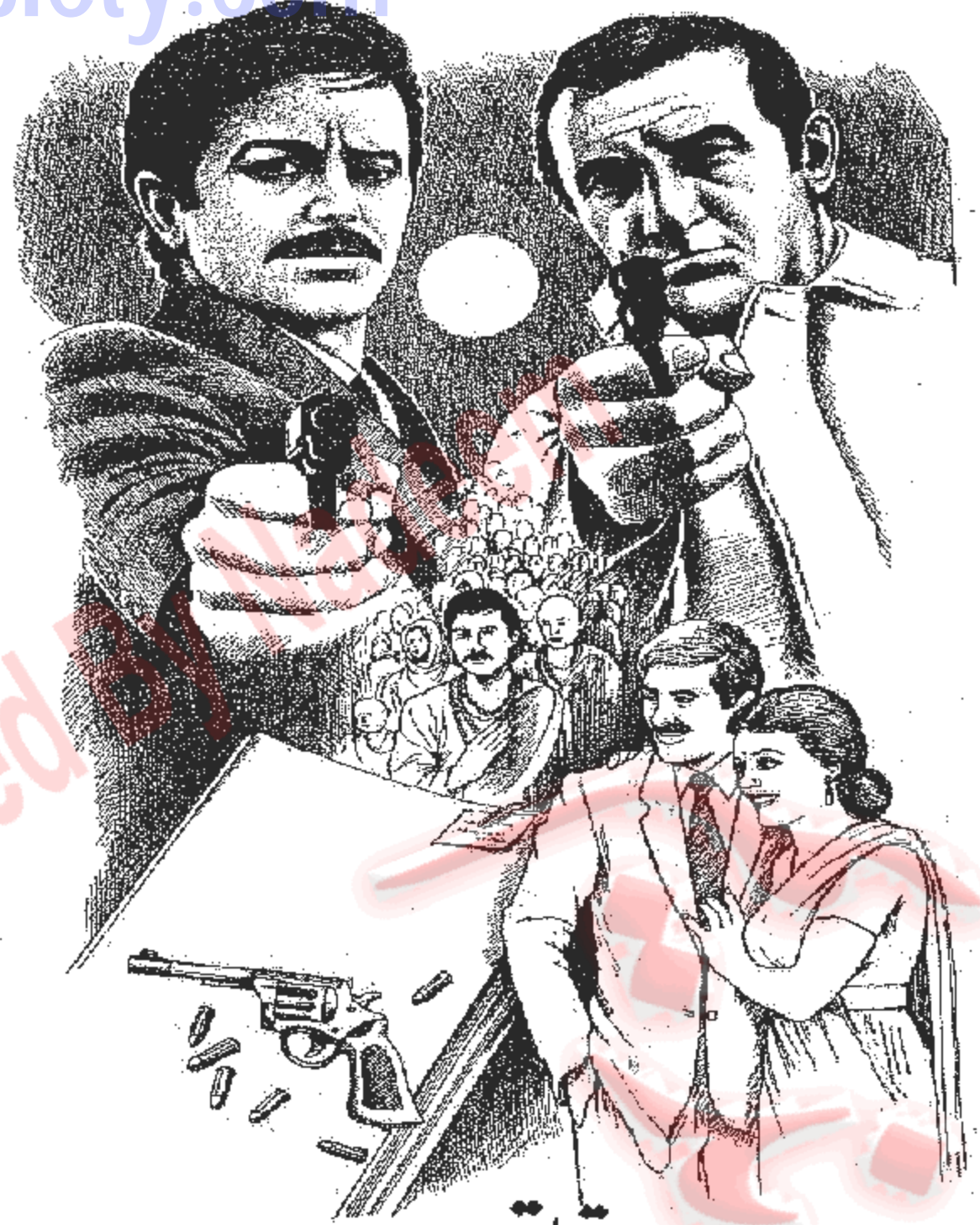
"بے فکر ہو جائیں سر جی"...... اُس نے خود پر جبر کرتے ہوئے چوہان کی تسلی کروائی۔

"اور ہاں...... راستے میں کسی سے نہ اسے بات کرنے دینا، نہ کچھ لے کر کھانے دینا، میری بات سمجھ آ رہی ہے ناں......"

چوہان سالگ رام کی تسلی کروانے پر تلا ہوا تھا اور سالگ رام آپے سے باہر ہو رہا تھا یا آخر اُس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ ہی گیا۔

"سر جی! میں پہلی مرتبہ کسی ملزم کو ایک سے دوسرے ضلع میں نہیں لے کر جا رہا"...... اُس نے کوشش کی تھی کہ اپنے لہجے کی تلخی چھپائے رکھے لیکن چوہان تک اُس کا میسج پہنچ گیا تھا۔

”پھر بھی میرا فرض ہے تمہیں آگاہ کرنا“......

اس مرتبہ چوہان نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

سالگ رام کٹ کر رہ گیا۔ یہ تو اُس کی خوش قسمتی تھی کہ گاڑی نے روانگی کا وسل بجادیا تھا اور چوہان تیزی سے آگے فسٹ کلاس کی طرف روانہ ہوگیا اُن کے ڈبوں کے درمیان چھ سات ڈبوں کا فاصلہ تھا۔ چوہان کے اپنی سیٹ تک پہنچنے کے ساتھ ہی گاڑی نے رینگنا شروع کردیا اور اب وہ آہستہ آہستہ احمد آباد اسٹیشن سے باہر آرہے تھے۔

”سرجی، خیر تو ہے ناں“......حوالدار عجائب سنگھ نے اُس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے پوچھا۔

”بس یار عجائب سہیاں ...... چپ ای بھلی“......

سالگ رام نے بددلی سے کہا۔

ٹرین نے اب باقاعدہ رفتار پکڑنی شروع کردی تھی۔ نبیل کو انہوں نے اپنے درمیان بٹھا رکھا تھا۔ دونوں برتھوں پر انہوں نے قبضہ کیا ہوا تھا اور کوئی دوسری سواری اس قبضے میں مداخلت کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ تھرڈ کلاس کے اس ڈبے میں دھما چوکڑی مچی تھی، ایک طوفان بدتمیزی چاروں طرف دکھائی دے رہا تھا۔ مسافر زیادہ تھے اور جگہ کم۔ اس پر مستزاد یہ کہ جو کوئی جہاں بیٹھ گیا وہاں سے اُٹھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بیشتر لڑائیاں اور بحث اس بات پر ہورہی تھی کہ جن لوگوں نے سیٹیں بک کروائی تھیں وہ تو کھڑے تھے جبکہ دوسرے اُن کی سیٹوں پر براجمان اور اپنی جگہ سے اُٹھنے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ ٹرین نے رفتار پکڑلی تھی لیکن ابھی تک لوگ ڈھنگ سے بیٹھ نہیں پائے تھے۔ اب ٹکٹ بابو کے ڈبے میں آنے سے کچھ امن ہورہا تھا اور کچھ دیر میں اُس نے کمال ہوشیاری سے سب لوگوں کو مطمئن کردیا، شاید یہ اُن کا روزانہ کا معمول تھا، نبیل کو اس گارڈ کی عوامی ڈیلنگ نے بڑا متاثر کیا تھا۔

اُن کے ساتھ ابھی دو سیٹیں خالی تھیں لیکن نبیل نے محسوس کیا اُس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی دیکھ کر یا پھر پولیس والوں کی وجہ سے کوئی اُن کے نزدیک نہیں آتا تھا۔ ڈبے میں اب مختلف اشیائے خورد ونوش فروخت کرنے والوں کی آمد بھی شروع ہوگئی تھی۔

عجائب سنگھ نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سالگ رام سے پوچھ لیا۔

”سرجی! کوئی چائے پانی؟“......

”نہیں یار! ابھی نہیں، تھوڑی دیر بعد دیکھیں گے“۔

سالگ رام جسے اس بات کا یقین آچکا تھا کہ عجائب سنگھ نے ملزم سے خصوصی تعلقات استوار کرلیے ہیں اور یہ ملزم بھی کوئی عام بندہ نہیں کوئی بڑا اسمگلر ہے جو بدقسمتی سے انڈین پولیس کے قابو آگیا ہے۔

نبیل دل ہی دل میں مسکرادیا۔ وہ جانتا تھا کہ عجائب سنگھ وڑائچ اُس کے جال میں پھنس گیا ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے اُسے اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ کسی ملزم کو لانے اور لے جانے والی گارد کو کتنا سرکاری خرچہ ملتا ہے۔ ابھی تک سب کچھ عجائب سنگھ اپنے پلے سے کررہا تھا۔ اس اُمید پر کہ جلدی نبیل اُس کا رابطہ اپنے ساتھیوں سے کروادے گا جس کے بعد اُس کے وارے نیارے ہوجائیں گے۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد اگلا اسٹیشن آیا، نبیل کھڑکی سے ملحقہ سیٹ کے درمیان بیٹھا تھا لیکن کھڑکی کے باہر کا منظر اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا یہ کوئی مضافاتی قسم کا اسٹیشن تھا جہاں زیادہ رش بھی نہیں تھا اور اسٹیشن کی بلڈنگ قدرے ویران دکھائی دے رہی تھی، پلیٹ فارم پر صرف ایک ریڑھی جس پر کھانے پینے کی قریباً ہر شے موجود تھی کو ایک بوڑھا سا پگڑی پوش ہندو یا سکھ گھسیٹ رہا تھا جب کہ اُس کے دو ملازم لڑکے ڈبوں کے سامنے مسلسل چائے بن، چائے بن اور کسی گجراتی کھانے کا نام پکار رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک ہاتھ میں لوہے کی تاروں سے بنے ایک اسٹینڈ میں شیشے کے چھوٹے چھوٹے چائے سے بھرے گلاس سجائے ہوئے تھے جو وہ کسی بھی سواری کی ڈیمانڈ پر فوراً اُسے تھمادیتے جبکہ دوسرے ہاتھ میں کندھے پر سہارا دے کر ایک چھوٹے سے خوان میں کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

عجائب سنگھ نے ”ناں ناں“ کے باوجود ایک گلاس چائے خود پکڑلی جبکہ سالگ رام اور ملک نبیل کو بھی ایک ایک گلاس تھادیا تھا جس پر اصول سنگھ نے بڑی غصیلی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تھا اور اب دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا تھا۔ اس دوران ملک نبیل نے آہستہ آہستہ سالگ رام سے سلسلہ جنبانی شروع کردیا تھا۔ اپنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لئے اُسے عجائب سنگھ کے علاوہ سالگ رام کو بھی شیشے میں اُتارنا ضروری تھا۔

ٹرین کے ساتھ ساتھ سفر کرتا سورج کا سرخ تھال اب دونوں اطراف دکھائی دینے والی پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہورہا تھا اور ڈبے میں شور بھی آہستہ آہستہ کم پڑتا جارہا تھا اس شور پر ٹرین کے چلنے کی آواز حاوی ہورہی تھی۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور آہستہ آہستہ رکنے لگی۔

ٹرین کے رُکتے ہی سالگ رام ڈبے سے باہر نکل کر پلیٹ فارم پر چلا گیا شاید وہ تھرڈ کلاس کے اس ڈبے کی گھٹن سے کچھ پل ہی کے لئے سہی نجات چاہتا تھا لیکن ابھی اُس نے بمشکل اپنی بانہیں دو تین مرتبہ زور زور سے اوپر نیچے ہلا کر اور لمبے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل ہی کیا تھا کہ اچانک وہ ٹھٹھک گیا۔ چوہان اس کے پہلو میں موجود تھا۔

”انسپکٹر صاحب یہ ورزش کے لئے مناسب جگہ نہیں۔ میرے خیال سے آپ کو ملزم کے ساتھ ہی رہنا چاہیے“......

اُس کو شاید سالگ رام کا باہر آنا اچھا نہیں لگا تھا۔

سالگ رام کو چوہان کی اس بات نے آگ لگادی، یہ انٹیلی جنس والا کچھ زیادہ ہی افسری جھاڑ رہا تھا۔

”سرجی! ملزم کہیں نہیں بھاگا جارہا...... آپ نے اُسے میری ذمہ داری میں دیا ہے تو مطمئن رہیے۔ دہلی جا کر وصول کرلیں“......

اس مرتبہ اُس نے پولیس والا لہجہ اختیار کیا تھا۔

”بہرحال میرا فرض ہے تمہیں آگاہ رکھنا...... ذمہ داری تو یہ تمہاری ہی ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں“......

چوہان اس مرتبہ کمپرومائز کے موڈ میں نظر آرہا تھا۔

"آؤ ایک کپ چائے پی لیں...... یہاں شاید ٹرین آدھا گھنٹہ رُکے گی......"

چوہان نے اُس کو نارمل کرنے کے لئے بات آگے بڑھائی اور سالگ رام دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔

"بس بیٹا! ایک ہی گیدڑ بھبکی میں دوڑ لگا گئے"......اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

"او۔کے سر"...... چوہان کی طرف دیکھ کر وہ مسکرایا اور اب دونوں ایک چائے کے سٹال پر کھڑے تھے۔

○

ڈبے میں موجود عجائب سنگھ کے ساتھ معاملات سیدھے کرنے کا اس سے زیادہ مناسب وقت نبیل کو اور کب مل سکتا تھا۔

"ایک بات کرنی تھی سردار صاحب"......اُس نے باقی دونوں سپاہیوں کو دوسری طرف متوجہ پا کر کہا۔

"اوہو! کوئی بات ہی نہیں یار...... ہم جٹ کھرا ہیں"۔عجائب سنگھ نے اُس کی حوصلہ افزائی کی

"میں دھلی پہنچنے پر تمہیں ایک فون نمبر دوں گا۔نمبر تو یہ دوبئی کا ہے لیکن ایک فون کرنے پر ہی تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ تم نے کس مرد سے یاری لگائی ہے عجائب سنگھ جی ہم یاروں کے یار ہیں۔ کسی کا احسان نہیں رکھتے۔تم خود وڑائچ ہو اپنی نسل کو اچھی طرح جانتے ہوگے"......

نبیل نے اُس کی انا کے غبارے میں اچھی طرح ہوا بھردی۔

حوالدار عجائب سنگھ جانے کب سے اُس جیسی کسی موٹی آسامی کا منتظر تھا جو اُسے راتوں رات کروڑ پتی بنادے۔اُس کے محکمے میں ایسی کئی مثالیں موجود تھیں جہاں کسی پولیس والے نے کسی بڑے سمگلر کی مدد کی جس نے اُسے پھر پولیس کی نوکری سے ہی بے نیاز کردیا،یہ تو ویسے بھی اُس کا پنجابی اور وڑائچ بھائی تھا۔

"ویر جی! فکر ای کوئی نہیں۔آپ نے بالکل چنتا نہیں کرنی،جب تک عجائب سنگھ آپ کے ساتھ ہے آپ کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں ہونے دے گا"

عجائب سنگھ نے اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

اس کے جواب نے نبیل کو خاصا مطمئن کردیا تھا۔

اُس نے دہلی سے پہلے پہلے قسمت آزمائی کا مصمم ارادہ کررکھا تھا۔نبیل جانتا تھا کہ اگر اس ملک سے نکلنے کا کوئی موقع اُسے مل سکتا ہے تو وہ اُس کا گجرات سے دہلی تک کا سفر ہی ہے بصورت دیگر وہ ساری عمر جرم بے گناہی میں بھارتی جیلوں میں سڑتا رہے گا۔

اُس کا چالان تہاڑ جیل جارہا تھا جس کے متعلق اُس نے پاکستان ہی میں بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں۔

وہ جانتا تھا اس جیل میں پاکستانی "دہشت گردوں" کو خصوصی نگرانی میں رکھا جاتا ہے۔بھارتی پولیس کے لئے ہندوستان میں قابو آنے والا ہر پاکستانی خواہ وہ بے چارہ کوئی مسافر ہو یا پاسپورٹ کی کسی غلطی کی وجہ سے پھنس گیا ہو"دہشت گرد" ہی تھا اب تو وہ سمندر میں شکار کرنے والے پاکستانیوں کو گھیر کر پکڑنے کے بعد انہیں بھی "دہشت گرد" ہی سمجھتے تھے اور ان سب سے "خصوصی سلوک" کیا جاتا تھا۔

ملک نبیل نے پاکستان میں اپنی نوکری کے دوران جب وہ لاہور پولیس لائن میں ڈیوٹی دیا کرتا تھا اور اسے تین چار مرتبہ واہگہ بارڈر سے بھارت رہا ہوکر آنے والے پاکستانیوں کا "چالان" لانے کا موقع ملا تھا اُن کی دردناک کہانیاں تو سنی تھیں لیکن اس بات کا تو کبھی اُس نے تصور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک روز وہ بھی ان کی طرح بھارتی پولیس کے قابو آجائے گا۔

"کیا آج سے دس پندرہ سال بعد اُسے بھی اُن بدقسمت پاکستانیوں کی طرح زندہ درگور اور دائمی مریض بنانے کے بعد اس طرح واہگہ بارڈر پر چھوڑ دیا جائے گا؟"

اُس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

"نہیں...... ملک نبیل...... اس زندگی سے موت بہتر ہے۔تمہیں بہرحال یہاں سے فرار ہونا ہے خواہ اس کوشش میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے"

انجن سے بلند ہونے والے وسل کی آواز نے اُس کے خیالات کا سلسلہ توڑا۔سالگ رام چوہان کی طرف سے چائے پی کر ڈبے میں واپس آگیا تھا۔گاڑی نے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کردیا تھا اور اب سالگ رام اپنے ساتھیوں کو اپنا کارنامہ سنا رہا تھا کہ کس طرح اُس نے چوہان کی گیدڑ بھبکی کا جواب دیا اور چوہان نے اُسے چائے کی رشوت پیش کی۔

"واہ سر جی واہ"......عجائب سنگھ نے اُسے داد دی۔

عجائب سنگھ نے سالگ رام تک یہ پیغام تو پہنچادیا تھا کہ اُن کے ساتھ سفر کرنے والا کوئی عام ملزم نہیں بلکہ سونے کا بین الاقوامی سمگلر ہے جس کو اگر انہوں نے خوش کردیا تو اُن کے دن پھر جائیں گے۔سالگ رام نے ہوشیار پولیس آفیسر کی طرح کھل کھلا کر اُس کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی تھی لیکن اپنی رضامندی بھی ظاہر کردی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی انہوں نے کھانے کا آرڈر دے دیا۔اس مرتبہ سارا خرچہ سالگ رام نے کیا تھا وہ عجائب سنگھ کا "بھائی وال" بن گیا تھا اور اس سمگلر سے ملنے والے انعام میں اب اس کا باقاعدہ حصہ بھی عجائب سنگھ پر لازم ہوگیا تھا۔انہوں نے ملک نبیل کو دال سبزی کھلائی جس کے بعد عجائب سنگھ کی طرف سے سب کو چائے بھی پیش کی گئی۔

"میں زرا واش روم تک......" نبیل نے سالگ رام کی طرف دیکھ کر اشارے ہی نامکمل بات کی۔

"کیوں نہیں جی...... آؤ مہاراج آؤ"......

سالگ رام سے پہلے ہی اُسے عجائب سنگھ نے جواب دیا۔

شام ڈھل چکی تھی اور گاڑی کے اندر لگے بلب روشن ہورہے تھے،جن کی روشنی نہ ہونے کے برابر تھی لیکن جل رہے تھے۔ملک نبیل کے لئے یہ بڑی حیران کن صورتحال تھی اُس کے اپنے ملک میں ایسے ڈبے جن سے یہ گاڑی چل رہی تھی کسی کباڑ خانے کی بھینٹ کتنی ہی دیر پہلے چڑھ چکے ہوتے لیکن وہ دل ہی دل میں بھارتی ریلوے کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا جنہوں نے اپنی ٹرینوں کی دیکھ بھال کا نظام اتنا مضبوط اور مربوط بنایا ہوا تھا کہ بظاہر انتہائی شکستہ حالت والے ڈبے بھی چل رہے

تھے اور اُن کے اندر موجود ہر شے اس بات کی منہ بولتی تصویر تھی کہ اُس کی مکمل دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

''اگر آپ برا نہ منائیں تو ہتھکڑی ایک ہاتھ میں کر دیں......''

نبیل نے دوسرا دانہ پھینکا۔

عجائب سنگھ نے اُس کے سوال پر اپنے افسر سالگ رام کی طرف دیکھا جس نے منہ سے کچھ جواب دینے کے بجائے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا تھا اور عجائب سنگھ کو اُس کا مطلب سمجھ آ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے یار...... کوئی بات نہیں''...... اُس نے اپنی جیب سے چابی نکالی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھکڑی نبیل کے ایک ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہمارا بڑا افسر فسٹ کلاس میں موجود ہے۔ جہاں ٹرین رُکے گی وہاں میں ہتھکڑی دونوں ہاتھوں میں کر دیا کروں گا''......

نبیل نے اُس کا بھرپور انداز سے شکریہ ادا کیا۔

ابھی تک اُس کے چلائے تمام تیر نشانے پر بیٹھ رہے تھے جن سے اُسے اُمید ہو چلی تھی کہ ضرور قدرت اُس کی مدد کرے گی اور وہ اس عذاب سے نکل جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

عجائب سنگھ اُس کی ہتھکڑی کا دوسرا سرا پکڑے اُسے باتھ روم تک لے گیا اُس نے کمال فراخدلی سے دوسرا سرا بھی نبیل کو دے دیا اور بند دروازہ کے باہر کھڑا ہو گیا، نبیل نے باتھ روم کا دوران استعمال اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اُسے یہاں سے ہی فرار ہونا تھا۔ باتھ روم ڈبے کے دروازے سے ملحق تھا جہاں سے وہ با آسانی باہر چھلانگ لگا سکتا تھا۔ ٹرین اب قدرے ویران اور نیم پہاڑی قسم کے علاقوں سے گزر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور نبیل کسی ایسے ہی موقعہ کا منتظر تھا۔ فی الوقت تو اُسے اپنی تمام صلاحیتیں ان لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں لگانی تھیں۔

وہ باہر آیا تو عجائب سنگھ کو اپنا منتظر پایا۔

''یار طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے''...... نبیل نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ہو جاتا ہے''...... عجائب سنگھ نے اُسے حوصلہ دیا۔

''دراصل میں نے زندگی میں کبھی اس طرح ٹرین سے اتنا لمبا سفر نہیں کیا۔ سردار جی''...... نبیل نے اپنا کیس پیش کیا۔

''آہو جی مجھے اندازہ ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں ظاہر ہے، ہوائی جہاز یا کار کے ذریعے ہی سفر کرتے ہوں گے'' عجائب سنگھ اُس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا تھا۔

''آج دو ماہ ہو گئے ہیں یہ لوگ مجھے جانوروں کی طرح مارتے رہے ہیں، کھانے پینے کا بھی تفتیش میں کیا حساب ہو گا تم اچھی طرح سمجھتے ہو......'' نبیل نے اپنا دُکھڑا بیان کیا۔

''مہاراج جی! پرواہ نہ کرنا...... ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ دہلی میں بڑی سیٹنگ ہے اپنی...... آپ کے بندوں کو ایسے بندے سے ملا دوں گا جو پھانسی کے تختے پر چڑھا بندہ بھی نکال لیا کرتا ہے...... اور ہاں جیل میں بھی آپ کا اچھا بندوبست ہو جائے گا''

عجائب سنگھ جی بیس پچیس لاکھ روپے جب کہو گے تمہارے اکاؤنٹ میں آ جائیں گے اگر تم یہ کام کروا سکو......''

نبیل کی اس فراخدلانہ پیشکش پر عجائب سنگھ کو زور کا جھٹکا دھیرے سے لگا دونوں وہیں کھڑے سرگوشیوں میں

باتیں کر رہے تھے جبکہ اُن کے باقی ساتھیوں نے باقاعدہ اُونگھنا شروع کر دیا تھا۔

''سالگ رام کے سامنے کوئی بات نہ کرنا......'' اُس نے اپنی دانست میں نبیل کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ناں سردار جی ناں...... آپ اپنے وڈے بھائی ہیں اور ہم بندے کی شناخت بھی رکھتے ہیں سردار جی...... ہر ایرے غیرے کو منہ نہیں لگاتے، نبیل نے اُسے مزید پکا کرتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال سے اب سیٹ پر بیٹھ جائیں...... سٹیشن بھی آنے والا ہے''......

عجائب سنگھ نے کہا اور دونوں اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ عجائب سنگھ نے اُس کے دونوں ہاتھوں میں دوبارہ ہتھکڑی پہنا دی تھی۔

O

رات کے اس پہر ماہی گیروں کی اس بستی پر موت جیسا سکوت طاری تھا بجلی یہاں موجود ضرور رہی ہو گی لیکن آتی اپنی مرضی سے تھی۔ رات کو تو شاید ہی کبھی دو چار گھنٹے کے لئے کسی گھر کا بلب روشن ہوتا تھا ورنہ تو ہر طرف تاریکی نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ساری بستی گہری نیند سو رہی تھی لیکن مائی جیونی کو ایک پل قرار نہیں آتا تھا۔

آج صبح ہی وریام اُس کے پاس سلطان خان کا پیغام اور دو لاکھ روپے کیش لے کر آیا تھا اُس نے مائی جیونی اور جمن خان کے دونوں بیٹوں کو علیحدگی میں بٹھا کر یہ افسوسناک خبر دی تھی کہ جمن خان جس لانچ کے ساتھ جا رہا تھا وہ سمندری طوفان کی وجہ سے ڈوب گئی ہے اور اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ اگر کوئی زندہ بچا بھی ہے تو اُس کے علم میں نہیں۔

مائی جیونی جانتی تھی اس کا خاوند کیا کام کرتا ہے اور اُس کا باس کون ہے۔ اُس نے آج تک سلطان خان کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن اُس کی بہت تعریف سنی تھی۔ کسی بھی نقصان کی صورت میں وہ اپنے ساتھی کے گھر والوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا تھا، عبداللہ ماچھی جو اُس کی لانچ کے ساتھ تین سال پہلے کسی خلیجی ریاست میں گرفتار ہو گیا تھا آج تک ہر ماہ سلطان خان کی طرف سے اُس کی تنخواہ اُس کے گھر پہنچ جاتی تھی۔ ابھی دس بارہ روز پہلے ہی جب عبداللہ ماچھی کی طرف سے پیغام ملنے پر اُس کے گھر والوں نے اُس کی بیٹی کے ہاتھ پیلے کئے تھے تو بھی سلطان خان نے پچاس ہزار روپے اُن کے لئے بھیجے تھے۔ وہ آج تک یہاں آیا تھا یا نہیں؟ اس کی خبر تو مائی جیونی کو نہیں تھی لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ اس بستی کا بچہ بچہ اُس کا نام آشنا ہے اور اُس کے لئے جان دے سکتا ہے۔

جمن خان طویل عرصے سے سلطان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جتنے دن وہ گھر سے غائب رہتا مائی جیونی پرسکون رہتی کیونکہ اُس کی گھر میں موجودگی مائی جیونی اور اُس کے دونوں بیٹوں کے لئے مسلسل عذاب بنی رہتی تھی۔ ہر روز رات کو سستی قسم کی شراب پی کر انہیں گالیاں یا دھمکیاں دینا اُس کا معمول تھا۔ مائی جیونی تو ایک عرصے سے اُس سے پٹتی آ رہی تھی۔ کبھی کبھی معمولی باتوں پر اور کبھی بغیر کسی بات کے بھی وہ مائی جیونی کو مارنا اپنا فرض عین جانتا تھا۔

مائی جیونی کے بطن سے اُس کے تین بچے پیدا ہوئے تھے۔ بیٹی تو کم عمری میں بیاہی گئی جبکہ دونوں بیٹے اب جوان تھے اور اپنی کشتی پر شکار کے لئے جایا کرتے تھے۔ مائی جیونی کے لئے جمن خان کے ہاتھوں پٹنا اب ایسا کچھ باعث تشویش نہیں رہا تھا لیکن گزشتہ تین چار ماہ سے ایک پریشانی اُسے لاحق ہوگئی تھی کہ اب اُس کے بیٹے اپنی آنکھوں کے سامنے جمن خان کو اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھانے دیتے تھے۔ دو تین مرتبہ تو وہ باپ سے اُلجھتے اُلجھتے رہ گئے جب مائی جیونی اُن کے درمیان ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

جمن خان کی روانگی سے چند روز پہلے اُس نے دل سے دعا کی تھی کہ اللہ اُس کو اُٹھا لے۔ 40 سال کی عمر میں بھی وہ بوڑھی عورت لگتی تھی۔ یوں بھی اُس کے لئے زندگی میں اب کیا دلچسپی باقی رہ گئی تھی۔ اُسے جمن خان کے ظلم و ستم سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن باپ بیٹوں میں تصادم ہو...... اُس کے لئے کبھی قابل برداشت نہ ہوتا۔

جس روز سلطان خان کا آدمی وریام جمن خان کی موت کا پیغام اور دو لاکھ روپے لے کر آیا اُس روز مائی جیونی دھاڑیں مار مار کر روتی رہی زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ اُس نے اپنے سر کا سائیں کھو دیا ہے۔

صبح انہوں نے قرآن خوانی کروائی تھی۔ یہ یہاں کا معمول تھا اکثر ماہی گیروں کی لاشیں نہیں ملا کرتی تھیں۔ جمن کی موت کا صدمہ سوائے مائی جیونی کے اور کس کو نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بستی کے تمام لوگ ہی [illegible] سے تنگ تھے یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی رات کے آخری پہر مانند [illegible] عاطف کی جیپ وہاں رکی فوراً دو تین بوڑھے جو شاید [illegible] سمندر میں جانے کی تیاری [illegible] رہے تھے اُس کی طرف لپکے۔ یہ بڑے کائیاں لوگ تھے اور عاطف کے کچھ کہے بغیر ہی سمجھ گئے تھے کہ وہ کون ہے۔

"سلام صاحب...... سلام صاحب...... سلام صاحب......" تینوں نے باری باری قریباً فرشی سلام سے انہیں نوازا۔

لیفٹیننٹ کمانڈر جاوید نے اُسے اشارے سے ایک شخص کی نشاندہی کرتے ہوئے سمجھا دیا تھا کہ وہ اُس کا "سورس" ہے۔ کموڈور عاطف نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا۔ اُسے اُمید نہیں تھی کہ اتنی صبح یہاں کسی سے ملاقات ہوگی وہ تو اپنی دانست میں علی الصباح جمن خان کے گھر پہنچ کر اُسے سرپرائز دینا چاہتے تھے۔

"جمن خان کا گھر کون سا ہے"...... عاطف نے فوراً ہی پوچھ لیا۔

"وہ سامنے والا سر...... لیکن صاحب وہ تو مر گیا"...... اُن کے "سورس" نے اطلاع دی۔

"What...... کیا"۔ عاطف اور جاوید دونوں نے حیرانگی سے اُسے دیکھا اُس کے باقی دونوں ساتھیوں کو جاوید کے اشارے پر اُن کے ساتھ آنے والے جوان نے وہاں سے چلتا کر دیا تھا ویسے بھی یہ بڑے سیانے لوگ تھے اور اپنے بزنس کو اچھی طرح سمجھتے بھی تھے۔

"صاحب! آج صبح ہی اطلاع ملی تھی۔ اُس کی

قرآن خوانی بھی ہوگئی۔ سنا ہے لانچ ہی ڈوب گئی۔ سب بندے مارے گئے......" سورس نے اپنی کارگزاری بتانے کے لئے بات آگے بڑھائی...... "میں شام کو آیا تھا لانچ سے صاحب...... ابھی آپ کو فون کرنے والا تھا"...... اُس نے کمانڈر جاوید کو مخاطب کیا۔ "...... او کے۔ تم ہمیں اُس کے گھر لے چلو"...... جاوید نے اُسے کہا۔

"جی صاحب"...... یہ کہتے ہوئے "سورس" اُن کے آگے آگے چلنے لگا اور انہیں ایک جھونپڑی نما مکان کے دروازے سے کچھ فاصلے پر رُکنے کے لئے کہہ کر دروازے پر دستک دی۔ دو تین مرتبہ دستک دینے پر ایک نوجوان آنکھیں ملتا باہر آیا۔ غالباً وہ جمن خان کا بیٹا تھا۔ "سورس" نے اُس سے ہاتھ ملایا اور دو تین باتیں کرنے کے بعد اُسے اُن کی طرف لے آیا۔

"یہ بہاول ہے صاحب جی...... جمن خان کا بڑا بیٹا"......

"سلام صاحب"...... بہاول جسے "سورس" پورا پروٹوکول سکھانے کے بعد یہاں لایا تھا سر تک ہاتھ لے جا کر مودب کھڑا ہوگیا۔

"ٹھیک ہے تم چلو"...... جاوید نے "سورس" کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں کو باری باری قریباً فرشی سلام کر کے چلا گیا......

"کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں"...... عاطف نے بہاول کی طرف دیکھا۔

بہاول کچھ ہچکچا رہا تھا۔

"صاحب ہم تو غریب......"

"کوئی بات نہیں...... اپنی ماں کو بھی جگا دو...... ہم نے اُن سے بھی بات کرنی ہے"...... عاطف نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بہاول جانتا تھا یہ اعلیٰ جنس کے لوگ ہیں اور رستے میں جان نہیں چھوڑیں گے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بھائی اور والدہ اُن سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے باپ سے متعلق ہر سوال کا جواب دینے کے بعد اُن سے التجا کی کہ وہ سلطان خان کو کچھ نہ کہیں کیونکہ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔

"ٹھیک ہے...... تمہیں کوئی اطلاع ملے تو ہمیں ضرور بتانا۔ یہ نمبر اپنے پاس رکھ لو اس پر فون کر کے بتا دینا"......

دونوں جیپ کی طرف جا رہے تھے اب انہیں سلطان خان کی تلاش تھی، جس کا نام تو کان آشنا تھا لیکن

سنہری باتیں

☆ گفتگو ختم کرنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب دوسرا کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا رہا ہے۔

☆ خاموشی اظہار نفرت کا بہترین طریقہ ہے۔

☆ بہت سی باتیں کہنی آسان ہیں لیکن کرنی مشکل۔

☆ شادی بھی انہیں میں سے ایک ہے۔

☆ بادشاہ کا پہلا قانون اپنی حفاظت ہوتا ہے۔

☆ گلے سڑے سیبوں میں انتخاب کی گنجائش نہیں۔

☆ خوبصورتی چند روزہ حکومت ہے۔

☆ کوئی آئینہ ایسا نہیں جس نے عورت سے یہ کہا ہو کہ تو بدصورت ہے۔

☆ آزادی اکا نام نہیں کہ اخلاق یا مذہب کی پابندی نہ کی جائے۔

بعض عورتیں ایسی بھی ہوتیں ہیں کہ اگر عورتیں نہ ہوتیں تو ناقابل برداشت ہوتیں۔

نازیہ جاوید۔ باغ گل بیگم

آج تک اُس کے خلاف کوئی واضح ثبوت سامنے نہیں آیا تھا جس کی بنیاد پر اُسے گرفتار کیا جا سکے۔

"پکڑو اُسے......کون ہے یہ"...... کموڈور عاطف نے جاوید سے کہا۔

شام تک متعدد مقامات پر چھاپے مارنے کے بعد کموڈور عاطف کو یہ رپورٹ مل گئی تھی کہ سلطان خان پاکستان میں نہیں ہے۔ اس کے کئی غیر ملکی ٹھکانے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُس نے اپنی شناخت بھی ایک سے زیادہ رکھی ہوئی ہیں۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ ملک سے باہر جا چکا ہے۔

اُس رات نیول انٹیلی جنس کی یہ فائنل رپورٹ متعلقہ اتھارٹی کو پہنچا دی گئی تھی۔

O

ملک ناصر سے وہ نوجوان ڈیرے پر ملنے آیا تھا، اجنبی لوگوں سے اُن کی ملاقات چونکہ بہت مشکل تھی یہی وجہ ہے کہ اُسے ملک ناصر تک پہنچنے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا تھا، اب دونوں آمنے سامنے موجود تھے، اُس نے اپنا تعارف اجمل کے نام سے کروایا اور اپنا شناختی کارڈ بھی اُس نے ملک ناصر کو دکھایا، اس نوجوان نے اپنا تعارف سلطان خان کے بھانجے کی حیثیت سے کروایا تھا اور ایک موبائل فون اُسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ سلطان خان اس فون پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے، اگر اُس کی اجازت ہو تو بات کروا دے۔

"وہ خود کیوں نہیں آیا؟"...... ملک ناصر نے قدرے غصے سے پوچھا

"ملک صاحب میرے پاس آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں کیونکہ آپ کا حکم تھا کہ وہ آپ سے بات کریں ہمیں جو پیغام ملا ہے اُس پر عمل کر رہے ہیں اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے......" نوجوان نے قدرے بے بسی سے کہا تھا۔

ملک ناصر سمجھ گیا کہ گزشتہ روز وہ چونکہ سلطان خان کے رشتہ داروں کو اُٹھا کر لے آیا تھا اس لئے شاید سلطان خان اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"ٹھیک ہے ملاؤ نمبر......" اُس نے نوجوان سے کہا جس نے ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد موبائل اُسے تھما دیا۔

دوسری طرف لائن پر سلطان خان اُس سے مخاطب تھا، اُس نے پہلے تو اس طرح بات کرنے پر معذرت کی اور بتایا کہ وہ ملک سے باہر ہے اور اُسے اچھی طرح اندازہ ہے کہ ملک ناصر اور اُس کے ساتھیوں کے تمام فون ٹیپ ہو رہے ہیں اس لئے وہ اس محفوظ لائن پر بات کر رہا ہے۔

اُس نے ملک ناصر کو سارے معاملات بلا کم و کاست بتا دیے تھے اور اُسے بتایا تھا کہ اس میں نہ تو سلطان خان کا کوئی قصور ہے نہ اُس کے آدمیوں کا نہ ہی اُس نے یہ بات اُن سے پوشیدہ رکھی تھی اُس نے اُنہیں یہ بتا دیا تھا کہ سفر کس طرح ہوگا اور کہاں سے کہاں تک لانچ پھر ہوائی جہاز کا سفر کیا جائے گا، اُس نے ملک ناصر سے کہا تھا کہ وہ اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے نہ ہی اس کی کوئی اخلاقی ذمہ داری ہے اس کے باوجود صرف اس کے علاقے کا ہونے کے ناطے وہ اپنی تمام تر کوشش کے ساتھ ملک نبیل کو انڈیا سے واپس لائے گا اس سلسلے میں جو بھی بات ہوگی اس کی خبر وہ ملک ناصر کو ضرور دے گا اُس نے ملک ناصر سے کہا تھا کہ وہ اُس کے رشتہ داروں کو تنگ نہ کرے کیونکہ اُن کا کوئی قصور نہیں نہ ہی یہ مردانگی کا تقاضا ہے اور نہ ہی اُسے زیب دیتا ہے۔ دوسری درخواست اُس نے یہ کی تھی کہ سلطان خان کے اس فون کی اطلاع ایجنسی والوں کو نہ دے اس کا نہ تو

اُسے کوئی فائدہ ہوگا نہ ہی سلطان خان کو کوئی نقصان ہوگا۔

ملک ناصر نے بات مکمل ہونے کے بعد نوجوان کو واپس کر دیا اُسے کچھ پیسے اُس کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود تھما دیئے کیونکہ وہ اس مرحلے پر سلطان خان کی طرف سے پیدا ہونے والی معمولی سی اُمید کی کرن کو بھی اپنے لئے تائید غیبی سمجھ رہا تھا اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ معاملہ اُس کے اور سلطان خان کے درمیان ہی رہے گا اگر وہ انٹیلی جنس والوں کو یہ بتا بھی دیتا کہ اُس نے سلطان خان سے فون پر بات کی ہے تو یہ اُن کے لئے نہ تو حیران کن بات ہوتی نہ ہی کوئی خوشخبری۔ وہ لوگ اُس سے کہیں زیادہ ذرائع اور معلومات سلطان خان کے متعلق رکھتے ہوں گے اور اگر وہ انہیں مطلوب ہے تو ملک ناصر کی مدد کے بغیر بھی وہ اُسے گرفتار کر لیں گے۔ جب تک اُسے انڈیا سے کوئی اطلاع سرکاری طور پر ملک نبیل کے متعلق نہ ملتی تب تک وہ اُس کے لئے فی الوقت کچھ کرنے سے قاصر تھا اُس نے اس دوران جو اطلاعات اپنے طور پر جمع کی تھیں اُن کے مطابق آج کل دونوں ملکوں کے درمیان خصوصاً ممبئی والا واقعہ ہونے کے بعد سے جس طرح کے حالات چل رہے تھے اُن میں اُس کا بھارت جانا ممکن بھی نہیں تھا اگر وہ اپنے بھائی کی قانونی مدد کے لئے بھی جاتا تو بھی ممکن ہے اُسے ملک نبیل سے ملاقات کی اجازت ہی نہ ملتی۔

ملک ناصر تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہا۔ اُسے اب کسی معجزے کا انتظار تھا یا پھر کوئی معمولی سی اُمید تھی تو صرف سلطان خان سے جو پاکستان سے باہر تھا۔

کہاں؟ اس سوال کا جواب تو شاید سلطان خان کی بیوی کے پاس بھی نہیں تھا کیونکہ ایجنسیاں سلطان خان کے پیچھے لگی تھیں خصوصاً اس کی لانچ کی تباہی نے اُن کے لئے بڑے مسائل کھڑے کر دیے تھے سلطان خان کے لئے اس طرح کے حادثات کچھ اہمیت نہیں رکھتے تھے اس مرتبہ معاملہ اس لئے کچھ سیریس ہو گیا تھا کہ اُس کی لانچ انڈین نیوی نے تباہ کی تھی اور ملک نبیل انڈین انٹیلی جنس کے شکنجے میں پھنسا ہوا تھا جو اُس کے لئے بالکل غیر متوقع بات نہیں۔

ملک ناصر بھی کوئی دودھ کا دھلا تو نہیں تھا کہ معاملات کی اصلیت کو نہ جان سکتا۔ اُس کے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ ملک نبیل تک رسائی تھی جس کے بعد وہ اس کی رہائی کے لئے کوئی بھی قیمت ادا کر کے اپنی چاچی زینب کے سامنے سرخرو ہو سکتا تھا۔ اُس کے لئے چاچی زینب کی حیثیت کسی بھی طرح اُس کی سگی ماں سے کم نہیں تھی، جس کا ایک بیٹا اور خاوند پہلے ہی دشمنی کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور باقی رہ جانے والے ملک نبیل کے متعلق ایسی اندوہناک خبر سننے کو ملی تھی۔

O

ٹرین میں سفر کرتے ہوئے انہیں قریباً چار گھنٹے ہو رہے تھے۔ ٹرین کہاں پہنچ چکی تھی اس کا علم تو ملک نبیل کو نہیں تھا نہ ہی اس نے وہاں موجود اپنے کسی ساتھی سے کچھ پوچھا۔ وہ کوئی بھی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے عجائب سنگھ یا سالگ رام کی رائے اس کے متعلق تبدیل ہو جائے اُسے اب تک رات ڈھلنے کا انتظار تھا جس میں اُس نے زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس جوئے میں معاملہ آر ہوتا یا پار۔

ملک نبیل نے ایک بات بطور خاص نوٹ کی تھی کہ اب سے قریباً دو گھنٹے پہلے اُن کی گاڑی ایک جنکشن پر قریباً ایک گھنٹہ رکی رہی تھی جبکہ باقی کسی سٹیشن پر اُس نے اتنا لمبا قیام نہیں کیا تھا عجائب سنگھ اور اُس کے ساتھی نیند

سے لڑنے میں مسلسل کوشاں تھے جبکہ ملک نبیل بھی بظاہر یہی تاثر دے رہا تھا کہ اُس پر نیند غلبہ کر رہی ہے۔ اس دوران اس نے کمال ہوشیاری سے مسلسل اپنا منہ مریضوں جیسا بنائے رکھا تھا اور عجائب سنگھ کو بتایا تھا کہ اُسے پیٹ کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے۔

"مہاراج جی اتنی دیر......!"

پلیٹ فارم پر ٹہلتا سالگ رام جب اُن کی کھڑکی کے نزدیک آیا تو عجائب سنگھ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"یار آرمی والوں کے کچھ ڈبے اٹیچ ہو رہے ہیں......" سالگ رام نے بد دلی سے کہا۔

ایک لمحے کے لئے ملک نبیل کا دل دھک سے رہ گیا، اگر اس ٹرین میں بھارتی آرمی بھی سفر کر رہی ہے تو اُس کے فرار میں خاصی مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں،

"لیکن انہیں سویلین سے کیا لینا دینا"...... اُس نے پھر خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

اللہ اللہ کر کے ٹرین چلی تھی اور اندھیرا آہستہ آہستہ بڑھنے لگا تھا اب ٹرین غالباً کسی سرنگ سے گزر رہی تھی کیونکہ اندھیرے میں انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور ڈبے میں لٹکتے بلبوں کی روشنی بھی ناکافی ہو رہی تھی۔

"کچھ پہاڑی علاقہ ہے۔ میں پہلے سفر کر چکا ہوں اس روٹ پر"...... امول سنگھ نے اپنی معلومات جتانا ضروری سمجھا۔

سالگ رام نے اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر اونگھنے لگا۔

سرنگ سے باہر نکلے ابھی انہیں بمشکل دس منٹ گزرے تھے سارے ڈبے پر سکوت طاری تھا قریباً تمام مسافر آڑے ترچھے ہو کر گہری نیند سو رہے تھے، اچانک ملک نبیل کو یوں لگا جیسے کوئی زلزلہ آ گیا ہو، زوردار دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی ڈبے نے ہچکولے کھانے شروع کر دیے، کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن ملک نبیل کے اوسان خطا نہیں ہوئے تھے وہ مکمل چوکس اور بیدار تھا، اچانک ہی کس نے ڈبے میں چیختے ہوئے بتایا کہ ٹرین پر "اُت وادیوں" نے حملہ کر دیا تھا۔

امول سنگھ اس سے پہلے عجائب سنگھ کو سرگوشی کے انداز میں خبردار کر چکا تھا کہ یہاں علیحدگی پسندوں کے گروپ سرگرم عمل میں ہیں اور وہ ٹرینوں کو نشانہ بناتے رہتے تھے۔

ملک نبیل کے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ فوجیوں نے عام لوگوں کو بھی اپنے ساتھ مروا دیا ہے، اُسے بعد میں علم ہوا کہ یہاں فوج کی نقل و حرکت کا محفوظ...... یہی سمجھا جاتا ہے اگر سپیشل آرمی ٹرین چلے تو اُس کے لئے خطرات بہت بڑھ جاتے ہیں اسی لئے آرمی والے سویلین ٹرینوں کے ڈبوں سے منسلک ہو کر سفر کرتے ہیں۔

اچانک ہی ڈبے پر قیامت ٹوٹی جب اُن کا ڈبا ٹرین کے باقی ڈبوں کے ساتھ لڑھکتا ہوا ریلوے لائن سے نیچے گرنے لگا۔ سواریوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، ملک نبیل کو یوں لگا جیسے کئی من بوجھ اچانک اُس پر آن گرا ہو۔ اُن کا ڈبا قریباً پورا اُلٹ گیا تھا اور سب ایک دوسرے کے نیچے دبے چیخ رہے تھے۔ اس چیخ و پکار میں گولیوں کی آوازیں نمایاں تھیں۔ فائرنگ خود کار ہتھیاروں سے کی جا رہی تھی ملک نبیل کو اندازہ ہو گیا کہ فوجیوں اور دہشت گردوں کے درمیان ٹھن گئی ہے۔

قدرت نے اُس کے لئے بڑا سنہری موقعہ پیدا کر دیا تھا۔ اُس کی دعائیں شرف قبولیت پا گئی تھیں۔

اپنے حواس قائم رکھتے ہوئے اس نے سب سے پہلے اپنے اوپر گرے سامان کو ممکنہ حد تک پرے کیا اور اپنا ہتھکڑی والا ہاتھ کھینچ کر اندازہ لگا لیا کہ ہتھکڑی کا دوسرا

سرا جو عجائب سنگھ کی پتلون سے لگی بیلٹ میں پھنسا ہوا تھا نکل کر باہر آ گیا ہے جس سے وہ اپنے دونوں بازوؤں کو آسانی سے حرکت دے سکتا تھا۔ عجائب سنگھ کی مہربانی سے اُس کا ایک ہاتھ پہلے ہی آزاد تھا۔

ٹرین کا ڈبا اُلٹنے سے مسافر بری طرح زخمی ہوئے اور ڈبے میں ہی پھنسے ہوئے بھی تھے۔ ملک نبیل نے اپنی ساری طاقت جمع کر کے اپنے جسم کو قدرے آزاد کیا تو اُس کے سامنے دل دہلا دینے والا منظر تھا، سالگ رام اور امول سنگھ قریباً کچلے جا چکے تھے، جبکہ عجائب سنگھ بری طرح زخمی تھا، البتہ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے زیادہ چوٹیں نہیں لگی تھیں اور وہ کھلی کھڑکی بھی دیکھ سکتا تھا کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے وہ لاشوں اور زخمیوں کے اوپر نیچے سے ہوتا کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا جہاں چاروں طرف فائرنگ، چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، ملک نبیل نے وہاں سے سامنے درختوں کے جھنڈ کی طرف جانے کا ارادہ کیا لیکن اچانک ہی جیسے زمین نے اُس کے پاؤں تھام لئے۔

"وڈا بچ"...... اُس کے کانوں میں عجائب سنگھ کی آواز پڑی۔

ملک نبیل نے گردن گھمائی تو اُسے کھڑکی کے نزدیک عجائب سنگھ کا خون سے تر بتر چہرہ دکھائی دیا جس نے بے بسی سے اپنا ایک بازو کھڑکی سے باہر نکالا ہوا تھا غالباً اُس کے جسم نے اس سے آگے حرکت کرنے سے ہی انکار کر دیا تھا۔

ملک نبیل کی مردانہ غیرت نے اُس کے بڑھتے قدم روک لیے۔ اُس کے جسم پر کوئی گہری چوٹ تو نہیں آئی تھی البتہ اندرون چوٹوں سے درد محسوس ہو رہا تھا، کچھ خراشیں البتہ چہرے اور بازوؤں پر آ گئی تھیں۔ اس نے عجائب سنگھ کا ہاتھ تھام لیا اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے کھینچ کر بالآخر باہر نکال لیا۔

عجائب سنگھ کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی، سر اور منہ سے مسلسل خون جاری تھا لیکن اس کی ہمت قابل داد تھی، اس نے لڑکھڑاتی زبان سے ملک نبیل کا شکریہ ادا کیا۔

"ہتھکڑی کی چابی میری جیب سے نکال لو"...... اُس نے نبیل کو اگلی ہدایت کی نبیل نے ایک لمحے کے لئے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر زخمی ہونے کے باوجود مسکراہٹ موجود تھی۔

"شکریہ" کہتے ہوئے جیب سے چابی نکال لی۔

"تو نکل جا یار...... میں نہیں بچوں گا"...... عجائب سنگھ نے اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"نہیں عجائب سیاں...... میں بے غیرت نہیں، تمہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ ہمت کر یار...... ہمت کر ابھی مدد آ جائے گی......" اُس نے عجائب سنگھ کو حوصلہ دیا۔

"یار ایک احسان کرنا اگر میں اپنے گھر تک زندہ نہ پہنچ سکا تو انہیں میری ساری کہانی ضرور سنا دینا...... میری چھوٹی گڈی پرمیت کور کے لئے کچھ کر سکو تو ضرور کرنا"......

عجائب سنگھ نے دوبارہ اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔

"عجائب سنگھ! جب تک میں زندہ ہوں تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ کر یار" اُس نے عجائب سنگھ کو ایک پتھر کے سہارے بٹھا کر اُس کی پگڑی سے کسی نہ کسی طرح اُس کی ٹانگ کس کر باندھ دی۔ عجائب سنگھ کی ہڈی اندر سے شاید ٹوٹ چکی تھی وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

چاروں طرف زخمیوں کی چیخ و پکار تھی یا پھر فائرنگ کی آوازیں اُن کے نزدیک بھی کچھ زخمی جو کسی نہ کسی طرح رینگتے ہوئے ڈبوں سے باہر آ گئے تھے۔ مدد کے

لیے چیخ چلا رہے تھے لیکن یہاں جنگل اور ویرانے میں کون اُن کی مدد کو آتا۔ نبیل نے اُسے حوصلہ دیا۔ پانی پلایا اور قدرے آسرا دے کر بٹھا دیا۔

اُس کی جیب میں رکھی پنسل اور ایک چھوٹے سے کاغذ پر اُس نے عجائب سنگھ کے ممکنہ ٹیلی فون نمبر نوٹ کر لیے تھے۔

"عجائب سہیاں میں تیرا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ یہ ایک مرد کا وعدہ ہے"

ملک نبیل نے کاغذ اپنی جیب میں سنبھالتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی اُس کے کانوں میں ہیلی کاپٹر کی مانوس آواز سنائی دینے لگی۔ شاید فوج کے لیے مدد آ رہی تھی۔

"نذیروڑائچ"...... عجائب سنگھ نے اُسے اُس کے بتائے ہوئے نام سے مخاطب کیا......"تو نکل جا یار"......

اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ہتھکڑی کی چابی نکال کر جیب میں رکھی اور ہتھکڑی اُسے تھما دی۔

"اسے راستے میں کہیں غائب کر دینا، اس طرح میں کہہ سکوں گا کہ مجھے تمہارے فرار کا علم نہیں"......

عجائب سنگھ نے کہا۔

"عجائب سنگھ چیونڈیاں دے میلے...... نبیل نے اُس کی طرف دیکھا۔

"یہ رکھ لے...... میرے پاس اتنے ہی پیسے ہیں"...... عجائب سنگھ نے اپنی جیب کی طرف اشارہ کیا۔

"ناں یار ناں...... مجھے اتنا......"

"بس! رب دا واسطہ ای آگے کوئی بات نہ کرنا......"

عجائب سنگھ نے اُس کی بات کاٹی۔

ہیلی کاپٹر کی آواز نمایاں ہونے لگی تھی۔ اُس نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ جانا۔ عجائب سنگھ کے بضد ہونے پر اُس کی جیب سے کچھ نوٹ نکالے انہیں اپنی جیب میں رکھا اور کچھ فاصلے پر موجود جنگل کی طرف چل دیا۔ فی الوقت اُس کے لیے یہی ایک راستہ باقی بچا تھا...... فائرنگ کی آوازیں تیز ہو رہی تھیں۔ اچانک ہی وہ زمین پر لیٹ گیا۔

(اس سنسنی خیز داستان کی اگلی قسط شمارہ مئی 2011ء میں ملاحظہ فرمائیں)

تعاقب

خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے والے ایک نوجوان کی کہانی جو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا تھا

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہو کر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ ملک نبیل کی تفتیش ہوتی ہے دہشت گردی کا الزام لگتا ہے لیکن ثابت نہیں ہوتا جس پر انڈین انٹیلی جنس اُسے پاکستان کے خلاف بطور پراپیگنڈا استعمال کرتی ہے اور عالمی پریس کے سامنے اُسے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں یہ خبر نبیل کے کزن ملک ناصر کو پاکستان انٹیلی جنس کے ذریعے ملتی ہے۔ ملک ناصر سے پاکستان انٹیلی جنس رابطہ کرتی ہے وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اُس کا بھائی کوئی دہشت گرد یا جرائم پیشہ نہیں گردش حالات نے اُسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ انٹیلی جنس والے اُس کی بات مان لیتے ہیں۔ انسانی سمگلر سلطان خان کو لانچ تباہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہے۔ نبیل کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور اب پولیس اس کا چالان دلی کی تہاڑ جیل کے لئے لے جارہی ہے، ملک نبیل حوالدار عجائب سنگھ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے۔ ٹرین پہاڑی اور جنگلی علاقے میں جارہی تھی جب اچانک ایک زوردار دھماکے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹرین پر علیحدگی پسندوں نے اس میں فوجیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر حملہ کیا تھا۔ سینکڑوں لوگ زخمی اور درجنوں مارے گئے عجائب سنگھ کی ٹانگ ٹوٹ گئی جسے ملک نبیل نے بڑی ہمت سے ڈبے سے باہر نکالا اور اُس کی ٹانگ کو پگڑی سے باندھ کر قدرے پرسکون کرنے کے بعد ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا۔ عجائب سنگھ نے اُسے کہا کہ اس کی جیب میں موجود چابی سے ہتھکڑی کھولے اور چابی رکھ کر بھاگ جائے اس طرح کسی کو اُس پر شک نہیں ہوگا۔ ملک نبیل نے شکریہ ادا کیا اور سامنے جنگل میں فرار ہو گیا۔ (اب آگے پڑھیے)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 5

کسی غیر ارادی عمل کے تابع اگر وہ اچانک زمین پر نہ گرتا تو اُس کے کان کے بالکل قریب سے گزرنے والی گولی اُس کے دماغ میں بھی گھس سکتی تھی۔ کئی سیکنڈ تک تو اس کے حواس ہی بحال نہ ہو سکے پھر تیز فائرنگ کی آوازوں نے اس کو صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

نبیل کو آخری لمحات میں اُن مسافروں کی آوازیں یاد تھیں جنہوں نے ٹرین پر کسی دہشت گرد گروپ کے حملے کی چیخ و پکار کی تھی۔ دہشت گردوں سے غالباً اُن کی مراد وہ علیحدگی پسند تھے جو بھارت کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے بھارت سے علیحدگی کی تحریکیں

چلا رہے تھے۔ ان میں سے کچھ گروپ تو اتنے زیادہ طاقتور تھے کہ مقامی انتظامیہ مرکزی حکومت کے بجائے اُن کے اشاروں کے تابع تھی۔

حملہ آور کون ہیں؟ اُس نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹک دیا۔ وہ کوئی بھی ہوں؟ فی الوقت اُس کے لئے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے تھے جن کے حملے نے اُس کے فرار کی راہ ہموار کی تھی ورنہ تو ابھی تک وہ منصوبہ بندی ہی کر رہا تھا۔ خدا جانے آئندہ ایسا موقع ملتا بھی یا نہ ملتا۔

ملک نبیل تربیت یافتہ پولیس کمانڈو تھا اُسے فائرنگ کی آوازوں سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں مختلف طرح کے ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں جس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ علیحدگی پسندوں اور فوجی جوانوں کے درمیان ٹھن گئی ہے دونوں اندھیرے میں ایک دوسرے پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ابھی تک شاید مناسب مدد ہی یہاں تک پہنچی تھی۔

جنگلی اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں دن مکمل ڈھل چکا تھا شاید چاند کی آخری تاریخیں تھیں کیونکہ اب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ نبیل کو ایک ہی سوچ ستا رہی تھی کہ جب یہاں آرمی کی مکمل مدد پہنچ گئی اور ان لوگوں نے اپنی کارروائی کا بھرپور آغاز کر دیا تو عین ممکن ہے وہ اس جنگل میں گھس کر علیحدگی پسندوں کا تعاقب کریں اور ملک نبیل اُن کی نظر میں آجائے۔

”اُسے جنگل میں دور تک نکل جانا چاہیے“......

جیسے ہی یہ خیال آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ چوکس ہو گیا۔ فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑائی کا زور اب جنوب سے شمال کی طرف بڑھ رہا ہے جس سے اُسے قدرے سہولت کا احساس ہوا، ابھی تک اُس نے ہتھکڑی اپنی کمر کے گرد بل دے کر رسّی کی طرح باندھی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس مسئلے پر کوئی خطرہ مول لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ملک نبیل جانتا تھا کہ جیسے ہی چوہان کا رابطہ عجائب سنگھ سے ہوا وہ فوراً ملک نبیل کی خیریت دریافت کرے گا۔ جواب میں زخمی اور نیم بے ہوش عجائب سنگھ اُسے جو بھی بہانہ کرے چوہان اس کی لاش ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا۔ صبح ہونے تک جب اُسے ملک نبیل زخمیوں یا مردوں میں نہ ملا تو وہ سمجھ جائے گا کہ ملک نبیل فرار ہو چکا ہے جس کے بعد وہ ہر صورت اُسے تلاش کرنے کے لئے زمین آسمان ملا دے گا۔ ملک نبیل نے اپنے کسی بیان میں کسی دہشت گردی کا اعتراف نہیں کیا تھا اور وہ دہشت گرد تھا بھی نہیں۔ قدرت نے اُسے آسمان سے زمین کی طرف پٹخنی دی تھی اور وہ دونوں کے درمیان کسی کھجور میں پھنس گیا تھا...... لیکن اُس کا فرار چوہان کو یقین دلا دے گا کہ وہ کوئی عام ملزم نہیں ہے ضرور اُس نے تفتیش کرنے والوں کو بے وقوف بنائے رکھا تھا۔

اُس نے لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور پھر بغیر آواز پیدا کیے اکڑوں زمین پر بیٹھ گیا۔ شدید تکلیف کے باوجود اُس کے اوسان بحال تھے۔ دشمن کے چنگل سے وقتی نجات نے اُسے خاصا چوکس بھی کر دیا تھا اُسے اب اپنی بقا کی جنگ لڑنی تھی جس کے لئے ذہنی اور جسمانی توانائیوں کا اجتماع لازم تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ سے رجوع کیا تھا اور ایک مرتبہ زندگی میں اپنی ماں تک پہنچ جانے کی دعائیں مانگی تھیں۔ جس کے بعد وہ خود کو خاصا مضبوط محسوس کرنے لگا تھا۔

ملک نبیل نے پہلے تو بلیوں کی طرح چوکس اپنے پنجوں پر آہستگی سے آگے کی جانب سفر کا آغاز کیا۔ اُسے

کچھ علم نہیں تھا کہ جنگل کس سمت میں پھیلا ہوا ہے وہ صرف ٹرین کی مخالف سمت ذہن میں رکھ کر آگے سفر کر رہا تھا۔ اب اُس نے کمر کے بل جھک کر چلنا شروع کیا تھا اور جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ یہاں کانٹے دار جھاڑیاں نہیں تھیں ورنہ تو اب تک اُس کا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہوتا۔ فائرنگ کی آوازیں آہستہ آہستہ دور ہو رہی تھیں اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا خطرے کا احساس بھی دم توڑتا جا رہا تھا۔ مسلسل جھک کر سفر کرنے سے اُس کی کمر دُکھنے لگی تھی جس پر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا اور اب وہ نارمل انداز میں آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اپنے پاس موجود ہتھکڑی کو اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر لوہے کے دستانوں کی طرح چڑھایا ہوا تھا۔

جنگل کا اسرار اور اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں کے درمیانی فاصلے میں ہتھکڑی کی سنگلی کو حفاظتی دیوار کی طرح اپنے سامنے تان کر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اندھیرے میں سمت کا اندازہ تو بہت مشکل ہوتا ہے خصوصاً ایسے تاریک جنگل میں، لیکن اُس کی کمانڈو ٹریننگ آج اس کے کام آرہی تھی اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کے کسی بھی حصے میں کی گئی محنت کبھی ضائع نہیں جاتی۔ اُسے اپنی تربیت کے وہ انتہائی تکلیف دہ مراحل یاد آگئے جب اُن کے اُستاد صاحبان جن کا تعلق پاکستان آرمی کے سپیشل سروسز گروپ سے تھا، انہیں راتوں کو پہاڑی علاقوں میں نیند سے اچانک بیدار کر کے مہینوں پہاڑیوں پر دوڑاتے اور جنگلوں میں قریباً گھسیٹا کرتے تھے۔ بھوکے، پیاسے رہ کر میلوں دن رات کا یہ سفر آج اس کے لئے نعمت خداوندی بنا ہوا تھا۔ وہ اُستاد صاحبان جو اُسے کبھی قصائی دکھائی دیا کرتے تھے آج رحمت کے فرشتے نظر آرہے تھے، اس نے دل ہی دل میں اپنے اساتذہ کو تعظیم دی اُن کی صحت سلامتی کی دُعا کی اور اُن کے سکھائے اُصول ذہن میں دھراتے ہوئے قدم بہ قدم آگے بڑھتا چلا گیا۔

اچانک ہی وہ ٹھٹھک کر رُک گیا۔

اُس کے حساس کانوں نے بہت دور سے آتی وہ آوازیں سن لی تھیں جو ہوا کے دوش پر تیرتی اس کے کانوں کی سمت بڑھ رہی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ چیتے کی طرح چوکنا ہو کر قریبی درخت کے تنے سے چمٹ گیا۔ اب اُس کی ساری توانائیاں واپس لوٹ آئی تھیں۔ جان بچانے کا جذبہ تمام جذبوں پر غالب آگیا تھا۔

ہوا کے سرسراہٹ کے ساتھ اُس سمت آنے والی آوازیں اب نمایاں ہونے لگی تھیں یہ انسانی قدموں کی

اس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔ اپنی تربیت کے اُصولوں کے مطابق تو اُسے ابھی یہیں رُک کر حالات کا جائزہ لینا چاہیے تھا اور صبح ہونے پر ہی سفر کا آغاز مناسب تھا لیکن یہ خوف کہ فوجی صبح ہوتے ہی جنگل میں گھس جائیں گے اور وہ اندھے کے ہاتھ بٹیر کے مصداق کہیں اُن کے قابو نہ آجائے۔ دہشت گرد تو اب اُن کے قابو آنے سے رہے۔

ملک نبیل نے پھونک پھونک کر قدم آگے کے سمت بڑھائے۔ مسلسل اندھیرے میں رہنے سے اب اُس کی آنکھیں بھی قدرے دیکھنے لائق ہوگئی تھیں۔ بلی کی طرح پھونک پھونک کر قدم اُٹھا رہا تھا جھکڑی کو اس نے اپنی حفاظتی دیوار بنا کر اپنے سامنے کیا ہوا تھا۔ جب اچانک اُس کا پاؤں کسی جاندار شے سے ٹکرایا اور وہ گر پڑا ملک نبیل پر زندگی میں شاید پہلی مرتبہ گھبراہٹ طاری ہوئی تھی اُس نے سیدھے بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لیے اور خود کو نارمل کرنے کے بعد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے لگا کہ وہ کس سے ٹکرایا ہے۔

اندھیرے میں جب وہ چند فٹ دور تک دیکھنے کے لائق ہوا تو اُس کو زوردار جھٹکا لگا۔ وہ کسی زندہ نہیں بلکہ مردہ انسان سے ٹکرایا تھا۔ ایک لاش اس سے بمشکل چند فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔ ملک نبیل اب نارمل ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی اندازہ کرلیا تھا کہ یہ شخص زندہ نہیں۔

کون تھا یہ؟

کسی جنگلی جانور کا شکار؟ یا پھر کوئی اور؟ یہی کچھ جاننے کے لئے اُس نے خود کو قریبا لاش پر جھکا دیا تھا اور جلد ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ مرنے والا اُن علیحدگی پسندوں کا ساتھی ہوسکتا ہے جن کی ٹارچوں کی روشنیوں پر فوجیوں نے اندھا دھند فائرنگ کی تھی اور اس فائرنگ کے ساتھ ہی ملک نبیل کو کچھ چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ علیحدگی پسند شاید اپنے باقی زخمی ساتھیوں کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور اپنے اس ساتھی کی لاش چھوڑ گئے تھے۔

کسی میکانکی عمل کے تابع اُس نے نیم فوجی یونیفارم میں ملبوس اُس لاش کے قدموں سے اوپر کی سمت اُسے ٹٹولنا شروع کیا تو سب سے پہلے پاؤں سے کچھ اوپر اس کی ٹانگ کے ساتھ بندھے تیز دھار خنجر سے اُس کا ہاتھ ٹکرایا۔ ملک نبیل نے انتہائی احتیاط سے چمڑے کے ایک کیس میں بند اس خنجر کو اُس کے جسم سے الگ کرکے اپنے قبضے میں کیا اور اب وہ اس کی پتلون کی جیبیں ٹٹول رہا تھا جو بالکل خالی تھیں، اس سے آگے کچھ جاننے کی اُسے حاجت بھی نہیں تھی۔

اس بات کا تو اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ محفوظ راستے پر سفر کررہا ہے علیحدگی پسند اس سمت سے فرار ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے فرار کا راستہ ضرور محفوظ رکھا ہوگا...... اُس کا ذہن بڑی تیزی سے آنے والے وقت کی منصوبہ بندی کررہا تھا۔ اس بات کے صدفی صد امکانات موجود تھے کہ علی الصباح آرمی والے اپنے کتوں کے ساتھ کم ازکم اس لاش تک ضرور پہنچ جائیں گے جس کے بعد وہ اُسی راستے پر سفر کریں گے جس سے ''آتنگ وادی'' فرار ہوئے تھے۔

''مجھے چوہے بلی کے اس کھیل سے نکل جانا چاہیے''...... ملک نبیل نے دل ہی دل میں مضبوطی سے ارادہ باندھا، گھنے درختوں کے چھدرے پتوں میں سے بمشکل ہی کہیں تھوڑا آسمان دکھائی دیتا تھا۔ نبیل نے اپنی گردن کو دائیں بائیں گھما کر ایک تیسری سمت کا تعین کیا اور خنجر کو اپنی کمر میں پھنسا کر آگے بڑھنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ رُک جاتا، سن گن لینے کی کوشش کرتا اور پھر آگے کی سمت چل دیتا۔ اُس کی تربیت کا کمال یہ تھا کہ

اُس نے اپنی سمت تبدیل نہیں ہونے دی تھی ورنہ تو اس طرح کے حالات میں ساری رات سفر کرنے کے بعد بھی مسافر صبح خود کو اُسی جگہ پاتا ہے جہاں سے اُس نے سفر شروع کیا ہوتا ہے۔

وہ تب تک چلتا رہا جب تک اُس کے اعصاب نے اُس کا ساتھ دیا جسمانی حالت تو ایسی تھی کہ اب وہ اگلا قدم اُٹھانے سے بھی قاصر تھا مسلسل مار پیٹ اور کم خوراکی نے اُسے اَدھ موا کردیا تھا اب تک اُس نے جو بھی کامیابی حاصل کی تھی اُس کی وجہ نبیل کی قوت ارادی اور اُس سے بھی بڑھ کر اُس کی ماں کی دعائیں اور وہ قرآنی آیات تھیں جن کا مسلسل ورد وہ احمد آباد سے کرتا آرہا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ان دونوں روحانی قوتوں نے اُس کے گرد ایسا حصار باندھ دیا ہے جس سے گزرنا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہوگا۔

یہ کوئی چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کی ڈھلان سے اُسے اندازہ ہورہا تھا کہ یہ پہاڑی ہے۔ درختوں اور جنگلی جڑی بوٹیوں سے اَٹی اس پہاڑی پر اُس نے رات کے آخری پہر چڑھنا شروع کیا اور اپنی دانست میں قدرے اونچے پہنچنے کے بعد وہاں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بے دام سا ہو کر بیٹھ گیا۔ خنجر اُس نے اپنی گود میں رکھا ہوا تھا کہ کسی اچانک آنے والی مشکل کا سامنا کرسکے۔

اُسے کب نیند آئی؟

وہ کتنی دیر سویا؟

ملک نبیل کو کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ فی الوقت وہ زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ اُسے صرف یہ احساس تھا کہ اُسے خود کو زندہ رکھنا ہے اور ان موزیوں کے شکنجے میں آنے سے بچانا ہے۔

ملک نبیل کی آنکھ بہت دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازوں سے کھلی تھی اور اُسے فوراً اندازہ ہوگیا کہ فوج نے جنگل پر دھاوا بول دیا ہے۔ اُس نے بروقت اور صحیح فیصلہ کرنے پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور انتہائی تکلیف کے بعد بالآخر اپنے جسم کو ایک طویل انگڑائی دینے میں کامیاب ہوگیا۔

حواس بحال ہونے پر اُسے سب سے پہلے آسمان پر ہیلی کاپٹروں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اپنی پوزیشن کا جائزہ لینے کے بعد اُسے اندازہ ہوگیا کہ واقعی وہ جنگل میں کسی پہاڑی پر ہی موجود ہے جہاں سے آسمان بھی قدرے دکھائی دینے لگا تھا۔ سورج نکل آیا تھا اور اُس کی کرنیں پتوں سے چھن کر کہیں کہیں جنگل میں منگل کررہی تھیں۔ سامنے کا منظر نمایاں ہوگیا تھا۔ دور دور تک سوائے درختوں کے گھرے سلسلے کے اور کچھ دکھائی

نہیں دے رہا تھا اور نبیل حیرانگی سے سوچ رہا تھا کہ وہ اس گھنے اور انتہائی خطرناک جنگل میں پوری رات کس طرح محفوظ رہا ہے۔ اُس نے دل میں نجانے کتنی مرتبہ اس پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ کسی نادیدہ قوت نے اُسے احساس دلایا تھا کہ اگر وہ اب تک محفوظ رہا ہے تو ضرور قدرت اُسے اس کی ماں تک محفوظ واپس لے جائے گی۔

ایک ہی پوزیشن میں مسلسل بیٹھنے سے اُس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ تین چار طویل انگڑائیاں اور کچھ ہلکی پھلکی ورزش کر کے اُس نے خود کو قدرے نارمل کیا۔ لیکن اس تھوڑی سی مشقت نے اُس کی بھوک جگادی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے پر اُسے کچھ فاصلے پر پیلے رنگ کی گوندنی کا درخت دکھائی دیا جس کی پھلوں سے لدی شہنیاں زمین پر گری پڑی تھیں۔ اُس کے ساتھ ہی جنگلی شہتوت کا درخت بھی پھل سے لدا پھندا شاید اُس کا منتظر تھا۔ نبیل نے اسے نعمت خداوندی جانا اور اپنے پیٹ کا جہنم قدرے ٹھنڈا کرنے کے بعد اُسے آگے کی فکر دامنگیر ہوئی۔

اس کی توقعات کے عین مطابق صبح طلوع ہوتے ہی بھارتی فوجیوں نے جنگل پر چڑھائی کر دی تھی جس کا اندازہ اُسے اپنے سر پر منڈلاتے ہیلی کاپٹروں سے ہو رہا تھا۔ جن کے لئے نیچے اُترنا تو کیا گھنے درختوں کے اس جنگل میں موجود درختوں کے پتوں سے جھانک کر نیچے کچھ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ملک نبیل جانتا تھا کہ ان فوجیوں کو یہاں سوائے ایک لاش سے جس سے اُس کی ملاقات رات کو ہو گئی تھی اور کچھ نہیں ملے گا۔ وہ کبھی بھی علیحدگی پسندوں کے پھیلائے ٹریپ میں پھنسنا نہیں چاہیں گے اور آسمان سے گولہ باری کر کے بھارتی فوج صرف اس جنگل کو آگ لگا سکتی تھی اور اُسے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

اُس نے اپنے پاس موجود خنجر نما چھرے کی مدد سے یہاں چھوٹا سا گڑھا بنایا جس میں ہتھکڑی دفن کر کے اُس پر جھاڑیاں پھینک دیں۔ نبیل جانتا تھا کہ اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جائے گا اور اب وہ آسانی سے آگے کا سفر کر سکتا تھا۔

جنگل سے باہر نکلوں یا جنگل کے دوسری سمت سے باہر جاؤں؟ اُس نے خود سے سوال کیا اور پھر خود ہی جنگل کے اندر ہی رہنے کا فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا۔ یہاں وہ طویل عرصے تک نہ صرف چھپ سکتا تھا بلکہ جنگلی پھل کھا کر زندہ بھی رہ سکتا تھا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اُس نے اُس سمت میں آگے سفر کا آغاز کیا۔ اپنی دانست میں علیحدگی پسندوں کی نظروں سے بھی بچ سکتا تھا۔

اُسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ اُس کے زندہ یا مردہ نہ ملنے کی صورت میں ''را'' یہ جان جائے گی کہ وہ فرار ہو گیا ہے اور اپنے ہاتھ آئے اس بٹیر کو وہ اتنی آسانی سے فرار ہونے کا موقعہ تو دینے سے رہے۔

○

ٹرین کے دیگر مسافروں کی طرح چوہان کے لئے بھی یہ زبردست اعصابی دھماکہ تھا۔ وہ فسٹ کلاس کے جس ڈبے میں سوار تھا گو کہ وہ ڈبہ براہ راست اس حملے کی زد میں نہیں آیا تھا لیکن پٹڑی سے اُتر گیا تھا اور مکمل اُلٹنے کے بجائے قدرے ٹیڑھا کھڑا تھا جس کی وجہ سے مسافر اور سامان آپس میں بری طرح گڈمڈ ہو چکے تھے اور چوہان کا سر پہلے کھڑکی کے ساتھ لکڑی کی دیوار سے ٹکرایا جس کے بعد اوپر کی برتھ پہ لیٹا ایک موٹا تازہ ماڑواڑی سیٹھ اُس پر آن پڑا۔ ماڑواڑی سیٹھ خوف سے بچوں کی طرح چلا رہا تھا اور اُس کے نیچے دبے چوہان کا غصہ بے قابو ہونے لگا تھا اُس نے دو تین منٹ تک خود کو اسی پوزیشن میں رکھا تا کہ مزید تباہی سے محفوظ رہے جس کے بعد وہ قدرے سنبھل کر اپنے اوپر موجود اس عذاب سے جان چھڑانے کی فکر کرنے لگا۔

ماڑواڑی سیٹھ کی طرح ڈبے کے باقی سوار بھی مختلف زبانوں میں چیخ چلا رہے تھے اور چوہان کا غصہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اگر یہ سیٹھ چاہتا تو ایک طرف لڑھک کر اُسے اپنے بوجھ سے نجات دلا سکتا تھا لیکن وہ کم بخت معمولی جنبش پر بھی تیار نہیں تھا۔

''گدھے، اُلو کے پٹھے! میرے اوپر سے ہٹو''۔ اُس نے سیٹھ کے کان میں غصے سے چلاتے ہوئے کہا لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

چوہان نے بالآخر اُس کی پسلی میں زوردار ضرب لگائی جس سے وہ تڑپ کر ایک طرف اُلٹ گیا اور چوہان کو کچھ ریلیف مل گیا۔ اُس نے اپنے اردگرد گرا سامان اِدھر اُدھر پھینک کر راستہ بنایا اور ڈبے کے کھلے دروازے سے باہر چھلانگ لگادی۔ اُس کا سر ابھی تک درد سے چکرا رہا تھا لیکن جان بچانے کا جذبہ اس تکلیف پر غالب آگیا۔ اُٹھ کر کھڑے ہونے پر اُس نے سب سے پہلے اپنے سر پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر اس امر کا جائزہ لے لیا کہ اُس کا سر پھٹنے سے محفوظ رہا تھا البتہ ماتھے پر ایک گومڑ سا بن گیا تھا۔ دو چار لمبے لمبے سانس لے کر اُس نے خود کو نارمل کیا اور اردگرد کے ماحول پر نظر ڈالی تو سہم کر رہ گیا۔ ٹرین بری طرح تباہ ہوئی تھی اور خصوصاً وہ ڈبے جن میں فوجی سوار تھے بہت خستہ حالت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اُسے فوراً اپنے ساتھیوں کی فکر دامنگیر ہوئی کیونکہ فوجی بوگیوں کے بعد پہلا ڈبہ اُن کا ہی کا تھا۔

چوہان خود کو نارمل کرتے ہوئے اُن ڈبوں کی طرف بڑھا جو تباہی کے بعد مکمل اُلٹ چکے تھے زخمیوں کی چیخ و پکار سے سارا علاقہ گونج رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی مدد نہیں پہنچی تھی۔ ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی یا پھر اپنے پیاروں کی......

کسی نہ کسی طرح وہ اس ڈبے تک پہنچ ہی گیا جس کے باہر کچھ زخمی جو بڑی مشکل سے رینگتے ہوئے ڈبے سے باہر نکلے تھے زمین پر لیٹے دکھائی دیے۔ ان ہی میں عجائب سنگھ بھی موجود تھا جس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر کپڑا بندھا تھا اور وہ ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم بے ہوشی کے عالم میں چوہان کو دکھائی دیا۔ چوہان نے اُس کے نزدیک پہنچ کر اُسے قریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا ''ملزم کہاں ہے؟''......

خدا جانے عجائب سنگھ نے اُس کی بات سنی یا نہیں سنی اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہو۔ چوہان کے لئے اُس کی بے ہوشی بہت تکلیف دہ

غزل

میں ذرہ ہوں کہ نا ذرہ بہت ہوں
ابھی اپنے لئے اتنا بہت ہوں
بتاتے ہیں مجھے میرے بھی خواہ
جہاں ہوتا نہیں، ہوتا بہت ہوں
مرا بھی مسئلہ ہے لفظ جیسا
بظاہر کم ہوں درپردہ بہت ہو
یہاں جو ہیں، نہیں ہیں اس قدر بھی
غنیمت ہے کہ میں تھوڑا بہت ہوں
بتا کہ کتنی محبت چاہئے ہے
تجھے تو دوست میں تنہا بہت ہوں
بھرم بھی رکھ مرا رب فضیلت
بنا بھی دے اگر بنتا بہت ہوں

عباس تابش

تھی۔ اُس کی طرف سے ساری ٹرین جاتی جہنم میں اُس کے تمام ساتھی بھی ان میں شامل تھے لیکن ملک نبیل اُسے ملنا چاہیے تھا۔

''اُسے کیسے ہوش میں لاؤں''......اُس نے دل ہی دل میں عجائب سنگھ کو بڑی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔

عجائب سنگھ بڑا جی دار سکھ تھا......!

اس کی ٹانگ ضرور ٹوٹی تھی لیکن اُس نے ابھی دل نہیں ہارا تھا۔ وہ چوہان کی اصلیت کو جان گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہان کو صرف اپنے ملزم سے مطلب ہے اُس کی طرف سے باقی سب کچھ جائے جہنم میں...... لیکن عجائب سنگھ کا بھی نظریہ کچھ مختلف نہیں تھا اُس کی طرف سے بھی سب کچھ جاتا جہنم میں اُسے صرف ملک نبیل کی فکر تھی۔ جس نے آخری مراحل میں بھی بھرپور انسانیت کا ثبوت دیتے ہوئے اُس کی ٹانگ باندھنے اور اُسے سہارا دے کر بٹھانے کے بعد راہ فرار اختیار کی تھی اور وہ یہ بات جانتا تھا کہ اگر نبیل ان موذیوں کے چکر سے زندہ نکل گیا تو اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور عجائب سنگھ کے اسی احسان کا بدلہ اُتارنے ایک روز ضرور اُس تک پہنچے گا۔

وہ چاہتا تھا کہ نبیل کے فرار کا علم جتنی دیر تک چوہان کو نہ ہو اتنا ہی ملک نبیل کے حق میں بہتر تھا۔ اُسے اس بات پر طیش ضرور آیا تھا کہ چوہان نے اُس کی حالت دیکھنے کے باوجود نہ تو عجائب سنگھ اور نہ ہی دوسرے ساتھیوں کی خیریت دریافت کی تھی اُس نے پہلا سوال ہی ملزم سے متعلق کیا تھا جس کا جواب عجائب سنگھ کے نزدیک یہی تھا کہ وہ فی الوقت بے ہوش ہونے کا چکر چلائے رکھے۔

چوہان اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ خود کسی ڈبے کے نزدیک جا کر باقی لوگوں کی خیرت دریافت کرنے کے بجائے اس نے سب کچھ عجائب سنگھ ہی سے جاننا بہتر جانا...... لیکن عجائب سنگھ تو اچانک بے ہوش ہو گیا۔

ابھی تک طبی امداد بھی نہیں پہنچی تھی لیکن چوہان کو اس بات کا یقین تھا کہ اگلے پندرہ بیس منٹ یا ایک آدھ گھنٹے تک اُن کے لئے مدد آ جائے گی کیونکہ یہاں معاملہ فوج کا تھا۔ اُسے اپنے اردگرد ہونے والی فائرنگ کی سنگینی کا بھی بخوبی اندازہ تھا جو محفوظ رہ جانے والے فوجیوں اور دہشت گردوں کے درمیان جاری تھی۔ عجائب سنگھ قدرے محفوظ جگہ پر تھا لیکن ٹرین کے ڈبے محفوظ نہیں تھے کیونکہ چوہان کو بھی کبھی کسی ڈبے سے گولیاں ٹکرانے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ وہ تجربہ کار انٹیلی جنس آفیسر تھا اور گزشتہ پندرہ سال سے آپریشنل بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اندھیرا پھیلنے تک دہشت گرد فوج کو یہیں اُلجھائے رکھیں گے جس کے بعد وہ سامنے نظر آنے والے جنگل میں کھو جائیں گے اور فوجی صرف ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔

اُس نے اپنے اردگرد نظر ڈالی کہیں کوئی پانی کی بوتل وغیرہ ملے تو وہ عجائب سنگھ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ اُس کا خیال تھا کہ عجائب سنگھ شاید دھماکے کے فوراً بعد کسی نہ کسی طرح باقی کچھ زخمیوں کی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہوا ہے۔ جبکہ خود اُسے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت ڈبے میں لگا تھا جس کے بعد ہی وہ باہر آ سکا تھا۔

چوہان کو فضا میں ہیلی کاپٹروں کے منڈلانے کی آوازیں ضرور سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک ہیلی کاپٹر بھی جنگل کی طرف جاتے دکھائی دیا لیکن ابھی تک کوئی بھی لینڈنگ نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ فائرنگ کی وجہ سے نیچے آنے سے احتراز برت رہے تھے۔ البتہ اُس نے ہیلی کاپٹر کو جنگل کے اوپر سے فائرنگ کرتے ضرور دیکھا

تھا۔ دو چوکس کمانڈوز ہیلی کاپٹر سے نیچے جنگل میں فائرنگ کر رہے تھے۔

چوہان جانتا تھا کہ یہ سعی لاحاصل ہے کیونکہ اس گھنے جنگل میں اول تو گولیوں کی رسائی ہی انسانوں تک ممکن نہیں تھی اگر ایسا ہوتا بھی تو اسے اندھی فائرنگ کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا شاید فوجی انہیں مارنے سے زیادہ دہشت زدہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔

چوہان کی خوش قسمتی کہ وہاں بکھرے سامان میں اُسے ایک پانی کی فلاسک مل ہی گئی۔ اس گاڑی میں سوار قریباً ہر ہندو سواری اپنے ساتھ اپنا ذاتی پانی لے کر ہی سفر کر رہی تھی۔ یہ لوگ دوسرے کے پانی پر بھی بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

اُس نے پانی کی فلاسک سے عجائب سنگھ کے منہ پر زوردار چھینٹے مارے تو درد سے بے حال عجائب سنگھ کو ہوش میں آنا ہی پڑا۔ اُس نے فوراً ''پانی پانی'' کی تکرار شروع کر دی تھی۔

چوہان نے غصے سے اُس کی طرف دیکھا اور بادل نخواستہ فلاسک اُس کے منہ سے لگا دی۔ عجائب سنگھ نے پانی کے دو تین گھونٹ بڑی تکلیف سے حلق میں اُنڈیلے کے بعد اُس کی طرف توجہ کی۔

''کہاں ہے ملزم''؟

اُس نے عجائب سنگھ کو اپنی طرف متوجہ پا کر جلدی سے پوچھ لیا۔

''سر جی! مجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہاں سب مر گئے ہیں یا زخمی ہیں......اُدھر، اُدھر بوگی میں ہوں گے سب۔ میں دھماکے سے باہر گرا تھا۔ میری ٹانگ ٹوٹ چکی ہے'' عجائب سنگھ نے سامنے ڈبوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن چوہان کو اُس کی باقی باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے ٹرین کی طرف بڑھنا چاہا اور کسی میکانکی عمل کے تابع بمشکل تین چار قدم چلنے کے بعد واپس آ گیا۔ اچانک ہی سامنے ڈبے سے کچھ گولیاں ٹکرائی تھیں۔

چوہان فوراً زمین پر لیٹ گیا اور کافی دیر تک اپنے اوسان بحال کرتا رہا۔ دور سے بے حال عجائب سنگھ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اُسے سامنے کا منظر خاصا واضح دکھائی دے رہا تھا۔

چوہان کو ڈبے تک رسائی حاصل کرنے میں قریباً تین گھنٹے لگے تھے اس دوران امدادی پارٹیاں وہاں پہنچ گئیں، جنہوں نے مصنوعی سرچ لائٹس میں اپنا کام شروع کیا وہ لوگ صبح ہونے تک زخمیوں اور لاشوں کو جمع کرتے رہے۔ چوہان نے سالگ رام کی لاش اور باقی دونوں سپاہی شدید زخمی اور بے ہوش حالات میں دیکھ لیے تھے لیکن، صبح ہونے تک اُسے ''ملزم'' دکھائی نہیں دیا جس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ وہ فرار ہو گیا ہے۔ چوہان کو اس تصدیق سے جھٹکا سا لگا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ

حلال اور حرام گوشت میں فرق

سیدنا جعفر صادقؓ سے کسی نے پوچھا کہ ذبح کئے ہوئے جانور اور مردار جانور کے گوشت میں کیسے فرق کیا جائے؟ آپ نے جواب دیا۔ اگر گوشت آگ کی تپش سے سکڑتا ہے تو وہ ذبح کئے ہوئے جانور کا ہے اور اگر پھیلتا ہے تو مردار جانور کا ہے۔ (وجاہت علی لاہور)

خانہ کعبہ

خانہ کعبہ واحد ایسی جگہ ہے جس کے اُوپر سے آج تک کوئی پرندہ نہیں گزرا، دنیا کی کسی ایئر لائن کا جہاز اس کے اُوپر سے نہیں گزرا، قدرتی طور پر اسکی سمت ایسی ہے کہ چاند اور سورج بھی اس کے اُوپر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مراسلہ: عندلیب لاہور، عبیرہ بلال لاہور

اتنی لمبی تفتیش کاٹنے کے بعد بھی اُس کا ملزم اس قابل کیسے رہ گیا تھا کہ وہ تخریب کاری کے باوجود فرار ہو گیا۔

اپنی جیب میں محفوظ موبائل پر اُس نے بادل نخواستہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو ساری کہانی سنائی۔ جہاں سے اُسے جواب میں ''ملزم کو بہر صورت گرفتار کرو'' کا حکم ملا۔

چوہان کا جی چاہتا تھا کہ اپنے افسر اعلیٰ کو ابھی جا کر گولی مار دے یا کم از کم اپنا وہ موبائل ہی اپنے سر میں مار لے جس کے ذریعے اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر سے بات کی تھی۔

ان عقل کے اندھوں کو شاید صورتحال کی سنگینی کا علم نہیں۔ وہ کہاں سے ملزم کو گرفتار کر کے لائے؟ دل ہی دل میں اُس نے اپنے افسران کو بے شمار مغلظات سے نوازا اور اُس خیمے تک پہنچا جہاں اس کے ساتھیوں کو طبی امداد دی جا رہی تھی۔ دونوں ہوش میں آچکے تھے اور بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ البتہ عجائب سنگھ جسے میڈیکل ٹیم نے تین چار درد ختم کرنے کے انجکشن لگائے اور اُس کی ٹانگ کو فی الوقت لکڑی کی چھوٹی چھوٹی تختیوں سے اس طرح باندھ دیا تھا کہ ٹانگ کو مزید کوئی نقصان نہ پہنچے خود کو قدرے بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے چوہان کی کچھ باتوں کے جواب بھی دے دیے تھے۔

چوہان نے اُن تینوں کو سختی سے نصیحت کی تھی کہ جب بھی افسران بالا سے سامنا ہو وہ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ چوہان کسی اور ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ اگر یہ اطلاع اُس کے ہیڈ کوارٹر کو ہو جاتی کہ اُس نے ملزم کو گارڈ کے حوالے کر دیا تھا اور خود فسٹ کلاس کے ڈبے میں آرام کر رہا تھا تو اُس کی جان پر بن آئی۔ وہ ان تینوں سے بار بار یہی درخواست کر رہا تھا کہ کسی کے بھی پوچھنے پر وہ یہی بتائیں کہ وہ اُن کے ساتھ ڈبے میں موجود تھا۔

چوہان کے لئے ان حالات میں ملزم کا فرار اُس کے منہ پر طمانچے کے برابر تھا لیکن وہ اپنی بے پناہ خواہش کے باوجود ملزم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اُس کا گجرات میں آنا جانا لگا رہتا تھا اور ان جنگلوں کے اسرار وہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس میں داخل ہونے والے کبھی زندہ باہر نہیں نکلتے تھے اُسے اُمید تھی کہ اب تک یا تو ملزم مارا جا چکا ہوگا یا پھر مارا جائے گا کیونکہ یہ پر اسرار اور کئی کئی میلوں پر پھیلے جنگلات دہشت گردوں، خطرناک مجرموں، جادوگروں یا پھر اُن جنگلیوں کے ٹھکانے ہیں جن تک جدید دنیا نے رسائی تو حاصل کر لی ہے لیکن اُن کی آدم خوری کی جبلت کو ختم کرنا اُن کے لئے ممکن نہیں۔

اُس نے فوج کی مدد کو آنے والی کمانڈو پارٹی کے کمانڈر کرنل سے اپنا تعارف کروانے کے بعد البتہ اُسے اعتماد میں لے کر ضرور اس خطرناک پاکستانی دہشت گرد سے متعلق بتا دیا تھا جس کو وہ دلی لے کر جا رہا تھا۔

''کتنے بے وقوف ہو تم لوگ''...... کرنل نے جو پہلے ہی غصے میں دکھائی دے رہا تھا اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا...... ''کیا ایسے خطرناک دہشت گردوں کو ٹرین پر بٹھا کر دلی لے جایا جاتا ہے......''

جواب میں چوہان صرف کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

''ڈیم اِٹ''...... کرنل نے اُسے ڈانٹا اور چوہان وہاں سے ہٹ گیا۔

اگر فوجیوں کو جنگل میں گھسنے کی جلدی نہ ہوتی تو کرنل چوہان کی کچھ خاطر مدارت ضرور کرتا کیونکہ اُسے اس بات پر بھی بہت غصہ آیا تھا کہ ایک معمولی سے انٹیلی جنس آفیسر نے اُس سے براہ راست بات کرنے کی ہمت کیسے کی...... وہ یہ بات اُس کے اسسٹنٹ سے کر سکتا تھا۔

چوہان بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے آنے والی قیامت کا منتظر تھا جو اُس پر بہر حال ٹوٹنی تھی وہ جانتا

تھا کہ آرمی کے اس کرنل کی طرح اُس کے افسران بالا بھی علیحدگی پسندوں کی اس کارروائی کا غصہ اس پر ہی نکالیں گے۔ جبکہ اُس بے چارے کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ شاید یہ اُس کے گناہوں کا ''پراشچت'' (کفارہ) ہوگا۔ اُس نے خود سے کہا کیونکہ وہ بھی تو سور گباش سا لگ رام پر اسی طرح برستا آیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر نے مقامی ڈیٹ DET کو اُس کی مدد کے لئے روانہ کر دیا تھا اور اب اُسے اس مدد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ صبح ہونے تک بالآخر ایک بڑی جیپ میں مقامی ایریا کمانڈر اپنے تین جوانوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا جو اُس کا کچھ شناسا تھا جس پر چوہان نے سکھ کا سانس لیا اُس کے ساتھیوں کو مقامی ہسپتالوں کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا اور اب ایک ٹرک میں لاشیں لاد کر انہیں پوسٹ مارٹم کے لئے لے جایا جا رہا تھا۔

O

ملک نبیل نے اپنی حکمت عملی یہ بنائی تھی کہ وہ دن کی روشنی میں احتیاط کے ساتھ سفر کرتا رہے گا۔ جہاں رات ہونے لگے وہاں قیام کر لیا کرے گا۔ اُسے جنگل میں صرف جنگلی حیات پر زندہ رہنا تھا۔ فی الوقت تو جنگلی بدمزہ اور بے ذائقہ پھل کھا کر اُس نے کچھ گزارہ کر لیا تھا لیکن مستقبل میں ایسا کب تک ممکن ہوگا۔

ایک خنجر نما چھرا۔ عجائب سنگھ کے دیئے ڈیڑھ دو سو روپے اُس کے تن پر موجود پھٹے پرانے کپڑے، یہی تھی اُس کی کل کائنات۔ اگر کوئی بات اطمینان بخش تھی تو وہ اُس کے پاؤں میں موجود وہ جوگرز تھے جو گرفتاری کے وقت اُس نے پہنے ہوئے تھے اور تفتیش مکمل ہونے پر ملٹری انٹیلی جنس والوں نے اُسے لوٹا دیئے تھے۔ جنگل میں ان کے بغیر ایک قدم چلنا بھی اس کے لئے ممکن نہ رہتا۔ اُس نے اپنی کمانڈو تربیت کے مطابق اس تیز دھار چھرے کی مدد سے ایک درخت کی شاخ کو اس طرح ڈنڈے کی شکل دے لی تھی کہ اچانک حملے کی صورت میں اُس سے کسی قدر دفاع کا کام بھی لے سکے۔

فوجی شاید اپنا ناکام آپریشن کر کے واپس جا چکے تھے جب اُس نے مطمئن ہو کر اپنے اگلے سفر کا آغاز کیا اور اُس ڈھلوان نما پہاڑی کے دوسری طرف اُترنے لگا۔ گو کہ دن کا وقت تھا لیکن وہ بہت محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اس نوعیت کے جنگلات میں انسانی زندگی کو کیا خطرات لاحق ہو سکتے ہیں؟

جنگل میں وہ اس طرح چل رہا تھا جیسے گھر میں قالین پر چلتے ہیں۔ اُس کی رفتار آہستہ لیکن بہت محفوظ تھی۔ جوں جوں وہ آگے کی سمت بڑھ رہا تھا۔ جنگل کا اسرار مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے پیدل چلتے ہوئے

قریباً ڈھائی تین گھنٹے ہو گئے تھے اور اس دوران کئی مرتبہ رُک کر اُس نے محض اس امر کا اطمینان حاصل کیا تھا کہ اُس کی سمت صحیح ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ کولہو کے بیل کی طرح وہ ایک ہی جگہ چکر کاٹتا چلا جا رہا ہو۔

نبیل کی بھوک چمکنے لگی تھی۔ مسلسل مار پیٹ اور فاقوں سے اُس کی جسمانی حالت ایسی نہیں رہی تھی کہ اس کی تمام توانائیاں اُس کا ساتھ دیتیں۔ اچانک ہی اُس کے کانوں میں ایک آشنا سی آواز سنائی دینے لگی۔ کسی جھرنے سے پانی گرنے کی آواز تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہاں قریب ہی کوئی پہاڑی جھرنا بھی موجود ہے۔ نبیل آواز کی سمت ہی بڑھ رہا تھا جب اُسے درختوں کا سلسلہ ختم ہوتا اور جھاڑیوں کا دراز ہوتا دکھائی دیا۔

اس کے سامنے ایک پہاڑی تھی جس کی بلندی تو دو ڈھائی سو فٹ سے زیادہ نہیں تھی لیکن یہ پہاڑی اس جنگل کا مکمل حصہ بنی ہوئی تھی۔ پہاڑی کے نزدیک پہنچنے پر اُسے وہ جھرنا بھی دکھائی دے گیا جس سے پانی نیچے گر کر ایک ندی کی صورت اختیار کر گیا تھا یہ ندی دور کہیں جنگل میں ہی غائب ہو جاتی تھی۔ نبیل پُر اُمید انداز میں آگے بڑھا اُس کی خوشی اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے جھرنا سے گرنے والے تیز رفتار پانی سے تالاب نما ندی میں مچھلیاں تیرتے دیکھیں۔ یہ جنگل میں کرشمہ قدرت تھا ابھی نجانے اُسے کیا کیا دیکھنے کو ملتا۔

سب سے پہلے اُس نے اپنے کپڑے اُتارے اور زیر جامے کے ساتھ جھرنے کے نزدیک پہنچ کر جی بھر کے پانی پیا نہایا اور اپنے کپڑے دھو کر وہیں سکھانے کے لئے ڈال دیے جس کے بعد ماہر شکاریوں کی طرح اُس نے دو مچھلیاں پکڑ لیں اور کنارے پر آ کر انہیں اپنے پاس موجود چھرے کے ذریعے ممکنہ حد تک کھانے کے قابل بنا لیا۔

اب اُسے کسی ایسے محفوظ کونے کی تلاش تھی جہاں وہ اس مچھلی کو باربی کیو کر کے کھا سکے وہ نہیں چاہتا تھا کہ آگ جلنے یا دھواں بلند ہونے سے کسی کو اُس کی یہاں موجودگی کا شائبہ ہو یہ بات اُسے اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اس جنگل میں اگر اس ندی کے نزدیک کوئی آبادی ہے تو وہ لوگ اپنی ضرورت کے لئے ادھر کا رُخ ہی کرتے ہوں گے اور ضرور کوئی نہ کوئی کبھی اس طرف آئے گا۔ اُس نے مچھلی آگ پر پکانے کے لئے محفوظ جگہ تو ڈھونڈ لی، لیکن وہ دن کے اُجالے میں یہاں آگ جلانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ چقماق کی مدد سے جلائی آگ جس کا ایندھن بھی گیلی لکڑیاں تھیں بہت دھواں پیدا کرتی جو دور سے دکھائی دے سکتا تھا البتہ رات کے اندھیرے میں دھواں دکھائی نہ دیتا۔

ندی کے قریب ہی چھتے کے درخت سے اُس نے پکا ہوا پھل اُتار کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ کپڑے سوکھ گئے تھے جو اُس نے دوبارہ پہن لئے اور وہیں سورج کی سمت سے کچھ اندازہ لگا کر نماز ادا کرنے کے بعد خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ شام ڈھلنے کے بعد اس نے جنگل کے اندر اُس محفوظ ٹھکانے کا رُخ کیا جو اُس نے اپنے چھپنے کے لئے تلاش کیا تھا۔ یہاں دو پتھروں کی مدد سے گھاس پھونس کو آگ لگا کر اُس پر پہلے سے تیار رکھی لکڑیوں کی مدد سے مچھلی پکائی۔ زندگی میں اس نے آج تک جتنے بہترین کھانے کھائے تھے اُن میں یہ شاید سب سے زیادہ شاندار ڈش تھی۔ گھاس پھونس سے تیار کردہ بستر پر ڈھیر ہوتے کے کچھ بعد ہی اُسے نیند آ گئی۔ اگلی اُس کی آنکھ لگے قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے ہوئے تھے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گیا۔

(اس سنسنی خیز کہانی کی اگلی قسط شمارہ جون میں ملاحظہ فرمائیں)

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے۔ خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہو کر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ ملک نبیل کی تفتیش ہوتی ہے دہشت گردی کا الزام لگتا ہے لیکن ثابت نہیں ہوتا جس پر انڈین انٹیلی جنس اُسے پاکستان کے خلاف بطور پراپیگنڈا استعمال کرتی ہے اور عالمی پریس کے سامنے اُسے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں یہ خبر نبیل کے کزن ملک ناصر کو پاکستان انٹیلی جنس کے ذریعے ملتی ہے۔ ملک ناصر سے پاکستان انٹیلی جنس رابطہ کرتی ہے وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اُس کا بھائی کوئی دہشت گرد یا جرائم پیشہ نہیں گردش حالات نے اُسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ انٹیلی جنس والے اُس کی بات مان لیتے ہیں۔ انسانی سمگلر سلطان خان کو لانچ تباہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہے۔ نبیل کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور اب پولیس اس کا چالان دلی کی تیہاڑ جیل کے لئے لے جا رہی ہے، ملک نبیل حوالدار عجائب سنگھ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے۔ ٹرین پہاڑی اور جنگلی علاقے میں جا رہی تھی جب اچانک ایک زوردار دھماکے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹرین پر علیحدگی پسندوں نے اس میں فوجیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر حملہ کیا تھا۔ سینکڑوں لوگ زخمی اور درجنوں مارے گئے عجائب سنگھ کی ٹانگ ٹوٹ گئی جسے ملک نبیل نے بڑی ہمت سے ڈبے سے باہر نکالا اور اُس کی ٹانگ کو پگڑی سے باندھ کر قدرے پرسکون کرنے کے بعد ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا۔ عجائب سنگھ نے اُسے کہا کہ اس کی جیب میں موجود چابی سے ہتھکڑی کھولے اور چابی رکھ کر بھاگ جائے اس طرح کسی کو اُس پر شک نہیں ہوگا۔ ملک نبیل نے شکریہ ادا کیا اور سامنے جنگل میں فرار ہو گیا۔ نبیل کسی نہ کسی طرح جنگل میں ایک ٹھکانہ چھپنے کے لئے ڈھونڈ چکا ہے اور اب وہ تھکا ہارا سو رہا ہے جب اچانک اُس کی آنکھ شور کی آواز سے کھلتی ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 6

نبیل کے لئے یہ سب کچھ انتہائی غیر متوقع تھا۔ وہ تو سونے کی تیاری کر رہا تھا اور اس نے ایک مخصوص جگہ پر اپنا بستر بھی لگا لیا تھا جب اچانک بھاگ دوڑ اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے ہونے والے فائرنگ کی آوازوں نے اُسے چونکا دیا۔ فائرنگ زیادہ تیز نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو تین لوگ ہی آپس میں ایک دوسرے پر بہت محتاط

ہوکر گولی چلا رہے ہیں۔ جنگل میں بھاگتے لوگوں کے قدموں کی آواز بھی اس کے ساتھ ہی نمایاں ہورہی تھی۔

پہاڑی کی جس سمت میں اُس نے اپنا ٹھکانہ بنایا تھا وہاں جھاڑیاں خاصی بلند تھیں جس میں آسانی سے چھپا جاسکتا تھا۔

نبیل ان جھاڑیوں میں قدرے اونچائی پر ایک ہموار قطعہ زمین پر جنگلی گھاس پھونس سے بنائے بستر پر لیٹا تھا۔ اُس کی جلائی آگ اب بجھ چکی تھی ورنہ معاملات بگڑ بھی سکتے تھے۔

مچھلی کھانے سے اُسے اپنے دوبارہ زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اور جب یہ ہنگامہ شروع ہوا تو وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ نبیل اپنے ایک ہاتھ میں خنجر پکڑے اس طرح چوکس ہوکر بیٹھا تھا کہ اچانک برپا ہونے والی کسی بھی ناگہانی آفت کا مقابلہ کر سکے۔

فائرنگ بند ہوچکی تھی۔ بھاگتے قدموں کی آواز دور جاکر غائب ہوگئی تھی۔ ابھی تک اُسے نہ فائرنگ کرنے والے دکھائی دیے تھے نہ ہی اُس نے کسی انسان کو دیکھا تھا کافی دیر تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا پھر قدرے مطمئن ہوکر لیٹ گیا شاید ہنگامہ ختم ہوگیا تھا۔

اچانک ہی اُسے اپنے نزدیک جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا نبیل کا دل دھک سے رہ گیا۔

''کون ہوسکتا ہے یہ''؟۔ اُس نے سوچا..... کوئی جانور یا انسان؟ ظاہر ہے جانور ابھی تک اس جنگل میں آتے دکھائی نہیں دیے تھے کیونکہ یہاں اتنی مار دھاڑ ہورہی تھی کہ وہ شاید جنگل کا یہ حصہ خالی کرکے کسی محفوظ کونے میں سمٹ گئے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور حرکت کرے اپنی طرف ہونے والی ٹارچ کی روشنی نے اُسے بوکھلا دیا۔ پہلے تو اُسے یوں لگا جیسے وہ اندھا ہوگیا ہو۔ جب آنکھیں قدرے دیکھنے کے لائق ہوئیں تو ٹارچ بردار عورت بھی دکھائی دے گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل دکھائے۔ ایک سرد نسوانی آواز اُس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''خبردار اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔''

ممکن ہے وہ اس وارننگ کو نظر انداز کردیتا لیکن عورت کے دوسرے ہاتھ میں پکڑے ریوالور کا رُخ اپنی طرف دیکھ کر اُسے وارننگ کو سیریس لینا پڑا۔

کالی پتلون اور قمیص میں ملبوس یہ عورت اپنے حلیے سے کوئی روایتی ڈاکو دکھائی دے رہی تھی۔

نبیل نے خود کو نارمل رکھا اور ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا ''میں بھی تمہاری طرح مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تمہارا کیا بگاڑوں گا''......

اس نے پہلا فقرہ بہت سوچ سمجھ کر اور ایک نفسیاتی حملے کے انداز میں اس کی طرف اُچھالا تھا کیونکہ یہ بات وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت جو کوئی بھی ہے اس کی طرح مفرور ہے اور ابھی ابھی جو گولیاں وغیرہ چلی تھیں وہ بھی شاید اس کا تعاقب کرنے والے چلا رہے تھے اگر یہ حملہ آور ہوتی تو یہاں چھپ کر جان نہ بچاتی۔

''کون ہو تم۔ کیا کر رہے ہو یہاں؟''..... عورت نے سنبھل کر پوچھا ابھی تک اس نے پستول اُس کی طرف تانا ہوا تھا۔

''بہتر ہوگا اگر تم ٹارچ بند کردو، ٹارچ کی روشنی بہرحال اندھیرے میں دکھائی دیتی ہے اور عین ممکن ہے جن لوگوں کے چنگل سے تم نکل کر آئی ہو وہ ابھی یہاں موجود ہوں''..... نبیل اُس پر مکمل نفسیاتی برتری چاہتا تھا۔

''بہت چالاک دکھائی دیتے ہو''..... عورت نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔

''وقت وقت کی بات ہے میڈم..... میں تو سیدھا سادا دیہاتی ہوں..... حالات انسان کو کیا سے کیا بنادیتے ہیں آپ جانتی ہیں..... مطمئن رہیں۔ میں اتنا پاگل نہیں کہ یہاں کوئی ہنگامہ کھڑا کرکے اپنے اور تمہارے لئے مسائل کھڑے کراؤں..... ہم دونوں میرے اندازے کے مطابق ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور ایک دوسرے کے کام بھی آسکتے ہیں''......

اُس کا اگلا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا

''کون ہو تم؟''..... لڑکی کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''لمبی کہانی ہے..... اطمینان سے بیٹھ جاؤ تو کچھ بتاؤں''......

''اُس نے بظاہر لاپروائی سے کہا..... ''اور ہاں اب یہ پستول جیب میں ڈال لو۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے اور میں کوئی بھڈے بازی نہیں کرنا چاہتا...... ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

''کامنی''..... بے ساختہ لڑکی کے منہ سے نکلا اور اُس نے پستول اپنی بڑی سے واسکٹ نما قمیص کی جیب میں ڈال لی پھر اُس کے نزدیک ہی زمین پر اُس کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

''شاید تم ان لوگوں سے جان بچا کر بھاگ رہی ہو''..... نبیل نے اگلا سوال داغ دیا۔

''کمال ہے..... تم نے تو اُلٹا میرا انٹرویو شروع کردیا..... تمہارا کیا نام ہے''؟

منجیت..... منجیت سنگھ''..... نبیل نے جواب دیا۔

''پنجابی لگتے ہو''..... کامنی نے اُس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے کہا..... ''ادھر کیسے آگئے''......

''قسمت.....'' نبیل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا..... ''ابھی نجانے اور کہاں کہاں جانا ہے......''

''بڑے دُکھی لگتے ہو......'' کامنی نے طنز کیا۔

''نہیں..... ایسی بھی کوئی بات نہیں لیکن یہ صورت حال میرے لئے پریشان کن ہے۔ ہم پنجابی لوگ ہیں، دشمن کو للکار کر حملہ کرنے والے..... معلوم نہیں میں گجرات میں کیسے پھنس گیا..... بڑے گھٹیا بدمعاش ہیں یہاں کے..... پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں''......

اُس نے یہ کہتے ہوئے کامنی کو ایک جعلی کہانی سنادی جس کے مطابق اُس کا تعلق پنجاب کے ایک جرائم پیشہ گھرانے سے ہے جن کا ڈرگز کا کاروبار دور تک ہے بھارت کے کونے کونے میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک بڑی رقم پر بے ایمان ہوکر اُس کے ایک گجراتی حصہ دار نے پولیس کو مخبری کردی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ اُس کا چالان گجرات سے پنجاب جارہا تھا پنجاب سے پولیس اُسے لینے آئی تھی کہ راستے میں ٹرین پر حملہ ہوگیا اور وہ بھاگ

غزل

وہ آئینہ بھی نہیں عکس دل نشیں بھی نہیں
جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں یہاں کہیں بھی نہیں
میں بے یقینی کے جن مرحلوں سے گزرا ہوں
یقین جان مجھے اب ترا یقیں بھی نہیں
زمین یوں تو ہوتا ہے اس نے سلسلہ وار
یہ وہ مکاں ہے کہ جس میں کوئی مکیں بھی نہیں
اور آج یہ مری بے دستی کا عالم ہے
کہ میری کھوج میں اب میرا نکتہ چیں بھی نہیں
مجھے نہ ڈھونڈ زمین و زماں کی گردش میں
میں تیرے دل میں نہیں ہوں تو پھر کہیں بھی نہیں
تو آسماں کو بھی سر پہ اٹھائے پھرتا تھا
اور آج پاؤں کے نیچے تیرے زمیں بھی نہیں
نذیر کیسے گزارے گا زندگی یاں پہ
کہ تیرے ساتھ تو اب تیری ''یاسمیں'' بھی نہیں

نذیر تبسم

جانے میں کامیاب ہوگیا......''

''یہاں جنگل میں چار روز سے دھکے کھا رہا ہوں۔ باہر نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا اس نے آخر میں کہا۔

''ایسا کرنا بھی ناں...... جنگل کے باہر آرمی والوں نے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں۔ اُن کے ہتھے چڑھ گئے تو کچھ بھی ممکن ہے...... ویسے تم ہو کس شہر سے؟''......

کامنی نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

''دیکھو کامنی ابھی تک میں نے تمہارے متعلق کچھ نہیں پوچھا۔ اپنے متعلق جتنا بتادیا اُسے کافی سمجھ پلیز! آئندہ مجھ سے میرے گاؤں یا دھندے سے متعلق کوئی اور سوال نہ کرنا''...... اُس نے کامنی سے قدرے سرد لہجے میں کہا۔

''ناراض ہوگئے کیا؟''...... کامنی نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا......''میں کوئی پولیس والی نہیں تمہاری ہی دنیا کی رہنے والی ہوں...... پھلواڈاکو کی ساتھی ہوں میں...... پانچ سال پہلے اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ آئی تھی گھر سے...... مجھے علم نہیں کہ وہ ''پھلوا'' کا ساتھی تھا...... جب تک علم ہوتا میں کسی قابل نہیں رہی تھی...... پانچ سال تک میں ان کے ساتھ کام کرتی رہی......''

کامنی نے اُس کی طرف دیکھ کر نظریں جھکالیں پانچ سال تک۔

''پھر کیا ہوا؟''......نبیل نے اُسے کریدنا چاہا۔

''پانچ سال تک میں اپنے اُس حرامی عاشق کو قتل کرنے کا موقعہ تلاش کرتی رہی۔ پانچ سال بعد بالآخر مجھے موقعہ مل ہی گیا۔ میں نے اپنے پتی (خاوند) کو مار ڈالا اور بھاگ آئی۔ ساری رات میں جنگل میں چھپی رہی لیکن انہوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔''

''چلو اب تو ان سے جان چھوٹ گئی تمہاری؟''......

نبیل نے اُس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! یہ اس طرح جان چھوڑنے والے نہیں...... تم نے پھلواڈاکو کا نام ہی سنا ہوگا۔ میں نے اسے دیکھا ہے''......کامنی نے سنجیدگی سے کہا۔

''لیکن میری ایسی کوئی خواہش نہیں...... اب کیا ارادہ ہے'' تمہارا...... یہاں سے جا رہی ہو یا......؟''......نبیل نے بظاہر لاپروائی سے پوچھا۔

''نہیں...... ابھی نہیں...... ابھی تو مجھے خود کو محفوظ کرنا ہے۔ ایک مرتبہ یہاں سے نکل جاؤں پھر یہ لوگ میری دھول کو بھی نہیں پاسکتے''...... کامنی نے اپنے مستقبل کے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''اچھا ہے...... دونوں کچھ دن ساتھ تو رہیں گے۔ میں تو تنگ آگیا ہوں...... آٹھ دس روز سے یہاں مچھلیاں پکا کر کھا رہا ہوں......''نبیل نے دلچسپی ظاہر کی۔

''خوش قسمت ہو...... میں تو کل سے بھوکی ہوں......''کامنی نے اُس کی طرف دیکھا۔

''اگر پسند کرو تو کچھ بار۔بی کیو میرے پاس محفوظ ہے سفر کے ارادے سے زیادہ بنالیتا ہوں...... جانے کب اچانک بھاگنا پڑے اور یہاں جنگل میں کھانے کے لئے اس سے اچھی غذا اور کیا ہوگی''......نبیل نے ہوا میں تیر چلایا۔ وہ اس طرح جنگل سے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''ایسی بات بھی نہیں...... زمانے بھر کے اُٹھائی گیرے جمع ہیں اس جنگل میں...... یہاں دہشت گردوں سے لے کر عام قسم کے چور تک ہر طرح کے ملزم نے پناہ لے رکھی ہے...... مقامی جنگلیوں کی کچھ آبادیاں بھی ہیں لیکن یہ لوگ باقی بھارت واسیوں کی طرح ترقی یافتہ نہیں...... ابھی تک اپنی قدیم روایات سے جڑے

ہیں...... حکومت ان تک پہنچتی ہے لیکن یہ حکومت کو پسند نہیں کرتے حالانکہ یہاں سرکار نے پانی، صحت اور تعلیم کی مفت سکیم چلائی ہوئی ہیں......''

کامنی نے اُسے جنگلوں سے متعلق بتایا۔ جس سے نبیل نے اندازہ لگالیا کہ یہ روایتی پرانے قبیلوں کے لوگ ہیں جنہوں نے جدید دنیا اور اُس کی ترقی کو ابھی تسلیم نہیں کیا۔

''اصل میں یہی ''ات وادیوں'' کا خاص شکار بنتے ہیں یہاں جتنی بھی آزادی کی تحریکیں چل رہی ہیں ان سے ان لوگوں کی خوب بنتی ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ یہ حکومت کے بجائے علیحدگی پسندوں کے ساتھی ہیں''۔ کامنی نے اپنی بات مکمل کی۔

''آگے کیا ارادے ہیں تمہارے؟'' نبیل نے اچانک اُس سے پوچھا ''یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی''...... کامنی نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... اس سے زیادہ محفوظ جگہ تو اور کوئی ہوگی ہی نہیں''......نبیل نے جواب دیا۔

''تم پھلوا کو نہیں جانتے۔ میں نے اُس کے بہت وفادار ساتھی کو قتل کیا ہے۔ جو تھا تو میرا پتی (خاوند) لیکن سوتا پھلوا کے ساتھ تھا۔ سارے گروہ کو پتہ ہے اس بات کا۔ وہ کبھی نرمان سنگھ کا بدلہ نہیں چھوڑے گی خواہ اُسے مجھے مارنے کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے''...... کامنی نے اُسے بتایا۔

''اچھا بھلا میں یہاں چھپا ہوا تھا...... خوامخواہ مصیبت میں پھنس گیا''......نبیل نے بیزاری سے کہا۔

''مصیبت بتا کر نہیں آتی منجیت سنگھ......اور ہم جیسے لوگوں کو تو اس کے لئے ویسے بھی ہر وقت تیار رہنا چاہیے''......کامنی مسکرائی۔

''اوہو! میرا مطلب یہ نہیں تھا...... میں دو ماہ کا ریمانڈ کاٹ کر آ رہا ہوں ابھی ڈھنگ سے چلنے کے قابل ہوا تھا......''

''مطمئن رہو...... جب تک میں زندہ ہوں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ تمہارے بھلے کے لئے بتادوں کہ کبھی کبھی پولیس یا آرمی کی کوئی پارٹی اس جھیل کا ایک آدھ چکر ضرور لگالیا کرتی ہے...... اگر ابھی تک تمہارا کسی سے ٹاکرا نہیں ہوا تو خوش قسمتی سمجھو......'' کامنی نے اُسے خبردار کیا۔

ایک لمحے کے لئے تو نبیل واقعی گڑبڑا کر رہ گیا......! بادی النظر میں ایسا ممکن دکھائی دے رہا تھا کیونکہ جنگل میں یہ قدرے میدانی قطعہ زمین تھا اور پولیس والوں کو اس بات کا علم تو رہا ہوگا کہ یہاں مفرور یا مطلوب ملزمان

کی آمد و رفت تو رہتی ہی ہوگی۔
"بات تو تمہاری دل کو لگتی ہے...... میرا خیال ہے نکلیں یہاں سے......" نبیل نے صورت حال کی سنگینی کا احساس کرلیا تھا۔
"ٹھیک ہے صبح نکل چلیں گے"...... کامنی نے جواب دیا۔
"صبح کیوں؟ ابھی کیوں نہیں...... اُجالا ہوتے ہی کہیں......"
"ایسا ممکن ہے...... لیکن یہ بات بھی اپنے ذہن میں رکھنا کہ چھلوا نے میرے لئے جال بچھایا ہوگا...... اُس نے ضرور کوئی نہ کوئی پھندا مجھے پھانسنے کے لئے یہاں لگا رکھا ہوگا...... مجھے اپنی پرواہ نہیں...... میں نے زندگی میں جو کچھ دیکھنا تھا دیکھ لیا...... بھگوان جانے آگے کی زندگی کیسے جی پاؤں گی؟ اگر اس چکر میں تم آ گئے تو یہ پچھتاوا میرے لئے جان لیوا بن جائے گا"......
کامنی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اُس کا مقصد واقعی وہی تھا جو وہ کہہ رہی تھی یا کچھ اور؟ یہ بات تو نبیل کو سمجھ نہ آ سکی لیکن اُس کی مردانگی کو ضرور ٹھیس لگی۔
"میری فکر نہ کرو ہمارے لئے زندگی موت دونوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم چھ بھائی تھے...... تین رہ گئے ہیں۔ تین دشمنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ تماشا ہمارے اُدھر پنجاب میں لگا ہی رہتا ہے......" اُس نے کندھے اُچکاتے ہوئے اظہار لاپرواہی کا تاثر دیا۔
"فوراً نکلنا مناسب نہیں تو پھر رات بیت جائے تو چلیں گے۔ آگے بھی راستہ خطرناک ہے لیکن مجھ پر وشواش (یقین) رکھنا زندہ رہی تو تمہیں اس جنگل کی دوسری طرف محفوظ مقام تک پہنچا دوں گی......" کامنی نے پریقین لہجے میں کہا۔
نبیل نے ابھی تک اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ اُس کے نزدیک یہاں کے اینٹ پتھر بھی قابل اعتبار نہیں رہے تھے لیکن نجانے کیوں اس کو یوں لگا جیسے کامنی سچ کہہ رہی ہے اور وہ واقعی اُس کی مدد کرے گی۔ یوں بھی دونوں فی الوقت تو ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور بادل نخواستہ ہی سہی انہیں ایک دوسرے کے کام تو آنا ہی تھا کہ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی موجود نہیں تھا "او۔ کے جیسے تم چاہو"...... اُس نے سرنڈر کر دیا۔

○

چوہان اپنے ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا رپورٹ لکھ رہا تھا۔ عجائب سنگھ کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ سالگ رام مارا گیا تھا اور باقی دونوں سپاہی بری طرح گھائل تھے یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ محفوظ رہا۔ جب وہ عجائب سنگھ تک پہنچا تو عجائب سنگھ کے حواس بحال نہیں تھے وہ ڈھنگ سے کسی سوال کا جواب ہی نہیں دے پا رہا تھا۔ اُسے صرف اتنی سمجھ آئی کہ ملزم نے عجائب سنگھ کی جیب سے چابیاں اور بچی کچھی رقم نکال لی ہے اور وہ زخمی ہونے کے باوجود بھاگ گیا ہے۔ عجائب سنگھ نے نبیل کے زخمی ہونے کا تذکرہ صرف اُسے مطمئن کرنے کے لئے کیا تھا ورنہ تو وہ جانتا تھا کہ حیرت انگیز طور پر نبیل کو خراش تک نہیں آئی تھی۔
"ہونہہ...... کہاں جائے گا"...... چوہان نے اُسے موٹی سی گالی دے کر کہا "اس جنگل سے تو جانور پناہ مانگتے ہیں...... مار ڈالیں گے اس حرامی کو بھی"...... وہ غصے سے بے قابو ہو رہا تھا...... لیکن اچھی طرح جانتا تھا کہ اس غصے سے وہ سوائے اپنی صحت خراب کرنے کے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔
زخمیوں اور لاش کو اُس نے مقامی پولیس کے حوالے کیا اور خود مقامی ہیڈ کوارٹر میں ساری رپورٹ دینے کے بعد واپس دلی آ گیا تھا۔ آج اُس نے فائنل رپورٹ اپنے ڈی۔ جی کو پیش کر دی تھی اور اب اگلے احکامات کا منتظر وہاں بیٹھا تھا۔
شام ڈھل رہی تھی جب ڈی۔ جی نے اُسے آفس میں طلب کیا۔ ڈی جی اکیلا تھا اور چوہان والی رپورٹ کی فائل اُس کے سامنے دھری تھی جس پر اُس نے رنگ برنگی پنسلوں سے نشانات لگائے ہوئے تھے۔
"ہارڈ لک" (Hard Luck)
ڈی جی نے سگریٹ کے دھوئیں کا مرغولہ فضا میں بکھیرتے ہوئے کہا۔
"سوری سر"...... چوہان اور کیا کہتا۔
"کوئی بات نہیں۔ ابھی کچھ پتے کھیلنے کے لئے میرے پاس موجود ہیں"۔ ڈی جی نے گھنی مونچھوں کے پیچھے سے مسکراتے ہوئے کہا۔
"کیوں نہیں سر......" اُس نے چمچہ گیری کے انداز میں اپنے افسر اعلیٰ کو داد دی جو اپنی تعریف کچھ زیادہ ہی پسند کرتا تھا۔
"ایک پریس کانفرنس بلاؤ اور سرکاری سطح پر اعلان جاری کر دو" اس نے چوہان کو کچھ سمجھاتے ہوئے کہا۔
"واہ سر! واہ! ویل ڈن سر"...... ڈی جی کے پلان پر چوہان عش عش کر اٹھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ اس "پلان" پر عمل درآمد کے اقدامات کر رہا تھا اگلے روز بھارتی میڈیا کی سب سے گرم خبر ایک پاکستانی دہشت گرد کے متعلق تھی جس کی دہشت گردی کی لمبی چوڑی تفصیلات بیان کرنے کے بعد بتایا گیا تھا کہ گجرات کے ایک تفتیش مرکز سے ملزم کو دلی لایا جا رہا تھا کہ اُس کے دہشت گرد ساتھیوں نے جنہیں علیحدگی پسندوں کی حمایت حاصل ہے ٹرین پر حملہ کر دیا جس میں 32 بے گناہ بھارتی شہری مارے گئے۔ 170 شدید زخمی ہیں جن میں سے بعض کی حالت خطرناک بیان کی جاتی ہے۔
یہ پریس کانفرنس محکمہ دفاع کے ایک ترجمان نے کی تھی جس میں پاکستانی حکومت پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ بھارت میں علیحدگی پسند تحریکوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور ان علیحدگی پسند تحریکوں میں پاکستان سے آنے والے دہشت گرد پناہ لیتے ہیں۔
"را" نے اپنی دانست میں ایک تیر سے دو شکار کھیل کر اپنی نالائقی پر پردہ ڈالنے کی بھونڈی کوشش کی تھی انہوں نے علیحدگی پسندوں کے معمول کے حملے کو آئی ایس آئی کے کھاتے میں ڈال کر ملک نبیل جیسے بے گناہ پاکستانی کو دہشت گردوں کا سرغنہ بنا کر پیش کر دیا تھا۔
اس کے ساتھ ہی ساری دنیا میں بھارتی سفارت خانے متحرک ہوئے اور انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کے حامل

اخبارات اور چینلز پر خبریں چلادیں، اس مشن میں سی آئی اے اور "موساد" نے اُن کا بڑھ چڑھ کر ساتھ دیا۔ اگلے روز مظلوم بھارتی حکومت کے حق میں یورپی ممالک کی طرف سے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا جسے خصوصاً بھارتی میڈیا نے بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر پاکستان پر دہشت گردی کے الزامات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

ایک مرتبہ پھر پاکستانی حکومت کو دہشت گردی کے ان جھوٹے الزامات کی صفائی کے لئے میدان میں اُترنا پڑا..... لیکن جھوٹ اتنی شدت اور تنظیم سے بولا جا رہا تھا کہ پاکستان میں موجود ایک بڑے بظاہر لبرل طبقے نے اسے سچ کی طرح قبول کرلیا۔ بعض انگریزی اخبارات کے لبرل کالم نگاروں نے ایک مرتبہ پھر اپنی قلمی توپوں کا رُخ آئی ایس آئی کی طرف موڑ دیا۔

آئی ایس آئی کا مانیٹرنگ سسٹم بڑی دلچسپی سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ حقائق سے آشنا تھے لیکن انہیں بہر صورت اس جھوٹ کا سامنا کرنا تھا۔ جو ایسی حکمت عملی تیار ہونے لگی۔ O

نبیل ہڑ بڑا کر نیند سے بیدار ہوا تھا۔ آنکھ کھلنے پر اُسے سب سے پہلے احساس ہوا کہ کسی نے اُس کے منہ پر بہت آہستگی سے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی فوری ردعمل ظاہر کرے کامنی نے اس کے کان کے نزدیک منہ لے جا کر سرگوشی کے انداز میں اُسے خاموش رہنے کو کہا اور اپنا ہاتھ اُس کے منہ سے اُٹھا لیا رات ضرور ہوگئی تھی لیکن اتنا اندھیرا ابھی نہیں تھا کہ وہ خود سے چند فٹ کے فاصلے پر موجود کامنی کو نہ دیکھ سکے۔

"کوئی گڑبڑ ہے"..... کامنی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

نبیل کا ہاتھ سب سے پہلے اپنی ٹانگ سے بندھے خنجر کی طرف گیا اور اُس نے ہاتھ سے چھو کر اطمینان کرلیا کہ خنجر موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی کامنی کی طرح زمین سے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش کرنے لگا اور اس کے حساس کانوں نے کوئی غیر معمولی آواز ضرور سنی تھی گو کہ یہ کوئی نمایاں آواز نہیں تھی لیکن نجانے کیوں اُسے کامنی کی بات سچ محسوس ہوئی۔

"یہاں سے نکلنا ہوگا فوراً....." کامنی نے سرگوشی کی۔

"او۔ کے"..... نبیل نے کہا اور جلدی سے اپنے جوتے پہن کر اپنے سامنے کی سمت بڑھا۔ لیکن کامنی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

"اُدھر سے"..... اس نے مخالف سمت اشارہ کیا۔

کامنی اُسے پہاڑی ٹیلے کی دوسری سمت لے جانا چاہتی تھی کیونکہ اُس کی دانست میں سامنے کی سمت سے کچھ لوگ اس طرف آ رہے تھے۔ کامنی کا تجربہ جنگلی زندگی میں بہرحال اس سے زیادہ تھا کیونکہ اب اُسے بھی آہٹیں نمایاں محسوس ہو رہی تھیں۔ کامنی کا شک صحیح نکلا وہ لوگ دوبارہ تیاری کے ساتھ اُسے پکڑنے آئے تھے لیکن اب یہ معاملہ صرف کامنی تک محدود نہیں رہا تھا اب وہ بھی اُن کا شکار تھا اگر وہ کامنی سے الگ بھی ہو جاتا تو بھی چھلاوا کے آدمی اُسے مار ڈالتے۔ وہ خود تو چھلاوا کو نہیں جانتا تھا لیکن چند گھنٹوں میں کامنی نے چھلاوا کا جو تعارف اُس سے کروا دیا تھا اُس کے بعد تو اُسے زنانہ ڈاکوؤں کی تمام بھولی ہوئی کہانیاں یاد آ گئی تھیں۔

"میرے پیچھے پیچھے آنا....." کامنی نے سرگوشی کی۔

جواب میں اُس نے صرف سر ہلایا اور کامنی کے پیچھے چلنے لگا۔ جو کسی برق رفتار ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھی۔ پہلے اس نے اوپر کی سمت چڑھنا شروع کیا

پھر پہاڑی کی ڈھلوان میں مخالف سمت اُترنے لگی۔ دس منٹ کے سفر کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں وہ کم از کم سامنے آنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہ سکتے تھے اچانک ہی ایک منظر نے نبیل کو ہلا کر رکھ دیا۔

اُس کی بے چین آنکھوں نے اپنے سامنے لیکن خاصے فاصلے پر ایک مشعل روشن ہوتے دیکھی تھی اس کے ساتھ ہی دوسری پھر تیسری اور دیکھتے ہی دیکھتے دس بارہ مشعلیں روشن ہوگئیں جن سے سامنے کا علاقہ بالکل نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ نبیل نے دیکھا یہ سب چھلاوا کے ساتھی تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بڑی مشعلیں روشن کردی تھیں۔

اُس نے عجیب سی نظروں سے کامنی کی طرف دیکھا۔

"تم صحیح کہتی تھیں"..... بمشکل اُس کی زبان سے نکلا۔

"یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ جنگل کے کیڑے ہیں۔ ان کے لئے رات اور دن میں کوئی فرق نہیں لیکن تم مطمئن رہنا جب تک میں زندہ ہوں کوئی تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ یوں بھی ان کی دشمنی مجھ سے ہے۔ تم سے نہیں"..... کامنی نے بڑے مضبوط اور مردانہ لہجے میں اُس سے کہا تھا۔

"نہیں کامنی..... ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ اب تم میری پناہ میں ہو۔ پہلے وہ مجھ تک پہنچیں گے پھر تم تک آئیں گے"..... اُس کی مردانگی نے اچانک ہی جوش مارا تھا۔ اسی طرح اکیلی لڑکی کو اُس کے دشمنوں کے رحم و کرم پر تو چھوڑا نہیں جاسکتا تھا.....!

"دھنواد" (شکریہ) کامنی نے کہا اور اُسے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کے لئے کہا۔

حضرت بایزید بسطامیؒ

ایک مرتبہ حضرت بایزید بسطامیؒ نے کسی امام کے پیچھے نماز پڑھی۔ امام نے ان سے پوچھا " آپ کا کھانا کہاں سے چلتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا "ذرا صبر کرو۔ میں نماز دوبارہ پڑھ لوں پھر تمہاری بات کا جواب دوں گا"

اس نے پوچھا "کیوں؟"

آپ نے فرمایا "جو شخص روزی دینے والے کو نہ جانے اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔"

(روح الامین۔ ڈسکہ)

کامنی نے گولیوں کی بیلٹ اپنی کمر سے باندھی ہوئی تھی اور ایک بڑی سی نالی والا مقامی پستول پکڑا ہوا تھا۔ ایسے پستول اس سے پہلے نبیل نے یا تو کبھی پاکستان کے شمالی مغربی علاقوں کے بارے میں دیکھے تھے یا پرانی انگریزی کاؤ بوائے فلموں میں.....

اچانک ہی دونوں ٹھٹک کر رک گئے۔ ایک تیز آواز سارے جنگل میں گونج رہی تھی۔ "باہر نکل آ سالی..... بچ کر نہیں جاسکتی تو....." کوئی چیخ کر بول رہا تھا آواز اتنی بلند تھی کہ نبیل کو یوں لگا اگر یہ کچھ دیر اور بولتا رہا تو اس کا گلا پھٹ جائے گا۔

اس نے کامنی کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر اپنی دانست میں اُس کا حوصلہ بڑھایا اور آگے بڑھنے کا اشارہ

کیا۔ کامنی نے مشکور نگاہوں کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور ڈھلوان کے دوسری طرف گھوم گئی۔ اُن کی مخالف سمت میں ڈاکوؤں کے جلنے والی مشعلوں نے سامنے کا علاقہ اس طرح روشن کر دیا تھا کہ جیسے وہاں دن نکل آیا ہو۔ وہ لوگ بڑے تربیت یافتہ اور چالاک دکھائی دے رہے تھے اور انہوں نے اس طرح پھیل کر مشعلیں روشن کی تھیں کہ سامنے کے پورے جنگل میں جیسے دن نکل آیا ہو۔ دونوں قریباً پندرہ بیس منٹ تک چلنے کے بعد اب رُک گئے تھے!

''میرے خیال سے ہمیں یہیں رُکنا چاہیے۔ وہ لوگ دوسری طرف ہیں''...... نبیل نے آہستہ سے کہا۔

کامنی نے اُس کو ہاتھ کے اشارے سے اپنی آواز نیچی رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا ''یہ ٹریپ ہے...... یہ حرامی مجھے پھانسنے کے لئے جال بچھا رہے ہیں۔ سامنے کا منظر دکھانے اور چیخنے چلانے کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں مخالف سمت کی طرف جاؤں اور اُن کے کسی پھندے میں پھنس جاؤں''...... اُس نے نبیل کے کانوں میں سرگوشی کی۔

نبیل کی حیرانگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا اگر وہ اکیلا ہوتا اور اس طرح کی صورت حال پیش آتی تو ضرور ان لوگوں کے قابو آ جاتا۔ کامنی بڑی ہوشیار لڑکی تھی......

''ہم اس علاقے سے جتنی دور نکل جائیں اتنے ہی محفوظ ہوں گے لیکن راستے میں آنے والے پھندوں سے بچ کر نکلنا ہے...... کوئی بات نہیں تم میرے پیچھے پیچھے آؤ...... اور ہاں اپنا فاصلہ کم نہ کرنا...... مجھ سے کم از کم پندرہ بیس فٹ دور رہنا...... میری بات سمجھ گئے ناں''...... کامنی نے اگلی ہدایت کی۔

ہاں...... ہاں...... نبیل نے کہا

اُسے اپنی تربیت کا وہ مرحلہ یاد آ گیا جب انہیں کسی ''کوریئر'' کے ساتھ سرحد پار کرنے کی تربیت دی گئی تھی یا پھر ''مائینز'' والے علاقوں میں چلنا سکھایا گیا تھا، اُس نے اپنا خنجر نکال کر ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا لیکن اُس کو باہر نہیں نکالا تھا اس طرح ممکن ہے معمولی سی چمک پیدا ہونے پر ہی اُن کی موجودگی کا شک نہ ہو جائے۔

اپنی دانست میں وہ اپنے ٹھکانے سے کم از کم ڈیڑھ دو کلومیٹر دور نکل آئے تھے اور نبیل محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ اب محفوظ ہو گئے ہیں لیکن اچانک ہی کامنی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے سختی سے دبا کر کسی خطرے کا احساس دلایا اور وہ چوکس ہو گیا۔

''میں آگے ''ریکی'' کر کے آتی ہوں۔ یہاں سے آگے پیچھے نہ ہونا''...... کامنی نے کہا اور اُس کا جواب سنے بغیر سامنے اندھیرے میں رینگ گئی۔

نبیل اپنی تربیت کے مطابق اپنے قدموں پر جم کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اچانک ہی اُس کے لاشعور میں چھپا اس کا انسٹرکٹر سامنے آیا اور اس صورت حال سے متعلق اُسے ہدایات دینے لگا۔ اُسے یاد آ گیا اس کے ''استاد جی'' نے کہا تھا۔ اگر کبھی ''ملاپ'' کرنا ہو تو ''طے کردہ جگہ'' پر وقت سے کچھ دیر پہلے پہنچ جاؤ اور ارد گرد ''ریکی'' کر کے اس امکان کا اچھی طرح جائزہ لے لو کہ کہیں تمہارے دوسرے ساتھی نے تمہارے لئے کوئی ''ٹریپ'' نہ لگا رکھا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرا ''ایجنٹ'' گرفتار ہو جائے تشدد برداشت نہ کر سکے اور آپ کے دشمن کو ممکنہ جگہ وقت اور ملاقات (ملاپ) سے آگاہ کر دے۔ اس سلسلے کی دوسری اہم ترین نصیحت یہ تھی کہ اگر تمہارا ''کوریئر'' (راہبر) ''ریکی'' کر کے صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے آگے جائے اور تمہیں جس جگہ بٹھا کر جائے اس سے چند قدم آگے پیچھے ہو جاؤ اس

کی واپسی پر کڑی نظر رکھو اکیلا واپس آئے تو فوراً منتخب جگہ پر پہنچو۔ بصورت دیگر خود کو پھنسنے سے بچا لو......''

نبیل کو اس جنگل میں آنے کے بعد شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی میں کسی بھی مرحلے پر کی گئی ریاضت کبھی ضائع نہیں جاتی اور انسان بسا اوقات بڑے مشکل حالات سے محض اس تربیت کے بل بوتے پر بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اُس نے فوراً وہ جگہ چھوڑ دی اور دائیں طرف قریباً دس بارہ گز دور درختوں کے ایک جھرمٹ میں اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اُس طرف آنے والا راستہ اُسے دکھائی دیتا رہے۔ شاید یہ چاند کے جوبن کی تاریخ تھی کیونکہ اندھیرا اُس شدت سے نہیں تھا جیسا رات کو جنگل میں ہونا چاہیے۔ نبیل اپنی جگہ چوکس کھڑا تھا۔ کامنی کو گئے بمشکل تین چار منٹ ہوئے تھے اچانک وہ چونکا۔ ایک گونجدار آواز نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''تو نے کیا سمجھا تھا پھلوا کے آدمی کو قتل کر کے بچ جائے گی''...... کسی نے کامنی کو زور دار آواز میں گندی گالی دے کر کہا۔

اس کے ساتھ ہی ٹارچ روشن ہوئی اور اُس نے خود سے بمشکل دس بارہ گز دور ایک ڈاکو کو کامنی کی گردن سے بندوق لگائے اور دوسرے کو اُس کی سمت ٹارچ روشن کئے دیکھا۔

''کون سا یار ہے تیرا تیرے ساتھ......'' بندوق والے نے اس دوبارہ گالی دے کر پوچھا۔

جواب میں کامنی نے اُسے گالی دے کر نامرد ہونے کا طعنہ دیا اور کہا کہ اگر اُس میں غیرت ہے تو خالی ہاتھ مقابلہ کر کے دیکھ لے۔

حملہ آور نے طیش میں آ کر اس کی کمر میں بندوق کا بٹ مارا جس سے کامنی زمین پر گر پڑی۔

''ضرور تیرا شوق پورا کروں گا سالی۔ ایک مرتبہ پھلوا کے سامنے تجھے پیش کر دوں۔''

''ضرور اس سالی کا کوئی یار اس کے ساتھ ہے''...... ٹارچ والے نے اُسے گالی دی اور آگے بڑھ کر زمین پر گری کامنی کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔

''اگر پھلوا کا حکم نہ ہوتا کہ تجھے زندہ پیش کیا جائے تو ابھی تیرے ساتھ ''بلاتکار'' کر کے تجھے کتیا کی موت مار دیتے'' اُس نے نفرت سے گالیاں بکتے ہوئے کہا۔

''چل اُٹھ آگے چل...... دیکھ لیں گے تیرے دوسرے یار کو بھی......'' بندوق بردار نے اسے ٹھوکر ماری۔

کامنی زمین پر پڑی اُن کی زبان میں انہیں گالیاں دے رہی تھی۔ اُس نے اٹھنے سے انکار کر دیا تھا اور نبیل اُس کی قوت برداشت پر حیران ہو رہا تھا۔ دونوں نے بالآخر اُسے کھڑا کر کے آگے کی سمت دھکا دیا۔

نبیل نے نوٹ کیا کہ جس راستے پر کامنی اُسے بٹھا

کر گئی تھی اُس نے واپسی کے لئے وہ راستہ نہیں اپنایا تھا جس کا سیدھا مطلب یہ تھا کہ وہ اُسے بچانا چاہتی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے کسی عورت کے لئے اپنے دل میں ہمدردی اور محبت کے جذبات ایک ہی شدت سے محفوظ کئے۔ یہ اُس کی غیرت کے خلاف تھا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے یہ لوگ کامنی کو اُٹھا کر لے جائیں۔ اُسے بہر صورت کامنی کو بچانا تھا اور وہ بھی بہت جلدی۔ کیونکہ یہاں شاید یہ دو حملہ آور ہی ناکہ لگا کر بیٹھے تھے جبکہ دوسری طرف اُن کے ساتھی ضرور اُن کے منتظر رہے ہوں گے۔ اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ اُن کے ساتھیوں تک پہنچنے سے پہلے کرنا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں اُس نے حملہ آور کی گن کے بٹ کھاتی کامنی کو ڈگمگاتے ہوئے اپنے قریب سے گزرتے دیکھا دونوں کے آگے ٹارچ بردار راستہ دکھاتا چل رہا تھا۔

نبیل نے خنجر کو دوبارہ اس پوزیشن میں لگا لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر اُسے آسانی سے نکال کر استعمال کر سکے اور اب وہ شکار کے لئے بے قرار چیتے کی طرح اپنے پنجوں کے بل پر اُن تینوں کے تعاقب میں باہر نکلا تھا۔ بمشکل دو منٹ میں وہ بندوق بردار کے سر پر موجود تھا۔ ٹارچ بردار اُن کے آگے گالیاں بکتا اپنی دھن میں مگن چلا جا رہا تھا۔ بندوق بردار کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اُس کے ساتھ کیا قیامت گزرنے والی ہے۔

نبیل نے اچانک ہی اُس کے عقب سے اُسے اس طرح جکڑا تھا کہ بے بس پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا نبیل کا ایک ہاتھ سختی سے اُس کے منہ پر جما تھا دوسرے ہاتھ سے اُس نے حملہ آور کے سر کی وہ نس دبا رکھی تھی جس نے اُس کے اوسان خطا کر دیئے تھے اور اب اُس کا اعصابی نظام بگڑنے لگا تھا۔

بندوق اُس کے ہاتھ سے نکل کر گر پڑی تھی جسے کامنی نے پھرتی سے قابو کر لیا تھا۔ جب تک ٹارچ بردار اُن کی طرف مڑتا کامنی نے بندوق کی نالی کو ڈنڈے کی طرح پکڑتے ہوئے گھما کر بٹ اُس کے سر پر مارا اُس کے ساتھ ہی اُس کے جسم پر وار کرنے لگی چند سیکنڈ کے اندر وہ بھی حواس باختہ ہو کر گر پڑا۔

کامنی نے سب سے پہلے اُن کے قبضے میں آیا اپنا پستول واپس لیا اور نبیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پستول کو فائرنگ پوزیشن میں لے آئی ”کیا کر رہی ہو تم؟“..... نبیل نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”ان حرامیوں کو نرک ”جہنم) میں پہنچا رہی ہوں“.....

کامنی نے اطمینان سے جواب دیا۔

”خبردار کامنی اس کا تصور بھی نہ کرنا۔ گولیوں کی آواز سے سارا جنگل گونج اُٹھے گا اور اس کے ساتھی ہمیں گھیر کر مار ڈالیں گے“..... نبیل نے اُسے صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا تو کامنی کچھ نارمل ہو گئی۔

”کیا کریں ان حرام خوروں کا“..... کامنی نے اگلا سوال کیا۔

دونوں بے سدھ زمین پر گرے تھے۔ نبیل نے ایک نظر اُن پر ڈالی۔

”ان کا بندوبست میں کرتا ہوں“.....

یہ کہتے ہوئے نبیل نے اُن کے سروں پر بندھی پگڑیاں الگ کیں اور کامنی کی مدد سے اگلے دو تین منٹ میں انہوں نے دونوں کے ہاتھ اور پاؤں اس طرح کس کر باندھ دیے کہ اُن کے لئے اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ آخر میں اُس نے دونوں کے منہ بھی باندھ دیے جس سے اُن کی آواز نکلنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

”ان کو ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہوش آئے گا جس کے بعد ہی کچھ کریں گے۔ تب تک اُمید ہے ہم ان کی گرفت سے نکل چکے ہوں گے“..... اس نے فاتحانہ انداز میں دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ویل ڈن..... آج تو واقعی تم نے مجھے نئی زندگی دی ہے منجیت سنگھ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھلا پاؤں گی“..... کامنی نے اُس کی طرف پر تشکر نظروں سے دیکھتے ہوئے۔

”نو پرابلم..... “ نبیل نے کندھے اُچکائے۔

”پڑھے لکھے لگتے ہو“..... کامنی نے اچانک ہی کہہ دیا

”بس پتا جی کی ضد پر گریجوایشن کر لی تھی..... اور کیا پڑھنا لکھنا۔ کام تو ہم نے یہی کرنا تھا..... مجھے تو آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ پتا جی نے اتنا پڑھایا کیوں تھا..... وہ بھی انگریزی میں.....“ نبیل نے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

”آ جائے گی..... جلدی سمجھ آ جائے گی..... چلو اب نکلیں یہاں سے“..... کامنی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کامنی نے اپنا پستول اُٹھا لیا تھا جبکہ ٹارچ نبیل نے پکڑ لی تھی۔ نبیل نے بندوق کو اس طرح توڑا تھا کہ اب وہ کسی قابل نہیں رہ گئی تھی..... ٹوٹی ہوئی ناکارہ بندوق انہوں نے کچھ فاصلے پر پھینک دی تھی۔ اب وہ کامنی کی ہدایات کے مطابق سفر کر رہا تھا..... وہ جانتا تھا کہ کامنی کم از کم اس جنگل کا اس سے زیادہ شعور رکھتی ہے۔

دونوں کو اس تلخ سچائی کا شدت سے ادراک تھا کہ جنگل میں پھلوا کے آدمی موجود ہیں جو انہیں بہر صورت مار ڈالیں گے۔ نبیل دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ تو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا ہے۔ اللہ اللہ کر کے بھارتی پولیس سے چھٹکارہ ملا تھا اب ڈاکوؤں کے گھیرے میں آ گیا تھا۔ ابھی آگے نجانے کیا کچھ دیکھنا باقی ہے۔ کوئی نادیدہ قوت اُسے یہ ضرور بتا رہی تھی کہ اُس کی ماں کی دعائیں دشمن اور اُس کے درمیان ڈھال بنی ہوئی ہیں اور وہ ضرور ایک دن اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گا۔ نجانے گاؤں میں کیا چل رہا ہوگا؟

اُن کے دشمن زخم خوردہ سانپ کی طرح تلملا رہے ہوں گے۔ اگر اس کی گرفتاری کی خبر اُس کی ماں تک پہنچ گئی تو اُس کا کیا حال ہوگا؟

”کیا سوچ رہے ہو“؟

اچانک ہی اُس کے ساتھ چلتی کامنی نے سرگوشی کی۔

"کچھ نہیں......" نبیل نے اُسے ٹرخانا چاہا۔

"بتانا نہیں چاہتے کیا؟...... ٹھیک ہے...... کوئی مسئلہ نہیں"...... کامنی نے کہا۔

"نہیں ایسی بتانے والی کوئی بات ہے ہی نہیں...... سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ان کے چنگل سے کیسے نکالوں...... افسوس مجھے اس علاقے کی کچھ خبر نہیں۔"

نبیل نے اپنی بے بسی ظاہر کی۔

"منجیت سنگھ تم نے میری جان بچا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اُس کا بدلہ تو میں شاید ساری عمر نہ اُتار سکوں لیکن تمہیں یہ یقین ضرور دلاتی ہوں کہ پہلے میں مروں گی اس کے بعد ہی تم پر کوئی آنچ آئے گی"...... کامنی نے مصمم ارادے سے کہا۔

"کامنی پلیز ایسی باتیں نہ کرو...... ہمارا زیادہ باتیں کرنا بھی میرے خیال سے مناسب نہیں"...... اُس نے کامنی سے کہا۔

نبیل نہیں چاہتا تھا کہ کامنی سے اس موضوع پر بات کرے اس نے چاندنی کی روشنی میں پہلی مرتبہ جنگل میں کامنی کو دیکھا تھا اور کامنی کا سراپا اُس کی آنکھوں کے راستے اُس کے دل میں اُترنے لگا تھا وہ خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔ آج تک اُس نے کسی عورت کے متعلق اس انداز سے سوچا ہی نہیں تھا۔ اُس کی زندگی میں بہت خوبصورت عورتیں آئی تھیں لیکن ایک جرائم پیشہ لڑکی جس نے اپنی زندگی کے چار سال پھلوا ڈاکو کے گروہ میں گزارے ہوں اور جو اپنے سابقہ خاوند کو قتل کرنے کے بعد ڈاکوؤں کے چنگل سے نکل کر اس تک پہنچی ہو وہ عورت اُسے اس طرح متاثر کرے گی اس کا اندازہ اُسے نہیں تھا۔

"بور ہو گئے کیا...... گانا سناؤں"...... کامنی نے اچانک اتنی بے ساختگی سے کہا تھا کہ وہ بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگا۔

"شکر ہے بھگوان کا تم نارمل تو ہوئے"...... کامنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اُس لمحے کامنی اُسے کالج کی کوئی ایسی منچلی طالبہ دکھائی دے رہی تھی جو اپنے پروفیسرز کو زچ کرنے میں شہرت رکھتی ہو۔ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے چلتے چلے جا رہے تھے۔

انہیں چلتے ہوئے کافی دیر ہو رہی تھی اور کامنی نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اب کم از کم پھلوا کے ہاتھوں سے نکل آئے ہیں اس کے بعد کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

"نجانے اُن دونوں پر کیا گزری ہوگی؟" نبیل کو اچانک ہی دونوں ڈاکو یاد آ گئے۔

"پھلوا اُن کے جسموں کے ٹکڑے کر کے جانوروں کو کھلا دے گی۔ تم اُس کی بربریت کا اندازہ نہیں کر سکتے"...... کامنی نے بتایا۔

"چلو اچھا ہوا۔ تم اپنے ہاتھ خون میں رنگنے سے بچ گئی۔ مرنا تو انہیں تھا ہی...... تمہارے ہاتھوں کیوں؟"...... نبیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ"...... کامنی طنزیہ انداز میں مسکرائی...... میرے ہاتھ پہلے ہی خون میں رنگے ہیں منجیت...... اس سے کیا فرق پڑے گا۔ ایک خون یا سچاس خون"......

سورج شاید نکلنے کی تیاریاں کر رہا تھا کیونکہ اندھیرے پر اب سرخی غالب آ رہی تھی۔ اچانک ہی کامنی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا شاید وہ اُسے کچھ دکھانا چاہتی تھی۔

(اس سنسنی خیز داستان کی اگلی قسط شمارہ جولائی میں ملاحظہ فرمائیں)

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہوکر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ ملک نبیل کی تفتیش ہوتی ہے دہشت گردی کا الزام لگتا ہے لیکن ثابت نہیں ہوتا جس پر انڈین انٹیلی جنس اُسے پاکستان کے خلاف بطور پراپیگنڈا استعمال کرتی ہے اور عالمی پریس کے سامنے اُسے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں یہ خبر نبیل کے کزن ملک ناصر کو پاکستان انٹیلی جنس کے ذریعے ملتی ہے۔ ملک ناصر سے پاکستان انٹیلی جنس رابطہ کرتی ہے وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اُس کا بھائی کوئی دہشت گرد یا جرائم پیشہ نہیں گردش حالات نے اُسے وہاں پہنچادیا ہے۔ انٹیلی جنس والے اُس کی بات مان لیتے ہیں۔ انسانی سمگلر سلطان خان کو لانچ تباہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہے۔ نبیل کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور اب پولیس اس کا چالان دلی کی تہاڑ جیل کے لیے لے جارہی ہے، ملک نبیل حوالدار عجائب سنگھ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے۔ ٹرین پہاڑی اور جنگلی علاقے میں جارہی تھی جب اچانک ایک زوردار دھماکے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹرین پر علیحدگی پسندوں نے اس میں فوجیوں کی موجودگی کی اطلاع پاکر حملہ کیا تھا۔ سینکڑوں لوگ زخمی اور درجنوں مارے گئے عجائب سنگھ کی ٹانگ ٹوٹ گئی جسے ملک نبیل نے بڑی ہمت سے ڈبے سے باہر نکالا اور اُس کی ٹانگ کو پگڑی سے باندھ کر قدرے پرسکون کرنے کے بعد ایک محفوظ جگہ بٹھادیا۔ عجائب سنگھ نے اُسے کہا کہ اس کی جیب میں موجود چابی سے ہتھکڑی کھولے اور چابی رکھ کر بھاگ جائے اس طرح کسی کو اُس پر شک نہیں ہوگا۔ ملک نبیل نے شکریہ ادا کیا اور سامنے جنگل میں فرار ہوگیا۔ نبیل کسی نہ کسی طرح جنگل میں ایک ٹھکانہ چھپنے کے لئے ڈھونڈ چکا ہے اور اب وہ تھکا ہارا سورہا ہے جب اچانک اُس کی آنکھ شور کی آواز سے کھلتی ہے۔ اور کامنی جو پھلوا دیوی کے گروہ سے جان بچا کر بھاگی ہے نبیل سے ٹکرا جاتی ہے۔ پھلوا کے ساتھی اُس کے تعاقب میں ہیں دونوں مل کر جنگل سے نکلنے کا منصوبہ بناتے ہیں اور مختلف رکاوٹوں کو عبور کرتے ایک محفوظ جگہ پہنچتے ہیں۔ کامنی اُسے سامنے کا منظر دکھارہی ہے۔ (اب آگے پڑھیے)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 7

’’کیا‘‘؟ اس نے چونک کر سامنے کی طرف دیکھا۔ سامنے کا منظر سورج کی کرنوں سے اب نمایاں ہونے لگا

تھا اور نبیل کو اس جنگل کے درمیان اس میدانی علاقے میں جھونپڑیوں کی ایک بستی دکھائی دے رہی تھی۔ دو تین جگہ سے دھواں اٹھ رہا تھا جس کا مطلب یہی تھا کہ یہ جھونپڑیاں آباد ہیں۔

''یہ بھیلوں کی بستی ہے جنگلی لوگ ہیں لیکن حکومت کی ان تک رسائی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان کی چھلوا ڈاکو سے دشمنی چل رہی ہے اور ہمیں یہاں پناہ مل سکتی ہے۔ چھلوا ان سے ٹکرانے سے پہلے بہت کچھ سوچے گی۔ اگر وہ ہمارے تعاقب میں یہاں تک آ ہی گئی تو......''

کامنی نے سرگوشی کے انداز میں بتایا:

''کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا چھلوا ہمارا پیچھا کر رہی ہے''......

نبیل نے قدرے حیرانگی سے دریافت کیا۔

''منجیت تم چھلوا کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ بہت اذیت پسند ہے اس نے اس علاقے کو پولیس اور دوسری ایجنسیوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا ہوا ہے۔ اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لئے وہ اپنا سارا گروہ بھی قربان کر سکتی ہے''۔

کامنی نے چھلوا کے متعلق بتایا تو نبیل سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچنے لگے ہو؟''......

''فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ ہم ان لوگوں کی پناہ لیں یا اپنا راستہ ناپیں...... تمہارا کیا خیال ہے''...... نبیل نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میرے خیال سے......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی شاید کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ ''تم ہی کچھ بتاؤ''......؟

''اگر میری بات مانو تو ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔ میرا مطلب ہے اگر ابھی تک وہ ہم تک نہیں پہنچ سکی تو ممکن ہے ہم اس کی گرفت سے نکل جائیں۔ ایک مرتبہ ہم جنگل سے نکل کر محفوظ علاقے میں پہنچ جائیں تو بہت کچھ ممکن ہے؟

نبیل نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''ٹھیک ہے۔ ہم نے لمبا راستہ اختیار کیا ہے لیکن یہ محفوظ راستہ ہے میں نے تین چار سال اس جنگل میں گزارے ہیں اور درجنوں مرتبہ یہاں سے اندر باہر آ گئی ہوں...... کامنی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''چلو پھر...... یہاں رکنا مناسب نہیں''...... نبیل نے کہا

''چلو''......

دونوں پھر چل دیئے۔ کامنی حسب معمول اس کے آگے آگے چل رہی تھی اور وہ کامنی کے تعاقب میں اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ پستول کامنی نے اسے دینا چاہتا تھا لیکن نبیل نے اسے اپنے پاس موجود خنجر دکھا کر اس سے انکار کر دیا۔ اسے اعتماد تھا کہ یہ ہی زیادہ بہتر ہتھیار ہے۔ نجانے کیوں اسے کامنی کا بڑا سا پستول بھی اپنے ملک کے درے کے پستول جیسا دکھائی دے رہا تھا جو فائر کرنے والے سے زیادہ اپنی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔

نبیل نے محسوس کیا تھا کہ ساری رات مسلسل چلنے سے اب کامنی بھوک اور تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ چونکہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا اس لئے ابھی تک اس کے اوسان مکمل بحال تھے البتہ کامنی کی چال میں کچھ لنگراہٹ کا احساس ہونے لگا تھا۔

''میرے خیال سے تھوڑی دیر آرام کر لو...... میں کچھ کھانے کا بندوبست کرتا ہوں''

اس نے کامنی کے کندھے پر اچانک ہاتھ رکھا تو

کامنی چونک پڑی۔

''سوری منجیت میری وجہ سے تم بھی پریشان ہو رہے ہو'' اس کی بات تختی سے کاٹ دی اور آئندہ کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکلنا۔ کامنی ہمارا مرنا جینا ایک ساتھ ہوگا۔ یہ کسی ڈاکو کا نہیں، مرد کا وعدہ ہے۔''

وہ جانتا تھا کامنی کیا کہنے والی ہے لیکن اسے کامنی کی یہ بات کبھی پسند نہ آئی۔

کامنی نے ایک مرتبہ بھرپور انداز سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ نبیل کو کامنی کی آنکھوں میں نمی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کامنی کا بازو پکڑ کر اسے قریباً سہارا دیتے ہوئے آگے بڑھایا اور ایک قدرے ہموار جگہ پر اپنے پاس موجود خنجر کی مدد سے جھاڑیاں کاٹ کر بستر سا بنایا۔ کامنی دلچسپی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہاں لیٹ جاؤ...... میں کچھ بندوبست کرکے آتا ہوں۔ اس نے کامنی سے کہا۔

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں...... فی الوقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو''۔ اس نے کامنی کی بات کاٹی۔

کامنی نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور آلتی پالتی مار کر اس گھاس پھونس کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس نے چاہا کہ اپنا پستول نبیل کو دے دے لیکن نبیل نے انکار کر دیا اور اب وہ پیدل ہی اس بستی کی طرف جا رہا تھا جس کا فاصلہ یہاں سے بمشکل آدھا فرلانگ رہا ہوگا۔ درختوں اور جھاڑیوں کی محفوظ آڑ میں وہ پاؤں سے آواز پیدا کئے بغیر بالآخر بستی کے نزدیک پہنچ گیا جھاڑی کے ایک طرف اس نے چوکنی بلی کی طرح چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور اپنی دانست میں اس طرف آ گیا جو بظاہر سب سے محفوظ تھی۔ اس طرف سامنے کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے سامنے والی جھونپڑی کا فاصلہ اس سے بمشکل پچاس گز رہا ہوگا۔ جھونپڑی کے باہر مرغیاں اور کچھ پالتو جانور گھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ جھاڑیاں اور پھلدار درخت جو شاید یہاں رہنے والوں نے خود لگائے تھے۔ ایک طرف زمین پر سبزیاں اگائی گئی تھیں۔

نبیل نے دھڑکتے دل اور چوکس نظروں سے صورتحال کا بھرپور جائزہ لیا، اپنے پہلو میں جے خنجر کو آہستہ سے تھپتھپایا اور بلی کی طرح پنجوں کے بل چلتا ہوا جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ اسے دیکھ کر کچھ مرغیاں اور جانور ادھر ادھر بدک گئے تھے۔ ان کی آوازوں سے نبیل کی دھڑکنیں ایک مرتبہ پھر سے بے قابو ہو گئی تھیں لیکن اس نے اپنی رفتار کم نہیں ہونے دی، اگلے ہی لمحے وہ جھونپڑی کے دروازے کے سامنے تھا۔ بانس سے بنے اس دروازے کو اس نے اسی طرح آہستگی سے کھولا تھا کہ اچانک اندر موجود کسی شخص سے سامنا بھی ہو تو وہ اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ پیدا کرے۔ اس کی خوش قسمتی کے اندر کوئی نہیں تھا۔ کچی مٹی اور گھاس پھونس کی ملاوٹ سے بنی دیواروں پر کھڑی اس جھونپڑی کی چھت میں بانس اور ترپال کا استعمال کیا گیا تھا جس پر مٹی ڈال کر اسے بارش کے پانی سے مکمل محفوظ بنا دیا گیا تھا۔

اس کے سامنے مختلف قسم کا سامان پڑا تھا۔ ایک کونے میں ایک ہنڈیا اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ نبیل نے ہنڈیا کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو اس میں پکی ہوئی سبزی موجود تھی۔ شاید یہ لوگ ایک ہی وقت سارے دن کا کھانا پکا لیا کرتے تھے۔ نبیل نے ایک کونے میں دھرے حکومتی امدادی اشیائے خورد و نوش کا ایک شاپر اس طرح خالی کیا کہ کسی کو ان کی چوری کا شک نہ گزرے،

اس میں ہنڈیا سے خاصی سبزی ڈالی اور وہیں دھرے سرکاری امداد والے بند اور ڈبل روٹیوں میں سے ایک ڈبل روٹی اور کچھ بند اٹھا کر انہیں محفوظ کر کے واپسی کے لئے مڑا۔

دروازہ اس نے احتیاط بند کر لیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر احتیاط سے اس نے دروازہ کھول کر باہر کی صورت حال کا جائزہ لیا اور اسی طرح پنجوں کے بل قریبا بھاگتا ہوا مرغیوں اور دوسرے جانوروں کے درمیان سے گزر کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

کامنی بے چینی سے اس کی منتظر تھی، وہ نبیل کے ہاتھوں میں پکڑے شاپر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''کسی بازار سے خرید کر لائے ہو کیا؟''...... اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''چرا کر لایا ہوں۔ زندگی کی پہلی چوری اور وہ بھی ''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر خود ہی مسکرا دیا۔

''چلو آج سے تمہارا شمار بھی ہمارے جیسے چور ڈاکوؤں میں ہو جائے گا''...... کامنی نے مسکراہٹ اچھالی۔

پانی کی وہ فوجی قسم کی بوتل جو وہ چھلاوا کے ٹھکانے سے فرار ہوتے ہوئے ساتھ لے آئی تھی ابھی تک آدھی پانی سے بھری ہوئی تھی۔ عام حالت میں شاید نبیل ایسے کھانے کی طرف دیکھنے کا بھی مکلف نہ ہوتا لیکن اس وقت یہ ان دونوں کے لئے من و سلویٰ کے مترادف تھا۔

دونوں نے جی بھر کے کھانا کھایا اور ایک ڈبل روٹی محفوظ کر لی۔

''میرے خیال سے فوراً نکلنا چاہیے''...... کامنی نے کہا۔

''کچھ آرام کر لیتے''...... نبیل نے اس کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔

کامنی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

''مجھے علم ہے نبیل تم بھی میری طرح بہت تھکے ہوئے ہو، لیکن مجبوری ہے۔ یہ لوگ سورج ڈھلنے سے بہت پہلے اپنی بستی میں واپس لوٹ آتے ہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی حکومتی پروگرام ان بستیوں میں چلتا رہتا ہے۔ بہت چالاک لوگ ہیں۔ مجھے علم تو نہیں لیکن اندازہ ضرور ہے کہ تم نے یہ اسباب اٹھانے میں بہت احتیاط کی ہو گی لیکن یہ معمولی مداخلت کا بھی فوراً اندازہ لگا لیتے ہیں۔ نبیل اگر تم مجھے بتاتے کہ تمہارا ارادہ ان کی بستی کی طرف جانے کا ہے تو میں کبھی تمہیں ایسا نہ کرنے دیتی۔ میں بھی سمجھی تھی کہ تم شاید کسی جنگلی پھل کی تلاش میں نکلے ہو......''

''اس جنگل کا سب سے میٹھا اور شاندار پھل تو تم ہو کامنی جو اچانک ہی میری جھولی میں آن گرا ہے...... اور کون سا پھل تلاش کرتا میں''...... اس نے کامنی سے کچھ اس طرح کہا وہ شرمائے بغیر نہ رہ سکی۔

''کبھی کبھی تو مجھے شک ہونے لگتا ہے منجیت کہ تم جو ظاہر کر رہے ہو وہ نہیں ہو......'' کامنی نے اس سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے کامنی...... واقعی کبھی کبھی میں بھی یہی سوچتا ہوں کہ اصل میں کون ہوں میں؟ میری شناخت کیا ہے؟ مجھے لگتا ہے میں زبردستی اس دنیا میں آ گیا ہوں۔ آنا ہی تھا۔ میرا باپ، دادا، بھائی، رشتہ دار سب یہی کرتے تھے۔ تم نہیں جانتی ادھر ہمارے پنجاب میں کسی دشمن دار گھرانے میں جنم لینا بڑا عذاب ہے۔ چاہو نہ چاہو لڑائی کا حصہ بننا ہی پڑتا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کہ اب پنجاب واپس جاؤں گا ہی نہیں...... کسی دوسرے صوبے میں محنت مزدوری کر کے

زندگی بسر کر لوں گا۔ سچی بات ہے مجھ سے اب زیادہ بھاگ دوڑ ہو گی نہیں۔ نہیں چاہیے مجھے عیش و آرام کی زندگی۔ آخر یہ جنگل باسی بھی تو زندہ ہیں۔ کیسی شاندار زندگی ہے ان کی۔ نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ نہ کوئی دشمنی نہ کوئی تھانہ پولیس کامنی تم سے ملنے کے بعد مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تم وہ نہیں ہو جو دکھائی دے رہی ہو......''

اس نے آخری فقرہ کامنی کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ (''میرے خیال سے یہاں سے جلدی دور نکل جانا چاہیے......'' کامنی قدرے سیریس ہو گئی تھی۔ اس نے خود کو آج سے دس سال پہلے والی کالج کی طالبہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا جب وہ اپنی گاڑی چلاتی ہوئی خود کالج جایا کرتی تھی اور کالج کے سارے دل پھینک لڑکے اس کے منتظر ہوا کرتے تھے نجانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب وہ پرکاش سے ٹکرائی اور قعر مذلت میں گرتی ہی چلی گئی۔

○

دونوں ایک مرتبہ پھر عازم سفر تھے......!

ماحول خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ دونوں ہی کچھ دیر خاموش رہے۔ بالآخر نبیل نے ہی خاموشی کو توڑا۔

''میری کسی بات کا برا تو نہیں منایا کامنی؟''...... اس نے چلتے چلتے دریافت کیا۔

''کیا...... کیا کہہ رہے ہو۔ بھلا میں تمہاری بات کا برا کیوں مناؤں گی اور تم نے ایسی کون سی بات کی ہے تم نے تو......!!! اس کی آواز بھرا گئی اور نبیل سمجھ گیا کہ اس نے نادانستگی میں کامنی کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہے۔

وہ کچھ شرمندگی سی محسوس کرنے لگا تھا۔

''سوری کامنی...... اگر میری کسی بات سے......''

''نبیل منجیت پلیز...... ایسی بات مت کرو''...... اس نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو روکتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی زوردار گڑگڑاہٹ نے انہیں چونکا دیا......

''بادل گرج رہے ہیں...... یہاں موسم کے تیور اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔ اچانک ہی بارش ہونے لگتی ہے......'' کامنی نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''میرے خیال سے کوئی محفوظ کونہ ڈھونڈ لیں......'' نبیل نے رائے دی۔

''ہاں کسی بھی لمحے طوفانی بارش شروع ہو سکتی ہے''۔

کامنی کی بات ابھی بمشکل پوری ہوئی تھی جب اچانک درختوں پر پڑنے والے بارش کے قطروں نے سارے جنگل میں شور پیدا کر دیا، دونوں قریبا بھاگتے ہوئے درختوں کے ایک جھرمٹ میں پہنچے تھے اور وہاں ایک بڑے درخت کے تنے سے لگ کر بیٹھ گئے۔

جنگلی بارش کا تجربہ نبیل کے لئے زندگی کا عجیب و غریب تجربہ تھا۔ زناٹے دار ہواؤں کی بوچھاڑ بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار بارش نے اسے اپنے گاؤں کا ساون بھادوں یاد دلا دیا اور دوسرے ہی لمحے وہ اپنے گاؤں میں تھا۔ جہاں اس کی ماں جائے نماز پر بیٹھی اس کی کامیاب واپسی کے لئے دعا گو تھی۔ اس کے بھائی اس کے لئے پریشان تھے۔ نجانے ان کے دشمنوں نے کیا گل کھلائے ہوں گے۔ وہ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لے کر فرار ہوا تھا گو کہ مخالفین کا سردار مارا گیا تھا لیکن اس کے بیٹے بھی باپ سے کچھ کم نہیں تھے۔ نبیل کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آخری جھڑپ میں اس

نے جس طرح اپنے مخالفین کی کمر توڑی تھی اب انہیں سنبھلنے میں ایک دو سال لگیں گے لیکن یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ غصے اور جذبات سے بے قابو ہو کر فوراً بدلہ لینے کی ٹھان لیں..... اس کے ساتھ ہی دوسرا خیال اسے بے چین کر دیتا۔

اس کے بھائیوں خاص کر ملک کے ہوتے اسے کسی اور بات کی فکر نہیں تھیں کیونکہ نبیل اس کی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ بھی اس کے چچا کی طرح بہت ہوشیار اور بہادر تھا اور کوئی بھی معاملہ کرنے سے پہلے اس کے نتائج کا مکمل تجزیہ کرنے کا قائل..... اللہ کرے اس کی ماں کو اس کے بھارت میں گرفتار ہونے کی خبر نہ ملی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی، لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ اچانک ہی دوسرا خیال اسے پریشان کر دیتا، ماں کا دل ہی ایسا ہوتا ہے کہ اسے بعض ایسی باتوں کا بھی اولاد سے متعلق علم ہو جاتا ہے جو بظاہر بہت پوشیدہ ہوتی ہیں۔

اسے اپنی بہنوں کی طرف سے بہرحال اطمینان تھا۔ ان کے دشمن بھی ان کی طرح کم ظرف نہیں تھے۔ دونوں کے درمیان شاید ایک خاموش معاہدہ موجود تھا کہ وہ ایک دوسرے کی خواتین کا احترام کریں گے کیونکہ دونوں کو ہی متعدد مرتبہ ایک دوسرے کی خواتین کو نقصان پہنچانے کے مواقع ملے تھے لیکن دونوں نے ہی اس سے احتراز برتا تھا اور آج تک اس پر کاربند تھے۔ اسے یاد تھا کہ ملک بوٹی کے سالے کو اس کے چچا نے اس لئے معاف کر دیا تھا کہ اس کے ساتھ اس کے بیوی بچے گاڑی میں موجود تھے اور دوسری طرف سے بھی ایسا ہی مظاہرہ دیکھنے میں آتا تھا۔

اس کے خیالات کا سلسلہ کامنی نے توڑا جب اس نے اپنے پاس موجود ایک بڑی سی چادر کھول کر آدھی نبیل اور آدھی خود پر ڈال لی تھی، اسے احساس ہوا کہ بارش کے اکا دکا قطرے درختوں کے گھنے پتوں سے چھن کر اس کے سر پر گر رہے تھے لیکن اسے اس کا قطعاً احساس نہیں تھا۔

"یہ تم اچانک کہاں کھو جاتے ہو"؟

کامنی نے اس کے کندھے کو قریباً جھنجوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سوری! میں اپنے گھر پہنچ گیا تھا"..... بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"لیکن تم تو....."

"ہاں"..... اس نے کامنی کی بات کاٹ دی..... "میں نے ساری صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد سوچا کہ پولیس یا اپنے دشمنوں کی کسی اندھی گولی سے مرنے کی بجائے مجھے اب اپنی زندگی اکیلے ہی بسر کرنی چاہیے"..... کسی نئی شناخت اور نئے ٹھکانے کے ساتھ".....

"ایسا کر پاؤ گے تم منجیت؟ جانتے ہو اکیلے جینا کتنا مشکل ہے"؟ کامنی نے اس کی طرف گردن گھمائی۔

"لیکن اکیلے کیوں؟ تم ہو ناں کامنی"..... اس نے پوری گردن گھما کر کامنی کی آنکھوں میں جھانکا۔

اچانک بادل اتنی زور سے گرجا کہ کامنی بے قابو ہو کر اس سے آن لگی۔ دوسرے ہی لمحے دونوں نے خود کو سنبھال لیا۔ دونوں پر کچھ لمحوں کے لئے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ بالآخر نبیل نے ہی ہمت کی۔

"ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے..... جتنی جلدی ممکن ہو".....

"ہاں منجیت لیکن اس جنگل کا یہی بھید ہے کہ یہاں آنے کے راستے تو بہت ہیں نکلنے کے بہت کم۔ میں نے بھی بدقسمتی سے اپنی سمت بھلا دی ہے اور اگلا سارا سفر ہم اندازے سے ہی طے کریں گے دراصل بھلوا کی طرف سے مجھے کبھی خوش فہمی تو نہیں رہی لیکن اس کی امید نہیں تھی کہ وہ بھیلوں کے علاقے تک میرا تعاقب کرے گی۔ دراصل انتقام اس کی کمزوری ہے"۔

"کسی روز وہ اسی انتقام کے چکر میں ماری جائے گی"..... نبیل نے اس کی بات کاٹی "میں نے اس انتقام کی آگ میں اپنی آدھی نسل جلا دی ہے کامنی۔ یہ انسان کو پاگل کر کے مار دیتا ہے۔ اس سے بڑی بیماری اور کوئی نہیں ہو سکتی"؟

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو..... مجھے تو آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی منجیت کہ میں یہاں کیسے آ گئی۔ میں نے تو کبھی زندگی میں اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تو ایک سیدھے سادے سرکاری ملازم کی بیٹی ہوں منجیت....." اس کی آواز بدل رہی تھی۔

"ٹھیک کہتی ہو تم کامنی..... مجھے اس کا اندازہ ہے۔ صرف پانچ سال میں زندگی کا چلن نہیں بدلتا۔ انسان اپنی جڑوں سے کٹ کر کچھ عرصہ ہی زندہ رہ سکتا ہے، مجھے احساس ہے تمہارے دل پر بوجھ ہے اگر مجھ پر اعتبار کر سکتی ہو تو دل کا غبار دھو ڈالو۔ ورنہ یہ روگ بن کر تمہاری جان لے لے گا۔ مجھے بتاؤ کامنی کون ہو تم؟ کیسے آ گئی بھلوا ڈاکو کے گروہ میں؟....."

اس نے کامنی کی آنکھوں میں جھانکا جہاں حیرت انگیز طور پر ایک معصومیت اسے دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں منجیت! صحیح کہا تم نے۔ اب مجھے اس بوجھ سے نجات حاصل کر لی لینی چاہیے....." کامنی کی آواز کسی دور کی وادی سے آ رہی تھی..... منجیت میرا تعلق ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ میرے والد سرکاری آفیسر ہیں۔ بھائی فوج میں میجر تھے۔ ہم دو بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ باقی سب ان دنوں پڑھ رہے تھے مجھے خبر نہیں اب وہ کیا کر رہے ہیں..... اس نے لمبی سانس لی۔

"میں نے گریجویشن کر لی تھی اور اب ماسٹر کی سٹوڈنٹ تھی۔ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہونے کے ناطے میرا رہن سہن بھی بہت اچھا تھا۔ بابو جی کو مجھ سے بہت محبت تھی، انہوں نے مجھے گریجویشن کے بعد کالج جانے کے لئے کار لے کر دی تھی۔ میرے کالج میں بہت چرچے تھے، بڑے بڑے گھرانوں کے رشتے میرے لئے آیا کرتے تھے لیکن بھگوان جانے کس جنم کے گناہوں کی سزا ملی ہے کہ پرکاش میری زندگی میں آ گیا، پرکاش سے میری ملاقات ایک سینما ہاؤس کے باہر ہوئی تھی جہاں میں اور میری دوست فلم دیکھنے کے بعد باہر نکل رہے تھے تو ایک لڑکا میرا بیگ چھین کر بھاگا، پرکاش نے اسے پکڑا اور فلمی انداز میں میرا بیگ مجھے واپس لوٹایا۔ آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ سارا پہلے سے تیار کردہ ڈرامہ تھا، ایسے کئی سین میں نے فلموں میں دیکھے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے اس لمحے پرکاش کسی فلمی ہیرو کی طرح پسند آ گیا۔

یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی جس کے بعد وہ کچھ دنوں کے وقفے سے مجھے ایک شاپنگ مال پر ٹکرا گیا جہاں ہم نے اکٹھے کافی پی جس کے بعد ہمارے تعلقات باقاعدہ قائم ہو گئے۔ بھگوان جانے اس نے مجھ پر کیا جادو پھونکا تھا کہ میں نے جذبات میں اندھے ہو کر اس سے جسمانی تعلق قائم کر لیا.....!

پرکاش نے اپنا تعارف ایک بڑے بزنس مین کے بیٹے کی حیثیت سے کروایا تھا اس نے کمال ہوشیاری سے مجھے اُلو بنائے رکھا اور اس کا گناہ میرے پیٹ میں پلتا رہا، روایتی فلمی کہانی کی طرح اس کے گھر والوں نے مجھے بہو ماننے سے اس کے کہنے کے مطابق انکار کر دیا۔ اپنے

گھر والوں کو میں منہ دکھانے کی لائق رہی نہیں تھی۔ خود کشی کرنے کی ہمت نہیں تھی مجھ میں بالآخر مجھے پرکاش کا فیصلہ ماننا پڑا۔

یہ میرا عشق تھا، بے بسی تھی، پاگل پن، خوف یا پھر اس کی بلیک میلنگ۔ جس نے میری عقل پر مکمل پردہ ڈال دیا، میں نے اس کی باتوں پر ایسے عمل کیا جیسے ہم بھگوان کے لئے کرتے ہیں۔ میری بے وقوفی کا اندازہ لگاؤ کہ میں نے گھر سے بھاگنے سے پہلے نہ صرف گھر میں نقب لگائی بلکہ اپنی گاڑی بھی اونے پونے فروخت کرکے اس کے ساتھ فرار ہوگئی۔

پرکاش نے سب سے پہلے مجھے اپنے گناہ کے بوجھ سے آزاد کروایا، یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر ہوا لیکن میں مجبور تھی کہ اس کا فیصلہ تسلیم کرتی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے کسی رشتہ دار کے گھر لے گیا جہاں میرا علاج وغیرہ کروا کر مجھے مکمل صحت یاب کروایا۔ یہاں بڑے عجیب و غریب لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا لیکن میں پرکاش کے جھوٹے پریم میں اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ اس طرف کبھی میرا دھیان ہی نہ گیا۔

اس دوران بڑے غیر محسوس انداز میں مجھے ادویات میں نشہ آور چیزیں دی جانے لگیں اور ایک روز وہ بھی آ گیا جب مجھے پرکاش کے بضد ہونے پر مجھے شراب پینی پڑی اور یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔

ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ پرکاش دراصل ایک جرائم پیشہ گروہ کا رکن ہے یہ لوگ بڑے شہروں میں باقاعدہ سائنٹیفک طریقے سے نقب زنی کی وارداتیں کرتے تھے۔ اب یہ ہوا کہ ہم آگے آگے تھے اور پولیس پیچھے پیچھے اور اس بھاگ دوڑ کا اختتام بالآخر پھلادا کے گروہ پر ہوا۔ ممکن ہے یہاں بھی میں ایسے ہی بے غیرت بنی رہتی لیکن ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ پرکاش کے تو پھلوا سے ناجائز تعلقات ہیں جس پر بھگوان جانے کیسے میری انتقام کی حس جاگی۔ اس دوران میں نے جی جان سے اسلحہ چلانے کی تربیت لی۔ مجرمانہ سرگرمیوں میں حصہ لیا اور اس حرامی کو قتل کرکے بھاگ آئی۔

اپنی کہانی مکمل کرکے اس نے نظریں جھکا لیں۔

نبیل نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا، بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا بالآخر بارش بند ہوگئی۔ اب تک دونوں خاموش تھے۔

بالآخر نبیل نے ہی اس خاموشی کا جمود توڑا۔

''کامنی! شاید تمہیں میری بات عجیب لگے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے پاس ابھی تک زندگی کی طرف واپس لوٹ جانے کی چوائس موجود ہے''۔

''کیا کہہ رہے ہو منجیت؟''......اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''میرا مطلب تھا اس مجرمانہ زندگی سے......''

منجیت کو سمجھ نہیں آ رہی تھی، اسے اپنی بات کیسے سمجھائے۔

''میں نے اس زندگی کو کبھی اپنی مرضی سے نہیں اپنایا منجیت۔ میں ایک بزدل لڑکی تھی۔ مجھے بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا لیکن نجانے کیوں اب تک......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر منجیت کی طرف دیکھنے لگی۔

''مایوسی کی باتیں نہ کرو کامنی......حالات پر انسان کا نہیں بھگوان کا اختیار ہے۔ ہماری حیثیت دنیا کے اس میلے میں ایک تماشائی سے زیادہ کچھ نہیں جسے کسی وقت بھی تماشا بنایا جا سکتا ہے۔ چلو اب یہاں سے نکلیں......زیادہ دیر رُکنا مناسب نہیں......''

اس نے کامنی کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ نیم گیلی چادر کو نبیل نے نچوڑ کر کامنی پر ڈال دیا تھا اور اب دونوں آگے کی سمت چل رہے تھے۔ کامنی نے ایک جگہ رُک کر چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور پھر اچانک ہی کسی دائیں طرف گھوم گئی۔ ''میں نے اندازے سے یہ سمت اپنائی ہے۔ اس طرف جنگل میں زیادہ آبادیاں بنی ہوئی ہیں اور سرکاری محکموں کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔ اس طرف ضرور کوئی راستہ باہر نکلنے کے لئے بنایا گیا ہوگا۔ بھگوان سے پرارتھنا (دعا) کرنا کہ ہم صحیح راستے پر چلیں''......

اس نے نبیل کی طرف دیکھا۔

''او۔کے''......نبیل نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹارچ تھام کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں قریباً ڈھائی تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ اس دوران انہیں بارش سے بھیگی جھاڑیوں اور درختوں سے نجات مل چکی تھی۔ یہاں کا موسم بھی عجیب تھا کہیں بارش اور کہیں بھرپور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کامنی نے اسے بتایا تھا کہ جن علاقوں میں حکومت کے پروگرام چل رہے ہیں وہ قدرے محفوظ علاقے ہوتے ہیں لیکن اس جنگل میں مکمل علاقے کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ کسی بھی وقت یہاں علیحدگی پسندوں کا کوئی گروپ آ کر اپنی عدالت لگا لیتا ہے۔ یہاں کے باسی بھی دونوں سے بنا کر رکھتے ہیں۔ سرکار سے ان کی دوستی صرف مفت مدد حاصل کرنے کے لئے ہوئی ہے اور حکومت کی صرف زبانی کلامی ہی حمایت کرتے ہیں ان کی دلی ہمدردیاں علیحدگی پسندوں کے ساتھ ہیں۔

نبیل نے اپنے ملک میں ایسی خبریں تو اخبارات میں پڑھی تھیں کہ بھارت میں ایسی علیحدگی پسندوں کی تحریکیں چل رہی ہیں لیکن ان کی شدت کا اندازہ اسے یہاں آ کر ہی ہوا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ آخر اس ملک کو کس قوت نے متحد کیا ہوا ہے یہاں تو کوئی ایک دوسرے کا وجود تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

اپنے ملک میں اسے یہ سب خبریں صرف پراپیگنڈہ دکھائی دیتی تھیں لیکن یہاں آ کر اس کے خیالات بدل گئے تھے۔

دونوں اب قدرے میدانی علاقے میں آ گئے تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔ کامنی نے اسے بتایا تھا کہ جب اس طرح کے کم درختوں اور جھاڑیوں والے حصے دکھائی دینے لگیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ سڑک یا گاؤں نزدیک ہی ہے۔ خیریت گزری کہ وہ ابھی تک کسی ناگہانی آفت سے محفوظ تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب سے سات آٹھ گھنٹے پہلے نبیل نے جو واردات کی تھی اس کا اندازہ یا علم بستی والوں کو نہیں ہو سکا تھا، یوں بھی اب وہ اس علاقے سے خاصے دور آ گئے تھے۔ ایک بات تو طے تھی کہ اب وہ پھلواڑا کو کی دسترس سے نکل آئے تھے کیونکہ وہ بھی ایسے علاقے کے نزدیک نہیں پھٹکتی تھی جہاں آبادی یا پولیس کی موجودگی کا گمان گزرے۔ کامنی نے اسے بتایا تھا کہ پھلوا کو بھی اس جنگل میں اپنا ٹھکانہ محفوظ رکھنے کے لئے علیحدگی پسندوں کو بھتہ دینا پڑتا ہے۔ وہ انہیں ''ماؤسٹ'' کے نام سے جانتی تھی اور اس کا دعویٰ تھا کہ ان کی تحریک یہاں سے کم از کم پچیس اضلاع میں بہت مضبوط ہے جہاں صرف ان کا حکم چلتا ہے پولیس کا نہیں چلتا۔

یہ سب بہرحال خوش آئند باتیں تھیں لیکن فی الوقت نبیل کا مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ وہ کامنی کے لئے جو جذبات محسوس کر رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں محبت کا نام دے یا ہمدردی کا۔ ظاہر ہے وہ اس ملک کا شہری نہیں تھا اور اسے جلد یا بدیر یہاں سے نکلنا ہی تھا۔ وہ اپنی دانست میں اپنی جان بچانے کے لئے کسی غیر ملک میں آباد ہونے جا رہا تھا لیکن اب اسے احساس اور اندازہ ہوا تھا کہ وہ اپنے ملک کے علاوہ اور کہیں محفوظ نہیں۔

جن حالات سے وہ گزشتہ تین چار ماہ سے گزر رہا تھا ان کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اپنے وطن پہنچتے ہی اس دشمنی کے خاتمے کی ہر ممکن کوشش کرے گا، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ یہ دشمنی اس کے باپ اور بھائی کو نگل گئی تھی اور آگے نجانے یہ سلسلہ کہاں تک جاری رہتا۔

شام گہری ہو رہی تھی......!۔

"یہاں رات گزار لیں"؟ اس نے اچانک ہی کامنی سے دریافت کیا تھا۔

"کیا بات ہے تھک گئے ہو کیا"؟......کامنی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی جامنی رنگت میں سب سے نمایاں اور خوبصورت اس کے سفید موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے دانت تھے جو اس کی مسکراہٹ کو چار چاند لگا دیتے تھے۔

نبیل نے اب تک کئی مرتبہ سوچا تھا۔ سانولی رنگت اور جان لیوا مسکراہٹ کی حامل گہری کالی آنکھوں والی یہ لڑکی اس کی زندگی میں کیسے آ گئی؟ بسا اوقات اسے یہ سب کچھ بہت عجیب محسوس ہوتا تھا لیکن یہ سب امر واقعہ تھا اور زندگی کا حصہ۔

"نہیں......ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آگے شاید کوئی محفوظ جگہ نہ مل سکے"۔

نبیل نے خیال ظاہر کیا۔

"ہم اب کسی بستی کے نزدیک پہنچ کر ہی ٹھکانہ کریں گے۔ تاکہ صبح ہوتے ہی وہاں سے آگے نکل جائیں۔ بستی کے قریب کا علاقہ عموماً محفوظ ہوتا ہے"۔ کامنی نے بتایا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی"......نبیل نے کہا۔

دونوں پھر چلنے لگے۔ ابھی انہیں بمشکل پانچ سات منٹ ہی ہوئے تھے، جب کامنی ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے اشارے سے نبیل کو وہاں بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔

"خیریت"......نبیل نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آگے 'بھجن کیرتن' ہو رہا ہے، جس کا مطلب ہے ہم بستی کے نزدیک پہنچ گئے ہیں۔ یہ لوگ خصوصی تہواروں پر ہی اس طرح کے کیرتن کرتے ہیں۔ اس روز یہاں شراب نوشی اور ناچ گانا ہوتا ہے اور ضرور کوئی نہ کوئی سرکاری مہمان بھی بلایا جاتا ہے......" کامنی نے بتایا۔

"پھر تو سمجھو اپنا کام ہو گیا"......نبیل نے قدرے خوش ہو کر کہا۔

"میں سمجھی نہیں......وہ کیسے"؟......کامنی نے اس کی طرف حیرانگی سے دیکھا۔

"دیکھو کامنی اگر یہاں کوئی سرکاری مہمان آیا ہوگا تو ضرور اس کی گاڑی بھی یہاں موجود ہوگی......"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کامنی نے اس کی بات سمجھنے کے باوجود سوال کیا۔

"میرا مطلب تم جان گئی ہو کامنی......ہمارا اگلا سفر پیدل نہیں، سرکاری کار یا جیپ پر ہوگا۔ کیونکہ اس سے زیادہ تمہیں پیدل چلنے کی زحمت میں نہیں دے سکتا۔" اس نے کامنی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ کامنی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ مسکرا کر چپ ہو گئی۔

"ٹھیک ہے۔ چلو چلتے ہیں"......اس نے کہا اور دونوں احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ آوازیں اب نمایاں ہونے لگی تھیں۔ پھر انہیں گاؤں کے آثار دکھائی دینے لگے۔ یہ بستی نما گاؤں پہلے گاؤں سے قدرے بہتر تھا۔ سب سے نمایاں عمارت اس کا مندر تھا جس کی چھوٹی سی عمارت پر اب اندھیرا غالب آ رہا تھا۔ دونوں بہت محتاط انداز میں مختلف درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے بڑھ رہے تھے اور اب وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے۔

جہاں انہیں بستی کے بچے گھروں کے درمیان ایک میدان میں چار پائیوں پر کچھ لوگ بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے اور اس دائرے کے باہر ایک جگہ آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ نبیل کو اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی مذہبی تقریب ہو رہی ہے۔

دونوں ایک قدرے محفوظ جگہ چھپ کر بیٹھ گئے۔ نبیل کے لئے سب سے زیادہ بڑی خوشخبری یہ تھی کہ اس بستی کے باہر دو سرکاری جیپیں کھڑی دکھائی دے گئی تھیں جن کے نزدیک کوئی نہیں تھا کیونکہ ان میں سوار ہو کر آنے والے تمام لوگ اس مجمع میں موجود تھے جو ایک دائرے کی شکل میں انہیں دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں قریباً ایک گھنٹہ تک دم سادھے بیٹھے رہے پھر انہیں ایک عجیب منظر دکھائی دیا۔ کچھ لڑکیاں جنہوں نے جنگلی پھولوں کے گجروں سے اپنے سر اور جسموں کو ڈھانپا ہوا تھا، کورس کی شکل میں کچھ گاتی ہوئیں مجمع کے درمیان پہنچ کر رک گئیں۔ اس کے چند منٹ بعد ہی ایک جنگلی بکری کو باندھ کر گھسیٹتے ہوئے اس طرف لایا گیا۔ لڑکیوں نے ہاتھوں میں پکڑے تاشے زور زور سے بجاتے ہوئے کورس میں گانا شروع کر دیا۔

بکری والے نے مجمع کے درمیان پہنچ کر بکری کے دونوں پچھلے پاؤں باندھ دیئے جنہیں وہاں موجود جنگلیوں میں سے ایک نے قابو کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی گردن کی رسّی دوسرے نے کھینچ لی۔ لڑکیوں کے گانے کا بے ہنگم شور بڑھتا جا رہا تھا جب انہیں آگ کی لپٹوں کے عقب سے ایک "جٹادھاری" ہاتھ میں بڑا سا چھرا لہراتے اس طرف لپکتا نظر آیا جس نے بڑے وحشیانہ انداز میں بکری کے گرد چکر لگایا اور اچانک رک کر پوری قوت سے چھرا اس کی گردن پر مارا۔ بے چاری نحیف ونزار بکری جو پہلے ہی بہت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی کی گردن جھٹکے سے کٹ کر دور جا گری جس کے ساتھ ہی سارے مجمع نے "جے کالی مائی" کے زوردار نعرے بلند کرنے شروع کر دیئے۔

اس کے ساتھ ہی وہاں ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو گیا۔ ایک بڑے ڈرم سے وہ کوئی نشہ آور شربت بھر بھر کے پینے لگے وہاں موجود لڑکیاں بھی اس عمل کا حصہ تھیں۔ چار پائیوں پر بیٹھے پانچ چھ سرکاری ملازمین نے ان لڑکیوں سے فحش حرکات شروع کر دیں۔ یہی شاندار موقع تھا جس سے نبیل نے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی تھی۔

"اچھا موقعہ ہے چلو۔ گاڑیوں کی طرف نکلیں"......اس نے کامنی سے کہا۔

"چلو"......کامنی نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

دونوں ایک لمبا چکر کاٹ کر ان کی مخالف سمت سے گاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں وہ گاڑیوں کے نزدیک موجود تھے۔ جانگلیوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ان کے سامنے دو جنگی جیپیں کھڑی تھیں۔

اگلی جیپ کا دروازہ نبیل نے کھولا جو آرام سے کھل گیا، شاید یہ دروازے لاک نہیں کئے گئے تھے، اس نے اشارے سے پستول ہاتھ میں تھامے کامنی کو اپنے نزدیک بلایا اور دوسرے دروازے سے آگے بیٹھنے کے لئے کہا۔ کامنی بہت پھرتی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"چابی تو ہے نہیں۔ سٹارٹ کیسے کریں گے"......اچانک اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ چابی کے بغیر چلنے والی گاڑی ہے۔ ذرا ٹارچ مجھے دو"......اس نے کامنی سے کہا۔

گھبرائی ہوئی کامنی نے مسکراتے ہوئے نبیل کی

طرف ٹارچ بڑھائی جس نے ڈیش بورڈ کے نیچے جھکتے ہوئے ٹارچ جلا کر اندر موجود تاروں کا جائزہ لیا جس کے بعد مسکراتے ہوئے اس نے کامنی سے کہا۔

’’نیچے بیٹھ کر اس طرف ٹارچ سے روشنی ڈالو...... خیال رکھنا روشنی باہر سے دکھائی نہ دے‘‘۔

کامنی نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

وہ حیرانگی سے نبیل کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی جس نے دو تاریں کھینچ کر توڑیں اور دانتوں سے ان کے کنارے چھیل کر انہیں آپس میں ملا دیا۔ ہلکا سا سپارک ہوا اور گاڑی سٹارٹ ہوگئی۔ نبیل نے فوراً دونوں تار الگ کر دیئے اور کامنی کی طرف دیکھا جس کا چہرہ خوشی سے ٹمٹما رہا تھا۔

’’چلیں‘‘...... کامنی نے کہا۔

’’ایک منٹ، میں چھوٹا سا کام کرلوں‘‘...... اس نے کہا اور نیچے اتر گیا۔

کامنی حیرت سے اس کی حرکات کا جائزہ لے رہی تھی، نیچے اتر کر اس نے بڑی پھرتی سے دوسری جیپ کے دو ٹائروں کی ہوا اس طرح نکالی کہ ٹائروں کے والو نکال کر دور پھینک دیئے، اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے دوسری جیپ کی طرف لپکا، دروازہ کھول کر اس نے باہر کھڑے ہو کر دونوں تاروں کو آپس میں باندھا جیپ سٹارٹ تھی اور جیپ کا راستہ سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جھٹکے کے ساتھ نبیل نے جیپ دوڑا دی۔

’’ویل ڈن...... ویل ڈن...... کامنی نے بے ساختہ اسے داد دی...... تم واقعی بہت زبردست بندے ہو منجیت......‘‘

’’اب ہم اپنے تعاقب سے تو کم از کم بے فکر رہیں گے‘‘۔ اس نے کامنی کی طرف دیکھا اور جیپ کی ہیڈ لائٹس جلا دیں سامنے ایک کچا راستہ نمایاں ہو رہا تھا جس پر نبیل برق رفتاری سے جیپ بھگا رہا تھا اور کامنی اپنے کام میں مصروف تھی اس نے سب سے پہلے ڈیش بورڈ کھولا اور اس میں موجود چیزوں اور کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ خوشی سے ٹمٹمانے لگا۔

’’وہ مارا‘‘...... بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

’’کیا مل گیا......‘‘ نبیل نے سامنے راستے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

’’یہ تو اچھی خاصی رقم ہے...... چلو اچھا ہوا۔ ان حرامیوں نے بھی لوٹ مار سے ہی اکٹھی کی ہو گی۔ ہمارے کام آئے گی......‘‘ اس نے نبیل کو خوشخبری سنائی۔

’’واہ...... شاندار‘‘...... نبیل بھی خوش ہوگیا۔

اس نے جیپ کی رفتار نارمل کر دی تھی، اب وہ کم از کم اپنے تعاقب سے بے فکر ہو گئے تھے اور انہیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہ راستہ انہیں یہاں سے باہر لے جائے گا۔

اس کے بعد اس نے پچھلی نشست پر دھرا بیگ اٹھا لیا اور اس کی چھان پھٹک کرنے لگی۔

’’لو بھئی منجیت تمہارے کپڑوں کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس میں دو مردانہ قمیصیں اور پتلونیں موجود ہیں۔ ضرور تمہیں فٹ ہوں گی۔ میں نے اندازہ لگا لیا ہے‘‘...... اس نے اگلی خوشخبری سنائی۔

’’واہ بھئی واہ...... یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے یہ سب کچھ ہمارے لئے ہی یہاں محفوظ رکھا ہوا تھا‘‘۔ نبیل نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

’’اور کیا‘‘......

دونوں ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے تھے جب اچانک جیپ کے انجن نے جھٹکے لگانے شروع کر دیئے۔

’’پیٹرول ختم ہوگیا شاید......‘‘ نبیل نے کہا۔

’’نو پرابلم......‘‘ کامنی بہت مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

نبیل نے اسے وہیں اتارا، بیگ انہوں نے باہر نکال لیا تھا اور نبیل جیپ کو اب جھاڑیوں کی طرف لے جا رہا تھا جہاں تک جیپ جا سکتی تھی وہ اسے لے گیا اور وہاں کھڑی کرنے کے بعد اس کے چاروں ٹائروں کی ہوا نکال کر کامنی کی طرف واپس آ گیا جس نے اس کی چرائی ہوئی ڈبل روٹی پہلے سے کھانے کے لئے تیار رکھی ہوئی تھی، دونوں نے مل کر پانی کی مدد سے اسے حلق سے نیچے اتارا اور رات کے اندھیرے میں ٹارچ کی روشنی میں اسی راستے پر چلنا شروع کر دیا۔

’’شاید فالتو پٹرول کے کین انہوں نے پچھلی جیپ میں رکھے ہوں گے‘‘ نبیل نے خیال ظاہر کیا۔

’’اچھا ہوا...... اب وہ اس سے اپنی جیپ اچھی طرح جلا سکیں گے۔ ظاہر ہے چلانے سے تو رہے، تم نے دونوں ٹائروں سے ہوا نکال دی تھی۔ منجیت تم بہت جینیئس ہو......‘‘ اس نے بے ساختہ منجیت کو داد دی۔

’’کامنی تم میری زندگی میں پہلی ایسی لڑکی ہو جس نے میری اب تک اتنی تعریف کر دی ہے، ورنہ تو......‘‘ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور ہنسنے لگا۔

’’اور کسی کو تم نے کبھی موقعہ ہی نہیں دیا ہو گا۔ یہ ادھر پنجاب میں تمام مرد کیا تمہاری طرح عورتوں سے بیزار ہی ہوتے ہیں‘‘...... اچانک ہی کامنی نے سوال کیا۔

’’نہیں کامنی...... بہت رومانٹک ہوتے ہیں، ہمارے ہاں تو بہادری اور محبت کی داستانیں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں۔ پنجابی میوزک سنا ہے کبھی......؟‘‘ نبیل نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’ہاں جب ادھر گجرات میں تھی تو......‘‘ اس کی آواز بھرا گئی۔

’’نو پرابلم...... میں تمہیں سناؤں گا۔ زندگی نے مہلت دی تو اپنے گاؤں میں لے جاؤں گا‘‘...... اس نے کامنی کے کندھے کو محبت سے تھپتھپایا تو وہ اچانک رونے لگی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔ نبیل کیلئے یہ بڑے جذباتی لمحات تھے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کامنی کو کس طرح نارمل کرے۔ بالآخر اس نے بڑی آہستگی سے اسے خود سے الگ کیا۔

’’کامنی پلیز نارمل ہو جاؤ۔ تم پریشان ہوتی ہو تو میرا دل بہت دکھتا ہے۔ کامنی میرا دل کہتا ہے تمہارے اچھے دن پھر واپس آئیں گے۔ تم ضرور اپنی اصلی زندگی کی طرف واپس لوٹو گی......‘‘ اس نے کامنی کو تسلی دی۔

دونوں وہیں ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ کامنی نارمل ہو رہی تھی اور نبیل دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

اسے صرف ایک بات کا دکھ تھا کہ وہ کامنی سے ملاقات کے بعد نماز نہیں پڑھ سکا تھا۔ کامنی کے سامنے وہ خود کو وہی ظاہر کر سکتا تھا جو اس کی جعلی شناخت تھی لیکن اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے شروع میں ہی اپنا کوئی مسلمانوں والا نام بتانا چاہیے تھا۔ کامنی اس پر بھی مطمئن ہو جاتی۔ وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ خواتین کی نفسیات کو تو وہ زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اس بات کی گواہی اس کا دل دے رہا تھا کہ کامنی بری لڑکی نہیں۔ گردش حالات نے اسے یہاں تک پہنچا دیا جیسے نبیل کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا لیکن یہ لڑکی اس سے کیوں ٹکرا گئی تھی؟ زندگی کے پانچ سال ڈاکوؤں کے ساتھ بسر کرنے والی اس لڑکی کو وہ ابھی تک اپنے ساتھ کیوں لئے پھر رہا تھا؟

یہ اور ایسے کئی سوال رہ رہ کر اس کے دل و دماغ میں آئے لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ یہ سب قدرت کی طرف سے ہو رہا ہے اس نے خود کو تن بہ تقدیر

چھوڑ دیا تھا اور یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کا اس لڑکی سے ملنا نبیل کا اپنا فیصلہ نہیں، قدرت نے اگر دونوں کو ملا دیا ہے تو ضرور اس میں کوئی حکمت ہوگی۔ شاید اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے اس جنجال سے نکالنا چاہتے ہوں۔ یہی تھی وہ آخری دلیل جو اس کے دل و دماغ کو مطمئن کر دیا کرتی تھی، وہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ جس نے اسے ان موذیوں کے پنجے سے نکالا ہے وہ اسے یہاں سے بھی نکال کر ضرور اپنے گھر پہنچائے گا اور نبیل کو یہاں سے کیسے نکالنا ہے اس کا فیصلہ بھی نبیل نہیں کر سکتا تھا۔

کامنی کو اس کے ساتھ بیٹھے بیٹھے اچانک اونگھ آ گئی تھی اور وہ کافی دیر سے نبیل کے زانوں پر اپنا سر رکھے سو رہی تھی۔ نبیل نے اس کے جسم پر وہ بڑی سی چادر ڈال دی تھی جو ابھی تک ان کے پاس موجود تھی اور خود درخت سے ٹیک لگا کر اپنے خیالات میں گم تھا۔

اچانک ہی کامنی کی آنکھ کھلی تھی جب اس نے اپنی پوزیشن کا جائزہ لیا تو حیران پریشان رہ گئی۔ وہ گزشتہ ڈھائی گھنٹے سے نبیل کے زانوں پر سر رکھے آرام کر رہی تھی اور نبیل اپنی پوزیشن بھی اس ڈر سے تبدیل نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔

''سوری آئی ایم ویری سوری''۔ اس نے آنکھ کھلتے ہی نبیل سے معافی مانگی۔

''نو پرابلم......'' نبیل نے کہا اور زوردار انگڑائی لی۔ جس سے اس کا بدن کا خاصا کھل گیا۔

''میں شاید تین چار گھنٹے سوتی رہی ہوں''...... اس نے اچانک ہی نبیل سے دریافت کیا۔

''ڈھائی گھنٹے''...... نبیل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن یہ میرا اندازہ ہے۔''

''منجیت تم انسان ہی ہو یا کوئی اور''؟ اچانک ہی کامنی نے اس سے پوچھا۔

''مجھے تو یہی خوش فہمی ہے کہ میں انسان ہی ہوں...... کیوں کوئی غلط بات؟''...... اس نے بات کو ٹالنا چاہا۔

''نہیں منجیت...... تم اس معاشرے کے انسان نہیں ہو جس میں میرا جنم ہوا ہے۔ تم نے ایک مکمل اور بھرپور مرد ہوتے ہوئے بھی مجھے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا اور اب تو...... او مائی گاڈ''......

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کامنی پلیز...... کس چکر میں پڑ گئیں...... ارے بھئی میرے کیا سر پر سینگ اُگ آئے ہیں۔ اس طرح مجھے کیا دیکھ رہی ہو''۔ نبیل اسے نارمل کرنے کے لئے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن کامنی کی الجھن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

وہ مسلسل نبیل کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور اس کی خوبصورت آنکھوں میں اب آنسو تیرنے لگے تھے۔ کامنی بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ زندگی میں اس کا سامنا کبھی ایسے انسان سے بھی ہوگا؟ یہ سوچ اسے کسی دوسری دنیا میں لے جاتی تھی۔ اس نے اپنے معاشرے کا جو بھیانک اور مکروہ روپ دیکھا تھا اس کے بعد تو اسے بھارتی مردوں سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ پرکاش کو قتل کرنے کے بعد وہاں سے جان بچانے کے لئے ضرور بھاگ گئی تھی لیکن اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ دوبارہ بھی جی پائے گی، نہ ہی اسے اور جینے کی خواہش تھی۔

اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوال اٹھتا تھا کہ وہ جیئے گی تو کس کے لئے؟ اس کے سماج نے اسے قبول نہیں کرنا تھا۔ اپنے گھر واپس جاتی تو وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس کا تعلق ایک عزت دار گھرانے سے تھا اور وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کے فرار کے بعد گھر والوں

پر کیا گزری ہوگی...... اور وہ گھر جائے بھی تو کیا منہ لے کر؟

منجیت سے ملنے کے بعد نجانے کیوں اس میں جینے کی خواہش جنم لینے لگی تھی...... اسے کوئی نادیدہ قوت بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ منجیت وہ نہیں جو وہ دکھائی دے رہا ہے...... لیکن وہ اپنی اصلیت کیوں چھپا رہا ہے؟ یہ سوچ پہلی مرتبہ پیدا ہوئی تھی۔

''شریمتی جی! اگر آپ نے آرام فرما لیا ہو تو آگے چلیں۔''

اچانک ہی نبیل نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

''چلو''...... کامنی نے نیم دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

دونوں پھر چل دیئے۔

نبیل نے اپنا اور کامنی کا سارا سامان بیگ میں منتقل کر لیا تھا۔ بیگ سے اس نے ایک پتلون اور شرٹ نکال کر پہن لی تھی جو حیرت انگیز طور پر اسے اس طرح فٹ بیٹھی جیسے درزی کو ناپ دے کر سلائی گئی ہو۔

وہ اب کامنی کے کپڑوں کے لئے فکرمند تھا لیکن فی الوقت اس کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کامنی نے لفافے میں موجود نوٹ گن کر اسے بتایا تھا کہ یہ بیس ہزار روپے ہیں جو ضرور ان غریبوں کے لئے حکومت نے دیئے ہوں گے لیکن ان موذیوں نے خود ہڑپ کر لیے تھے۔ ان کی جیپ سے اندازہ ہوا تھا کہ ان کا تعلق اس صوبے کے سوشل ویلفیئر محکمے سے تھا جو ان جنگل باسیوں کی زندگی میں انقلاب لانے کے لئے کوشاں رہتا تھا، کامنی نے اسے بتایا تھا کہ ''ماؤنسٹ'' ان سرکاری ملازمین کو چھاپہ مار کر پکڑ لیتے ہیں۔ ان جنگل باسیوں کے سامنے عدالت لگاتے ہیں جہاں یہ سرکاری ملازمین اپنے جرم کا اقبال کرتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح اور کتنا روپیہ ان بے چارے جانگلیوں کی فلاح و بہبود کے نام پر اڑایا ہے جس کے بعد یہ ماؤ گوریلے انہیں گولی مار کر وہیں پھینک جایا کرتے تھے۔

نبیل نے اس لمحے وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے خود سے یہ وعدہ ضرور کر لیا تھا کہ وہ کامنی کو اس کے گھر والوں تک پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ وہ خود مفرور اور معتوب تھا لیکن نجانے کیوں اس نے کامنی کو اپنی ذمہ داری سمجھ لیا تھا اور دل میں ٹھان لی تھی کہ اپنی بساط کی حد تک اس کی باقی زندگی خراب نہیں ہونے دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک مرتبہ گھر رابطہ ہونے کے بعد اس کے کزن اسے یہاں سے اس طرح نکال لیں گے جیسے مکھن سے بال نکال لیا جاتا ہے۔ وہ اس کے لئے جان دے سکتے تھے اور جان لے بھی سکتے تھے۔

O

دونوں ایک مرتبہ پھر عازم سفر تھے۔

کامنی نے ضد کر کے تمام رقم نبیل کو سونپی تھی۔ نبیل چاہتا تھا کہ یہ رقم کامنی کے پاس رہے لیکن وہ اس پر تیار نہیں تھی۔ دونوں نے خاصا سفر خاموشی سے طے کیا تھا نبیل جانتا تھا کامنی کس کشمکش کا شکار ہے۔ اس نے کامنی کو حوصلہ دینے اور اس کیفیت سے نکالنے کا ارادہ باندھا تھا اور اس کا دھیان بانٹنے پر کوشاں تھا۔

اچانک ہی دونوں نے پرندوں کی چہچہاہٹ سنی جس سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ اب وہ جنگل سے باہر نکلنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

''شاید ہم جنگل سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں''۔ کامنی نے خوشخبری دی۔

''بے شک، میرا دل بھی یہی کہتا ہے''۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا منجیت..... اگر تم نہ ہوتے تو......" کامنی پھر جذباتی ہونے لگی تھی۔

"نہیں کامنی...... یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ساری زندگی اس جنگل میں ہی بھٹکتا رہتا۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں"......اس نے فراخ دلی سے حقیقت کا اقرار کیا۔

"تم ایسا سوچتے ہو منجیت تو یہ تمہاری عظمت ہے"......کامنی نے کہا اور نظریں جھکالیں۔

ایک گھنٹے کے مزید سفر نے انہیں کچے راستے سے پختہ سڑک پر ڈال دیا۔ سڑک کے پار ایک آبادی میں زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ آبادی کچھ مختصر لیکن قدرے بہتر دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں سڑک کنارے پہنچ گئے۔ کامنی نے وہ بڑی سی چادر اوڑھ لی تھی جس سے وہ مقامی عورت دکھائی دینے لگی تھی گو کہ نبیل کی داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی لیکن وہ اس لباس میں قدرے بہتر اور معزز دکھائی دے رہا تھا۔

دونوں سڑک کنارے اس طرح کھڑے تھے جیسے سامنے کی آبادی سے یہاں آئے ہوں اور اب انہیں آگے جانے کے لئے بس کا انتظار ہے۔ کامنی نے مقامی زبان میں لکھے سنگ میل پڑھ لئے تھے اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کہاں موجود ہیں۔

اچانک ہی انہیں دور سے ایک مسافر بس آتی دکھائی دی جسے ہاتھ دینے پر وہ رُک گئی۔ کامنی نے بس ڈرائیور کی ونڈ سکرین کے کونے میں لگی نمبر پلیٹ پر لکھے تین چار نام پڑھ لئے تھے اور اب وہ قدرے مطمئن ہوئی تھی۔ دونوں بس میں داخل ہوئے، آدھی بس خالی تھی۔ باقی سواریاں اونگھ رہی تھیں۔ یہ کوئی انٹرسٹی بس تھی اور سواریاں خاصی دور سے آرہی تھیں۔ ایک دو سواریوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور دوبارہ ان کی گردنیں ڈھلک گئیں دونوں ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔

کنڈیکٹر جو ڈرائیور سے باتوں میں مصروف تھا تھوڑی دیر بعد ان کی طرف آیا۔

"سہانی کے دو ٹکٹ دے دو"...... اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی کامنی نے کہا۔

کنڈیکٹر نے شاید اتنی خوبصورت لڑکی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ وہ مسلسل کامنی پر نظریں گاڑے کھڑا تھا۔

"بہرے ہو گیا، سنتے نہیں" کامنی نے اس لہجہ میں کہا کہ بے چارہ گھبرا گیا۔

"نو! نو! میڈم"......اس کے منہ سے بمشکل نکلا اور اس نے دو ٹکٹ کاٹ کر ان کے حوالے کر دیئے۔

"کتنے پیسے"......اس مرتبہ نبیل نے دریافت کیا تھا۔

"جی پچاس روپے مہاراج"......کنڈیکٹر نے سہم کر جواب دیا۔

نبیل نے پہلے سے جیب میں الگ سے رکھی رقم میں سے سو کا نوٹ نکال کر اسے دیا اور باقی رقم وصول کر کے جیب میں ڈالی، کنڈیکٹر ابھی تک چور نگاہوں سے کامنی کو دیکھ رہا تھا، پھر وہ اپنی جگہ واپس لوٹ گیا۔

دونوں اپنے اپنے خیالات میں گم تھے قریباً آدھ گھنٹے بعد بس ایک جگہ رُکی جہاں تین چار سواریاں اتر گئیں لیکن کوئی اور سوار نہیں ہوا۔

انہیں بس میں سفر کرتے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا جب بس کے بریک لگنے سے دونوں چونکے، دونوں نے کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانکا، جہاں پولیس نے ناکہ لگا رکھا تھا۔

دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے!

(اس سنسنی خیز داستان کی اگلی قسط شمارہ اگست میں ملاحظہ فرمائیں)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 8

بس رک گئی تھی۔ پولیس والے نزدیک آ رہے تھے اور نبیل کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو رہی تھیں۔ اچانک ہی اسے اپنے ہاتھ پر کامنی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔

''فکر نہ کرنا۔ میں ان سے نمٹ لوں گی۔'' کامنی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

بس میں موجود سواریوں نے اندر داخل ہونے والے دو سپاہیوں کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ غالباً یہ ان کے لیے معمول کی بات تھی۔ دونوں سپاہی بس کی سیٹوں کا جائزہ لے رہے تھے جیسے وہاں چھپی کسی چیز کو تلاش کر رہے ہوں۔ یہ تو نبیل کو بعد میں علم ہوا کہ ان بسوں کے ذریعے غیر قانونی شراب اور نشہ آور ادویات ایک سے دوسرے شہر میں سمگل کی جاتی تھیں۔

ایک سپاہی ان کے نزدیک آ کر رک گیا۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ مہاراج؟'' اس نے نبیل کو مخاطب کیا۔

''کیوں؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟ تمہیں ساری بس میں ایک ہم ہی مشتبہ دکھائی دیے ہیں۔ ''بیاور'' جا رہے ہیں ''لونی'' سے آئے ہیں۔ اور کچھ بتاؤں؟''

اپنے سوال پر کامنی کے اچانک بھڑک جانے کی اداکاری نے سپاہی کو ایک مرتبہ تو بوکھلا دیا تھا۔ بمشکل اس نے سنبھل کر پوچھا۔

''میڈم برا مت مانیے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔''

''جانتی ہوں تمہیں بھی اور تمہاری ڈیوٹی کو بھی۔ کامنی پرشاد نام ہے میرا۔ مہلا سدھار پروگرام کی ڈائریکٹر ہوں۔ سارا دن تمہاری عورتوں میں ہی گزرتا ہے۔'' کامنی کا لہجہ ابھی تک جارحانہ تھا۔

''شما کر دیجیے میڈم غلطی ہو گئی۔ چل بھائی یہ تو بڑے غصے والے لوگ ہیں۔'' دوسرے سپاہی نے اونچی آواز سے کامنی کو مخاطب کرنے کے بعد اپنے ساتھی کو پکارا جو سہم کر اس کے ساتھ ہی باہر نکل گیا۔

بس چل پڑی۔

''بہت اچھا کیا آپ نے شریمتی جی!'' ایک نوجوان نے کہا۔

''اور کیا انہوں نے تو لوٹ مچا رکھی ہے سیکورٹی کے نام پر۔'' دوسرا بولا۔

بس کے قریباً تمام مسافروں نے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ نبیل دل ہی دل میں کئی مرتبہ اسے داد دے چکا تھا۔ کمال کی اداکاری کی تھی کامنی نے۔ اگر وہ چادر ہی اتار دیتی تو اپنے لباس سے مشتبہ ہو سکتی تھی جو وہ ابھی تک نہیں بدل پائے تھے۔

دونوں خاموش تھے۔ بس میں موجود باقی مسافروں نے دوبارہ اونگھنا شروع کر دیا تھا اور بس میں اب صرف انجن کا شور تھا۔ دونوں خاصے مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اطمینان ہی تھا جس نے دونوں کو بہت پرسکون کر دیا تھا۔ اتنا پرسکون کہ لاکھ کوشش کے باوجود نبیل خود پر قابو نہ پا سکا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

نبیل کی آنکھ شور کی آواز سے کھلی تھی۔ آنکھ کھلنے پر اسے سب سے پہلے احساس ہوا کہ اس کا سر کامنی کے کندھے پر ٹکا ہے اور کامنی نے اپنی آدھی چادر اس کے جسم پر ڈال رکھی ہے۔

''اوہ مائی گاڈ سوری۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا ہوا؟'' کیا ہوا کامنی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں وہ......'' نبیل کی بات ادھوری رہی۔

بس رک گئی تھی۔

یہ کوئی لاری اڈہ تھا جہاں خاصی گہما گہمی دکھائی دے رہی تھی۔ مسافر ایک ایک کر کے اتر رہے تھے۔ دونوں ان کی تقلید میں نیچے اتر آئے سامنے ایک بورڈ پر انگریزی اور ہندی زبان میں بڑے بڑے لفظوں میں ''بیاور'' لکھا تھا۔ کامنی نے اسے راستے میں سمجھا دیا تھا کہ وہ جس ٹرین میں سفر کر رہا تھا اس نے اجمیر تک جانا تھا جہاں سے دوسری ٹرین کے ذریعے اسے دلی لے جایا جاتا۔ احمد آباد سے دلی جانے کے لیے اجمیر کا راستہ ہی اختیار کرنا پڑتا تھا۔

کامنی شاید اس علاقے سے آگاہی رکھتی تھی کیونکہ لاری اڈے ہی میں ایک سائیکل رکشہ والے کے ساتھ کسی جگہ جانے کا کرایہ دریافت کر رہی تھی۔ نبیل کے لیے فی الوقت سوائے دیکھنے اور انتظار کرنے کے اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ اس نے خود کو مکمل کامنی اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑا ہوا تھا۔

''آؤ بیٹھو۔'' کامنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے حقائق کی دنیا میں واپس آنے کے لیے کہا تھا۔

دونوں سائیکل رکشہ میں ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے۔ نبیل کے لیے کسی انسان کا دوسرے انسانوں کو جانور بن کر کھینچنے کا یہ تجربہ بڑا تکلیف دہ تھا لیکن اس نے اس پر کوئی کومنٹ نہیں کیا۔ اس نے بطور خاص اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنی کسی حرکت سے وہ خود کو اس معاشرے میں کوئی اجنبی نہ ظاہر ہونے دے۔

اس سفر کا اختتام قریب ہی ایک بازار پر ہوا تھا۔ جس میں چاروں طرف لوگوں کا اژدہام دکھائی دے رہا تھا۔ اس شہر کا غالباً یہ سب سے بڑا اور اہم بازار تھا جہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر قابل ذکر شے میسر تھی۔ اسے ''دھونی بازار'' کہتے تھے نبیل کو جلد ہی اس نام کی وجہ بھی سمجھ آ گئی جب اسے بازار میں چاروں طرف اگربتیوں کا دھواں پھیلا دکھائی دیا۔ یہ دھواں دکانوں کے اندر سے باہر آ رہا تھا۔ جو دکاندار اپنے سروں پر بنے چھوٹے چھوٹے طاقچوں میں رکھی ان دیویوں اور دیوتاؤں کو اگربتیاں جلا کر دے رہے تھے جو ان کے لیے ''لکشمی'' کا درجہ رکھتی تھیں اور جن کی عبادت سے ہی انہیں اچھے گاہک کی امید بندھتی تھی۔

کامنی اسے لے کر ایک قدرے بڑی دکان پر آئی تھی جو یہاں کی غالباً سب سے بڑی دکان تھی جس میں ان سے پہلے بھی خاصے گاہک موجود تھے۔

یہ ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان تھی اور یہاں آمد کا مقصد اسے اچھی طرح سمجھ آ گیا تھا۔ نبیل نے تو سرکاری ملازم کے چوری شدہ کپڑوں سے اپنا حلیہ کچھ بہتر کر لیا تھا جبکہ کامنی کے لیے زنانہ کپڑوں کی خریداری ضروری تھی۔

تھوڑی دیر میں ہی انہوں نے اپنے لیے چار پانچ جوڑے سلے سلائے کپڑے خرید لیے۔ دونوں نے دکان کے اندر ہی بنے کیبن میں نئے کپڑے زیب تن کر لیے تھے اور اب بل کی ادائیگی کے بعد دکان سے باہر آ رہے تھے۔ دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھے ایک موٹے سے سیٹھ نے انہیں سفر کرتے ہوئے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا غالباً اسے اسی طرح کے جوڑوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا جو گھروں سے بھاگ کر آتے تھے اور چھپ کر شادی کرنے کے بعد کامنی اور نبیل کی طرح ریڈی میڈ کپڑے

پہن کر اگلی منزل کا رخ کرتے تھے۔

دونوں کو موٹے سیٹھ کے مسکرانے کا مطلب اچھی طرح سمجھ آگیا تھا اور وہ بھی مسکرا دیے تھے۔ دونوں نے اس پر کمپرومائز بھی کرلیا تھا۔ فی الوقت ان کے لیے یہی بہتر تھا کہ ان کے متعلق اسی قسم کی رائے قائم کی جاتی۔

کامنی اسے شہر کے دوسرے کونے میں موجود ایک ہوٹل تک لے آئی تھی جہاں دونوں نے فی الوقت قیام کرتے اگلا لائحہ عمل طے کرنے کا پروگرام بنانا تھا۔ ان کے لیے اس سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں تھی۔ نبیل خود پولیس والا تھا اور اس نے بخوبی اندازہ کرلیا تھا کہ کامنی پولیس والوں سے نمٹنا جانتی ہے۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ زندگی کے چند اہم سال بسر کرنے کے بعد اسے اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ کسی بھی درپیش صورتحال سے کیسے نمٹا جاتا ہے اور اب وہ نبیل کے لیے ڈھال کا کام دے رہی تھی جس کے پیچھے چھپ کر وہ خود کو آنے والے طوفان سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔

یہ صورتحال اس کی غیرت کو گوارہ نہیں تھی۔ اسکے لیے یہ تصور ہی بڑا سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ بجائے ایک عورت کو سہارا دینے کے وہ خود اسی کے سہارے کا محتاج ہے لیکن فی الوقت اس نے یہ خیال ہی دل و دماغ سے نکال دیا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اگر وہ بخیر و عافیت یہاں سے نکل گیا تو وہ کامنی کا سہارا بن جائے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

دونوں خاوند اور بیوی کی حیثیت سے اس تھری سٹار ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ جہاں کامنی نے خود ہی رجسٹر میں اندراج کیے تھے اور خود کو محکمہ تعلیم کی ملازم لکھا تھا۔ ہوٹل والوں کا واسطہ عموماً ایسی پڑھی لکھی خواتین سے رہتا تھا جن کے خاوند ان پڑھ یا کم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کے رعب داب میں رہتے تھے یہاں بھی انہیں کچھ ایسی ہی صورتحال دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں بھوک محسوس کررہے تھے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کامنی نے کمرے میں ہی کھانے کا آرڈر لکھوا دیا اس نے نبیل کی خواہش پر ''ویجیٹیرین'' کھانا منگوایا تھا۔

☆☆☆

ملک ناصر سے کرنل خان نے اس کے ڈیرے پر ملاقات کی تھی اور اس ملاقات کا سب سے بڑا حاصل وہ خوشی تھی جس نے ملک ناصر کو سرشار کردیا۔ کرنل خان نے تصدیق کردی تھی کہ ملک نبیل پولیس کی گرفت سے فرار ہوچکا ہے۔ ان کے ''مقامی سورس'' نے اس ضمن میں تفصیلی رپورٹ ارسال کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایک ''مشکوک پاکستانی دہشت گرد'' جس کو احمد آباد سے دہلی لے جایا جارہا تھا راستے میں ٹرین پر علیحدگی پسندوں کی طرف سے ہونے والے حملے میں فرار ہوگیا ہے کیونکہ زخمی یا مرنے والوں میں وہ موجود نہیں تھا اور ''را'' کی طرف سے پہلے ہی ایک اہم بیان جاری ہوچکا تھا جس کے مطابق اس ''دہشت گرد'' کو چھڑوانے کے لیے ٹرین پر حملہ کروایا گیا تھا۔

ایک دوسرے کے خلاف اس نوعیت کے اعصاب شکن کھیل دونوں ملکوں کی ایجنسیاں ایک عرصے سے کھیلتی آرہی تھیں اس لیے کرنل خان کے لیے تو یہ اچنبھے کی بات نہیں تھی لیکن وہ تصویر کے دوسرے پہلو کو بھی دیکھ سکتا تھا عین ممکن تھا کہ ''را'' نے نبیل کو مارنے کے بعد اسے اس کھاتے میں ڈال دیا ہو یا پھر اسے غائب کرنے کے لیے اس ڈرامے کا کردار بنایا ہو۔ جب اسے تصدیق ہوگئی کہ نبیل واقعی فرار ہوچکا ہے اس کے بعد ہی اس نے ملک ناصر کو اعتماد میں لیا تھا۔

''سر جی! میں نے آپ سے کہا تھا کہ زندہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی اپنے ملک کے خلاف وہ نہیں نکلوا سکتے اور اب آپ سے عرض کردوں کہ اگر وہ فرار ہوگیا ہے تو اب آئندہ کبھی بھارتی پولیس کو گرفتاری نہیں دے گا۔ سر جی! ہمیں اپنے خون پر بڑا اعتماد ہے۔'' اس نے بڑے پریقین لہجے میں کرنل خان سے کہا تھا۔

کرنل خان کو اب تک ان کے متعلق مکمل معلومات تو مل چکی تھی اور وہ یہ بات جان گیا تھا کہ یہ بہت بہادر اور مرنے مارنے والے لوگ ہیں، ان کی خاندانی دشمنیوں کا بھی اسے بخوبی اندازہ تھا اور ملک ناصر سے دو چار ملاقاتوں کے بعد اس نے ہیڈ کوارٹر کو یہ رپورٹ بھی دے دی تھی کہ ملک نبیل زندہ ہو یا مردہ انڈین انٹیلی جنس اسے پاکستان کے خلاف کبھی استعمال نہیں کرسکتی۔

''انشاء اللہ! ہم اسے پاکستان لے آئیں گے۔'' ملک ناصر نے کرنل خان کی ساری بات سننے کے بعد کہا تھا۔

اس نے کرنل خان سے ایک ہی درخواست کی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اسے سلطان خان کے کراچی میں کسی ایسے ٹھکانے سے آگاہ کردیں جہاں اس سے ملاقات ہوسکے۔ اور ایک روز کرنل خان نے یہ عہد بھی وفا کردیا۔

''وہ یہاں چار پانچ روز کے لیے کچھ پرانے معاملات نمٹانے آیا ہے پھر واپس چلا جائے گا۔'' انہوں نے ملک ناصر کو آگاہ کیا۔

''شکریہ کرنل صاحب۔ نہ ہم نے کسی آنے والے کو کبھی روکا ہے اور نہ جانے والے کو۔ اس نے میرا بھائی جس طرح ہم سے وصول کیا تھا اسی طرح واپس لوٹانا ہوگا۔ ہمارا اور کوئی مطالبہ نہیں اس سے۔''

ملک ناصر نے مسکراتے ہوئے فون پر کہا تھا اور اس روز وہ شام کی فلائٹ سے اپنے دو انتہائی اہم اور جانباز ساتھیوں کے ساتھ کراچی روانہ ہوگیا۔

کراچی ایئرپورٹ پر ملک نذیر اس کا منتظر تھا۔ ملک نذیر کا اپنی برادری میں خاصا رعب داب تھا اور کراچی پولیس بھی اس کی شہرت سے اچھی طرح آگاہ تھی لیکن یہ سب جانتے تھے کہ اس نے کبھی کسی غیر قانونی دھندے میں منہ نہیں مارا۔ البتہ مار دھاڑ میں وہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ جس مارکیٹ میں اس کا کاروبار تھا اس کے نزدیک دور کی مارکیٹوں سے بھی کبھی کسی نے بھتہ وصول کرنے کی حماقت نہیں کی تھی کیونکہ جواب میں ملک نذیر کی طرف سے جس طرح کا ردِعمل سامنے آیا تھا اس نے مقامی بھتہ خوروں کے ہوش و حواس اڑا دیے تھے۔ بھتہ وصول کرنے والے اپنے ایک ساتھی کی لاش، تین کو نیم مردہ حالت میں بمشکل پولیس کی مدد سے اٹھا کر لے جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ملک نذیر پر انہوں نے جب بھی حملہ کروایا ایسا زبردست جواب ملتا تھا کہ اب انہوں نے ملک نذیر کی طرف توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس کی شہرت سن کر مقامی گروپس نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی لیکن ملک نذیر نے انہیں ایک ہی جواب دیا تھا کہ جب وہ یہ محسوس کرے گا کہ خود اپنی جان مال، عزت، آبرو کی حفاظت نہیں کرسکتا تو ضرور ان کے پاس ہی آئے گا جس پر انہوں نے بھی خاموشی ہی اختیار کرلی تھی۔

ناصر سے اس کی رشتہ داری بھی تھی اور دوستی بھی۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ملک نذیر اپنے والد کے ساتھ نوعمری میں ہی کراچی آگیا تھا لیکن دونوں نے کبھی اس تعلق کو نہیں بھلایا تھا اور سال میں تین چار مرتبہ ایک دوسرے سے بہرحال ملاقات کرلیا کرتے

تھے۔

ملک نذیر نے کھلی بانہوں سے اس کا استقبال کیا اور انہیں اپنے ڈیرے پر لے آیا۔ ناصر نے اسے اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنا دی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ سلطان خان کو نقصان نہیں پہنچانا بلکہ اس سے اپنا کام نکلوانا ہے۔

''ملک ناصر تو کہے تو اسے یہاں اٹھا کر لے آئیں؟'' ملک نذیر نے پوچھا۔

''نہیں نذیرے۔ یہ کام تیرا بھائی بھی کر سکتا تھا لیکن ہر جگہ بدمعاشی سے معاملات سیدھے نہیں ہوتے، کہیں حکمت سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر آج ہی قابو کر لیتے ہیں۔'' ملک نذیر نے کہا اور ان کے لیے کھانے پینے کے بندوبست کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے ملک ناصر اور اس کے ساتھیوں کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا اس کے تین بندے سلطان خان کے آفس کی ''ریکی'' کرنے کے لیے جا چکے تھے جنہوں نے اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ جب وہ سلطان خان کے آفس پر دھاوا بولیں تو سلطان خان وہاں موجود ہو۔

ملک ناصر کو بے چینی ضرور لگی تھی لیکن اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جس مقصد کے لیے وہ آیا ہے اس میں کامیاب ہو کر ہی واپس جائے گا اور آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے دل و دماغ نے اسے کوئی غلط راہ دکھائی ہو۔

شام ڈھلے ڈیرے پر پیغام آ گیا کہ سلطان خان آفس میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی پہلے سے تیار دو گاڑیوں میں ملک ناصر اور ملک نذیر اس کے آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ سلطان خان کا یہ آفس ''آف دی ریکارڈ'' تھا۔ جس کا علم سوائے اس کے چند اہم ساتھیوں کے اور کسی کو نہیں تھا۔

یہ کراچی کے پوش علاقے کا ایک بنگلہ تھا جس کے باہر ایک مستعد گارڈ موجود رہتا۔ ملک نذیر کے بندوں نے چند سیکنڈ میں گارڈ کو قابو کر کے گیٹ کھلوا لیا تھا اور اسے بند کرنے کے بعد اب وہ بنگلے کے اندر اس طرح داخل ہوئے تھے کہ اندر سے کوئی بھاگ کر باہر نہ جا سکے۔ سلطان خان اپنی سیکرٹری کے ساتھ بڑے خوشگوار موڈ میں گپ شپ کر رہا تھا جب ملک ناصر اور ملک نذیر موت کے فرشتوں کی طرح دروازہ کھول کر زبردستی اندر داخل ہو گئے۔ ان کے بندوں نے پلک جھپکتے میں وہاں موجود سلطان خان کے تینوں محافظوں اور ڈرائیور کو قابو کر لیا تھا۔

''آپ؟'' سلطان خان نے جس کا حیرت سے منہ کھلا ہوا تھا انہیں اچانک اپنے سر پر کھڑے دیکھ کر کہا۔

''اس...سلام علیکم ملک صاحب۔'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

''وعلیکم السلام۔ سنا بھئی سلطانے! کیا حال ہیں تیرے۔ سنا ہے بہت بڑا بزنس مین بن گیا ہے تو۔'' ملک نذیر نے اس کی طرف طنزیہ جملہ اچھالا۔

''ملک جی! آپ کے تابعدار ہیں جی۔'' سلطان خان قدرے سنبھل گیا تھا۔

''اچھے تابعدار ہو۔ آج چار سال بعد تمہاری شکل خود دیکھنے آ گئے ہیں تم نے تو بزرگوں کے تعلق کی بھی حیا نہیں رکھی۔'' ملک نذیر نے دوبارہ طنز کیا۔

''میں معافی چاہتا ہوں ملک صاحب۔ آپ بڑے آدمی ہیں میں......'' گھبراہٹ میں اس کے منہ سے کوئی ڈھنگ کی بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔

''سلطان خان! اپنے بندوں کو کہہ دے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کریں، باہر دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ہم تجھ سے ملنے آئے ہیں۔ بات کرنے آئے ہیں اس کے علاوہ

ہمارا اور کوئی ارادہ نہیں۔''

ملک ناصر نے سامنے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ سلطان خان کی سیکرٹری پر کپکپی طاری تھی اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ سلطان خان کو اس طرح خوفزدہ دیکھا تھا۔

''بیٹھیں جناب تشریف رکھیں۔'' اس نے ملک نذیر کی طرف دیکھا جو اب تک کھڑا تھا اور اپنی سیکرٹری سے مخاطب ہوا۔

''میرے بہت قابل احترام بزرگ ہیں۔ پنجاب سے تشریف لائے ہیں۔ جاؤ جلدی کھانے پینے کا بندوبست کرو۔''

''اس کی ضرورت نہیں سلطان خان۔'' ملک ناصر نے اسے روکا۔

''ملک صاحب! آپ میرے ساتھ جو بھی سلوک کریں لیکن یہ ممکن نہیں کہ میرے علاقے کے اتنے بڑے لوگ میرے پاس آئیں اور میں ان کی خدمت نہ کروں۔ آپ نے مجھے حکم دیا ہوتا۔ اگر میں نہ آتا تو آپ ضرور گلہ کرتے۔'' اس نے ملک نذیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا سلطان خان ہم آئیں یا تو آئے۔ اگر تجھے بزرگوں کی عزت کا خیال آ ہی گیا ہے تو ہم سے بھی بھلے کی ہی توقع رکھنا۔'' ملک نذیر نے کہا اور اس کے سامنے والی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''جاؤ تم......'' اس نے سیکرٹری سے کہا جو اب قدرے نارمل ہو رہی تھی لیکن ابھی تک مکمل نارمل نہیں ہوئی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ باہر نکل گئی۔

ملک نذیر نے دروازہ کھول کر اشارہ کیا تو اس کے بندے سلطان خان کے گارڈز اور ڈرائیور کو اندر لے آئے۔ جنہیں سلطان خان نے نارمل رہنے کی ہدایت کی تھی اور دروازے کے باہر والے گارڈ نے بھی تھوڑی دیر بعد اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی۔

''تمہیں مجھ سے خود ملنے آنا چاہیے تھا۔ آخر ہمارا بزنس کے علاوہ کوئی اور تعلق بھی ہے۔'' ملک ناصر نے گلہ کیا۔

''کس منہ سے آتا ملک صاحب؟'' سلطان خان نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ یہ حادثہ بالکل غیر متوقع تھا۔ قسمت کی بات ہے۔ مجھے آپ کے سامنے شرمندہ ہونا تھا اسی لیے یہ سب کچھ ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں ملک صاحب کہ سلطان خان کے جیتے جی ملک نبیل کا بال بیکا نہیں ہو سکتا تھا بس قسمت کے آگے زور نہیں چلا میرا۔ سچی بات ہے کسی ڈر سے نہیں شرمندگی سے آپ کو ملنے نہیں آیا۔''

سلطان خان نے وضاحت پیش کی اور دونوں کو دیوار پر لگے ایک نقشے کی مدد سے بتایا کہ کس طرح ان کی لانچ نے سفر شروع کیا تھا اور اچانک آ جانے والے طوفان نے انہیں کسی خطرناک راستے پر پھینک دیا جہاں سے وہ بھارتی نیوی کے ہتھے چڑھ گئے جس نے انہیں دہشت گرد سمجھ کر لانچ پر فائرنگ کی۔ سلطان خان نے انہیں بتایا کہ ملک نبیل کے علاوہ لانچ کا کوئی مسافر یا عملے کا بندہ زندہ نہیں بچا۔

اس نے دونوں سے کہا تھا کہ ملک نبیل کا زندہ بچ جانا ہی اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ ضرور انشاء اللہ واپس آئے گا۔

''اسے آنا بھی چاہیے سلطان خان۔ تم جانتے ہو اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہے گا۔ میں ساری زندگی چاچی زینب کو شکل نہیں

دکھا سکوں گا۔'' ملک ناصر نے جذباتی انداز میں کہا۔

''ملک صاحب میں گزشتہ بیس روز سے دوبئی میں بیٹھا ہوں۔ ''ممبئی کے انڈر ورلڈ'' سے میرا رابطہ ہے۔ میں نے انہیں اعتماد میں لے لیا ہے۔ ایک مرتبہ نبیل کی نشاندہی ہو جائے اسے انڈیا سے حفاظت کے ساتھ نکال کر لانا میری ذمہ داری ہے۔ ملک صاحب میں تو اپنے گھر والوں کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ انہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ سب قدرت کی طرف سے ہوا ہے۔ وہ تو ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ ملک نبیل جب تک واپس نہیں آتا وہ اپنے گھروں سے نکلنے کے قابل نہیں رہے۔''

ملک نذیر بڑا زمانہ شناس آدمی تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور اچھی طرح اندازہ کر سکتا تھا کہ سلطان خان ان سے نہ تو کچھ چھپا رہا ہے نہ ہی اس نے اب تک جھوٹ بولا ہے اگر وہ اب تک انہیں مل نہیں رہا تھا تو اس کی وجہ صرف شرمندگی اور ڈر تھا اور وہ نبیل کے سلسلے میں ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

''ٹھیک ہے سلطان خان ہمارے لائق جو خدمت ہے بتا...... روپے پیسے کی فکر نہ کرنا۔ جس اکاؤنٹ میں جتنا روپیہ کہو گے کل صبح جمع ہو جائے گا لیکن یہ کام ہم نے مل کر کرنا ہے۔ تم اپنے بزنس کے چیمپئن ہو اور ضرور کوئی راستہ نکال سکتے ہو۔''

ملک نذیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ملک صاحب سارا بندوبست ہو گیا ہے۔ جیسے ہی ملک نبیل سے رابطہ ہوتا ہے۔ ہم انشاء اللہ اسے مکھن سے بال کی طرح نکال لائیں گے۔ لیکن اس کا پتہ لگنا ضروری ہے۔ جس کے بعد ہی اگلا لائحہ عمل طے ہوگا۔'' سلطان خان نے انہیں یقین دلایا۔

''انشاء اللہ وہ جلد فون کرے گا۔ کیونکہ وہ انڈین پولیس کی حراست سے فرار ہو چکا ہے'' ملک ناصر نے کہہ کر سلطان خان کو چونکا دیا۔

''کیا ملک صاحب...... واقعی؟'' اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے دریافت کیا۔

''ہاں۔ سلطان خان۔ اللہ نے کرم کیا......'' اس نے ساری کہانی انہیں سنادی۔

''ملک صاحب آپ کے منہ میں گھی شکر۔ آپ نے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میرے خیال سے وہ کہیں چھپا ہوا ہے اور موقعہ ملنے پر وہ ضرور فون کرے گا۔ دراصل انڈیا سے کسی پاکستانی نمبر پر فون کرنا بہت مشکل ہے۔ خاص طور سے ممبئی والے واقعہ کے بعد سے۔ اس کے پاس ظاہر ہے آپ کا نمبر ہی ہوگا۔'' سلطان خان نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں سلطان خان۔ نمبر تو اسے گھر کے ہی یاد ہوں گے۔'' ملک ناصر بولا۔

''یار وہ بھی پولیس افسر ہے۔ معاملات کو سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے اسے بھی اندازہ ہوگا کہ فون کرنا مشکل ہے اور جب تک اسے کوئی محفوظ جگہ نہیں ملے گی وہ رابطہ نہیں کرے گا۔ لیکن اس بات کی گواہی میرا دل بھی دے رہا ہے کہ ملک نبیل اب ان وحشیوں کے ہتھے نہیں چڑھے گا۔'' ملک نذیر نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''ملک صاحب جیسے ہی آپ کا رابطہ نبیل سے ہو، اسے فوراً یہ نمبر دیں اور کہیں کہ وہ اس نمبر پر فون کرے۔ لیکن یہاں سے نہیں، پاکستان فون کرنے کے فوراً بعد اسے وہ جگہ چھوڑنی ہوگی جہاں سے وہ فون کر رہا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اسے بہر حال اس جگہ سے نکل جانا چاہیے اور میں آپ کو جو نمبر دے رہا ہوں یہ دوبئی کا نمبر ہے۔ محفوظ نمبر ہے۔ انڈیا سے کسی نے اسے چیک نہیں کرنا۔ جیسے ہی اس نمبر سے اس کا رابطہ ہوا۔ چوبیس گھنٹے میں ہمارے بندے اسے حفاظت میں لے لیں گے جس کے بعد جلد ہی وہ محفوظ طریقے سے انشاء اللہ پاکستان پہنچ جائے گا۔''

سلطان خان کی سیکرٹری بڑی سمجھدار اور زمانہ شناس تھی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی بڑے مگر مچھ ہیں جن کے سامنے سلطان خان جیسے بڑے نام والے انسانی اسمگلر نے بھی دم سادھ لیا تھا اس نے چند منٹ میں ہی شاندار لوازمات کا بندوبست کر لیا تھا جو اب ملک صاحبان کے ''ناں ناں'' کرنے کے باوجود ان کے سامنے ایک دوسرے خدمتگار کی مدد سے سجا رہی تھی۔

''ملک صاحب! اس طرح مجھے بھی دھڑکا لگا رہے گا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ پلیز!'' سلطان خان نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ دونوں مسکرا دیے۔

سلطان خان نے ضد کر کے انہیں رات کا کھانا گھر کھانے پر رضامند کیا تھا۔ احتیاط کے پیش نظر ملک نذیر نے تو پھر کسی روز اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ اس کے اشارے پر ملک ناصر نے ہامی بھر لی تھی۔ انہیں اگلے مراحل میں بہر حال سلطان خان کا بھرپور تعاون درکار تھا جس کے بعد ہی ملک ناصر اپنی چچی زینب کے سامنے سرخرو ہو سکتا تھا۔

ملک ناصر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اس کے گھر کی طرف گیا تھا۔ دونوں نے الگ الگ گاڑیوں میں سفر کیا تھا۔ سلطان خان کی بیوی کو جب علم ہوا کہ ملک ناصر ان کے گھر آ گیا ہے تو خوشی سے اس کے لیے جذبات پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ ملک خاندان سے ان کے بزرگوں کے زمانے سے بہت اچھے تعلقات تھے اس کا بچپن اور لڑکپن بھی ملکوں کی حویلی میں ہی گزرا تھا۔ ملک ناصر کی دونوں بہنیں اس کی کلاس فیلو اور اچھی سہیلیاں تھیں۔ اب بھی وہ جب بھی پنجاب جاتی انہیں ملے بغیر نہیں آتی تھی۔

اسے جب سے یہ علم ہوا تھا کہ ملک ناصر اس کے خاوند سے ناراض ہو گیا ہے اس بے چاری کی تو جان پر بن آئی تھی گو کہ سلطان خان نے اسے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی کیونکہ وہ اپنے کاروباری معاملات میں کبھی اپنے خاندان کے لوگوں کو پریشان نہیں کرتا تھا لیکن یہ بات وہ جانتی تھی کہ ملک ناصر نے اس کے والد کو اپنے ڈیرے پر بلایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

اس نے جی جان سے ملک ناصر کے لیے کھانا تیار کروایا تھا اور اسے رات گھر گزارنے کے لیے بہت ضد کی تھی۔ ملک ناصر کی مجبوری تھی اس نے جان چھڑانے کے لیے بالآخر اپنی روایات کا سہارا لیا۔ ''بہن میرے! تم جانتی ہو کہ ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کے گھر قیام نہیں کیا کرتے۔ یہ تو سلطان کی ضد تھی کہ اسی طرح منہ اٹھا کر خالی ہاتھ چلا آیا ہوں...... یہ لے یہ رکھ لے۔ اپنی مرضی کی شاپنگ کر لینا۔'' اس نے پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ زبردستی اس کی جھولی میں ڈال دیے اور سلطان خان سے گرمجوشی سے مل کر باہر آ گیا۔

''سلطان خان ناخن سے ماس الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات تو بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ہمارا تیرا جو تعلق ہے وہ بہت دور تک جاتا ہے۔ اس وقت کو کبھی نہ بھلانا۔'' باہر نکلتے ہوئے اس نے سلطان خان سے کہا تھا۔

''ملک جی! میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے بھاگا تھا نہ اب بھاگوں گا۔ میں کل ہی دوبئی جا رہا ہوں۔ جیسے ہی آپ کو اطلاع یا فون موصول ہو، آپ نے مجھے فون کرنا ہے۔ میں نے اپنے تینوں اہم نمبرز آپ کو دے دیے ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ میں پنجاب میں اس روز آپ

کو اپنی شکل دکھاؤں گا جب ملک نبیل آپ کی تحویل میں موجود ہوگا۔'' سلطان خان نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''چنگا فیر...... اللہ بیلی۔''

ملک ناصر اس سے گلے مل کر رخصت ہوگیا۔

سلطان خان نے اسے خود ملک نذیر کے ڈیرے تک پہنچانے کی درخواست کی تھی لیکن ملک ناصر نے اسے سختی سے روک دیا تھا۔ ملک نذیر کا ڈرائیور اور محافظ اسے لے کر واپس ملک نذیر کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا، جہاں ملک نذیر بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

اگلے روز رات کی فلائٹ سے وہ واپس لوٹ آیا۔ وہ اس اعتماد کے ساتھ واپس آیا تھا کہ اب جلد ہی انشاء اللہ ملک نبیل اس کے ساتھ موجود ہوگا۔ یہ خوشخبری اس نے سب سے پہلے چاچی زینب کو سنائی تھی۔ جس نے فوراً شکرانے کے دو نفل ادا کیے تھے۔

☆☆☆

کامنی حیرت زدہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''اوہو بھئی اس میں پریشان یا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ میں زمین پر ہی سونے کا عادی ہوں۔ تم لیٹو ناں...... آرام کرو۔ تین چار دن سے تم بے آرام ہو۔'' نبیل نے جواب دیا۔

کمرے میں آنے کے بعد انہوں نے باری باری غسل کیا جس کے بعد کامنی نے کمرے میں کھانا منگوایا اور کھانا کھانے کے بعد اس نے کمرے کے باہر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا سٹیکر لگا دیا جس کے بعد وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔

یہ ڈبل بیڈ روم تھا اور کامنی اس معاشرے میں رہتے ہوئے اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ نبیل اس کے ساتھ بیڈ پر لیٹنے سے انکار کر دے گا۔

''تم واقعی وہی ہو جو مجھے بتایا ہے یا......'' کامنی کے منہ سے بے اختیار یہ ادھورا جملہ نکلا تھا۔

''نہیں...... دراصل میں مریخ سے آیا ہوں۔ میں نے یہاں دنیا میں آنے کے لیے یہ روپ دھارن کیا ہے۔ بھئی تم اس طرح میری طرف کیا دیکھ رہی ہو میرے سر پر کیا سینگ نکل آئے ہیں۔'' اپنی دانست میں نبیل نے بات کو مزاح میں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن کامنی ابھی تک سنجیدہ تھی۔

''یا تو تم واقعی کسی اور دنیا کی مخلوق ہو...... یا پھر کوئی......'' کامنی نے بات پھر ادھوری چھوڑ دی اور دھم سے بستر پر گر گئی۔

اس دوران ملک نبیل ایک کمبل اور چادر اور سرہانہ لے کر فرش پر باقاعدہ بستر بچھا چکا تھا۔ لیٹتے ہی اس نے آنکھیں موند لیں اور اگلے چند منٹ میں وہ نیند کی دیوی کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ اسے اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ نبیل کے سونے کے بعد کافی دیر تک کامنی جاگتی رہی۔ اسے نیند ضرور آئی ہوئی تھی لیکن ابھی تک وہ نبیل کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔ اس دھرتی پر کوئی ایسا جرائم پیشہ شخص بھی موجود ہے جو اتنے شاندار مواقع اور آفرز کے باوجود اس کے ساتھ ایک بیڈ پر لیٹنے سے بھی انکاری ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی اپنے ہم سفر کو انسان سمجھے یا دیوتا۔ یہی سوچتی بالآخر وہ نیند کی آغوش میں جا سمائی۔

کامنی کی آنکھ کھلی تو اسے واش روم سے آوازیں آ رہی تھیں شاید نبیل تازہ دم ہو رہا تھا پھر نبیل تولیے سے منہ صاف کرتا باہر آ گیا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی کو خاصا مختصر کر لیا تھا اور پہلے سے کہیں زیادہ روپ اس پر سما گیا تھا۔

''اچھی نیند آئی ناں...... چلو منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جاؤ۔ مجھے تو پھر بھوک لگنے لگی ہے۔'' اس نے کامنی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کہا۔

کامنی نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتی ہوئی واش روم کی طرف چلی گئی۔

نبیل کو پہلی مرتبہ کامنی پہلے سے بہت زیادہ مختلف دکھائی دی۔ پہلے کی طرح وہ اپنے جسم سے بے نیاز نہیں تھی۔ اور اس مرتبہ اس نے جن نظروں سے نبیل کی طرف دیکھا تھا ان میں نبیل کے لیے عقیدت اور اپنے لیے شرم بھی موجود تھی۔ ابھی تک وہ اس جذباتی حادثے سے سنبھل نہیں پائی تھی جس سے نبیل نے فرش میں الگ لیٹ کر اسے دوچار کیا تھا۔

نبیل کمرے میں دھری آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو کر اگلا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔ اس کے لیے سب سے ضروری کام اپنے گھر سے رابطہ تھا۔ ایک مرتبہ اس کا رابطہ اپنے گھر سے ہو جاتا تو اس کے آدھے مسائل حل ہو جاتے۔ اتفاق سے اسے اپنے عزیز و اقارب کے تین چار فون نمبروں کے علاوہ کوئی فون نمبر زبانی یاد نہیں تھا اور یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جس ملک میں وہ موجود ہے وہاں سے ایک مفرور کا پاکستان میں رابطہ کرنا بین الاقوامی سرحد عبور کرنے سے کم خطرناک نہیں ہے۔ اسے اچھی طرح اس بات کا اندازہ تھا کہ جیسے ہی انڈین ٹیلی فونک گیٹ وے سے کوئی کال پاکستان کی طرف جائے گی بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس کے کان کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کے پاس یہاں کوئی انٹرنیشنل لائن والا فون نہیں تھا اگر وہ کوئی موبائل فون بھی کسی چکر سے خرید لیں تو بھی اس کے لیے پاکستان فون کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے بہرحال پی سی او تک رسائی حاصل کرنا تھی۔ یہ معلومات اس نے نہایت چالاکی سے بڑے بھولے پن سے کامنی سے حاصل کر لی تھیں اس نے کامنی کو ایک لمبی کہانی سناتے ہوئے کہا تھا کہ دوبئی میں ان کے پارٹنر پاکستانی سمگلر ہیں جن کا آنا جانا ان کے ہاں لگا رہتا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ ان تک اپنی خبر پہنچا دے۔ کامنی نے اسے بتایا تھا کہ اگر دوبئی میں فون کرنا ہے تو کوئی پرابلم نہیں لیکن پاکستان میں فون کرنا خود کو مصیبت میں ڈالنے والی بات ہے۔ کچھ بھی ممکن ہے۔

اس کے بعد ہی اس نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ وہ کامنی کے علم میں لائے بغیر کسی پی سی او سے پاکستان فون کر لے۔ اس نے راستے میں انٹرنیشنل کال کے لیے تین چار پی سی او بھی دیکھے تھے۔ ہوٹل میں بھی یہ سہولت حاصل تھی لیکن وہ یہاں کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

نبیل کو ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناطے اس بات کا بھی علم تھا کہ اس کی درجنوں تصاویر جو دوران تفتیش بنائی گئی ہیں ''را'' کے پاس محفوظ ہوں گی اور انہیں اس بات کا بھی علم ہو گیا ہوگا کہ وہ ٹرین سے زندہ سلامت نکل کر فرار ہو گیا ہے جس کے بعد انہوں نے اس کے فرار کے راستوں پر بھی نظر رکھی ہوگی۔ کیونکہ اب اس کا فرار ان لوگوں کی ''پرسٹیج'' کا مسئلہ بھی بن چکا تھا۔

وہ جلد از جلد اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا لیکن کسی بے خبری سے بنے بنائے کھیل کو بگاڑنے کا خطرہ مول لینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

کامنی اس کے سامنے موجود تھی۔

''تھکاوٹ کچھ اتری کیا؟'' اس نے کامنی سے بے تکلفی سے پوچھا۔

''ہاں میں تو بالکل نارمل محسوس کر رہی ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟'' اس نے پہلی مرتبہ اس کا نام لیے بغیر آپ کہا تو نبیل چونکا۔

"میں ...... میں ...... دیوی جی۔ یہ کیا آپ نے لکھنوی انداز اپنا لیا۔ پلیز میرے ساتھ نارمل ہی رہیں۔"

کامنی صرف مسکرا کر رہ گئی۔

"بھوک لگ رہی تھی تمہیں؟" اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہم نے کھانا کھایا ہی نہیں تھا۔" نبیل نے اس کی طرف مسکراہٹ اچھالی۔ "دراصل تھکاوٹ بہت تھی نا اور تم چھ گھنٹے مسلسل سوتے رہے ہو۔ جانتے ہو اب کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"کیا؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"رات کے دس بج رہے ہیں۔" کامنی نے اسے مطلع کیا۔

اس نے بازار سے ایک گھڑی خرید کر اپنے ہاتھ پر باندھ لی تھی ایک نبیل کے لیے خریدی تھی جو اس نے باندھنے کا تکلف نہیں کیا تھا۔

"چلو باہر کہیں چل کر کچھ کھا پی لیں۔" نبیل نے رائے پیش کی۔

"کیوں نہیں۔ آؤ چلیں۔" کامنی نے اپنی شکل سنگھار میز پر لگے شیشے میں دیکھتے ہوئے خود کو سیٹ کیا اور دونوں کمرے کو لاک کر کے باہر نکل گئے۔ کمرے کی چابی انہوں نے کاؤنٹر پر جمع کروادی تھی اور اب ہوٹل کے ساتھ بازار کا رخ کیا تھا۔ نبیل کو امید تھی کہ یہاں اسے شاید فون کرنے کا موقع مل جائے۔

آج یہاں شاید کوئی مقامی ہندو تہوار تھا کیونکہ بازار میں چاروں طرف مورتیاں سجائی گئی تھیں۔ اور لوگوں کی بڑی تعداد بھی وہاں گھومتی دکھائی دے رہی تھی۔ نبیل نے اندازہ کر لیا تھا کہ کامنی یہاں پہلے آچکی ہے کیونکہ اس مرتبہ بھی وہ سیدھے اس کو ایک ڈھابے پر لے گئی تھی جہاں خریداروں کا رش دیکھ کر نبیل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی عام ڈھابہ نہیں ہے۔

انہیں ایک کونے میں خالی چار پائی بیٹھنے کو مل گئی۔ یہاں کی روایت تھی کہ یہاں لوگ کھانا چار پائیوں پر بیٹھ کر یا تو درمیان میں رکھ کر کھاتے تھے یا پھر چار پائی سے لگی لکڑی کے میزوں کا استعمال کرتے تھے۔ کھانے کا آرڈر دونوں نے مل کر دیا تھا۔ اس لیے نبیل کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ ڈھابے کے ملازم نے یہاں موجود کھانوں کے تیزی سے نام لیے تھے ان میں سے جو دو تین نام اسے سمجھ آئے اس نے وہی لے دیے۔

کامنی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور گردن جھکالی۔ تھوڑی دیر بعد ہوٹل کا ملازم کھانا ان کے سامنے دھری میز پر سجا کر چلا گیا۔

نبیل نے محسوس کیا تھا کہ کامنی جب سے سو کر اٹھی تھی کچھ چپ چپ دکھائی دے رہی تھی۔ اسے ابھی تک اس خاموشی کی وجہ سمجھ نہیں آرہی تھی اس بات کا تو اسے گمان ہی نہیں تھا کہ کامنی نے ابھی تک اس کے فرش پر سونے کے جذباتی حادثے کو ہضم نہیں کیا اور وہ کسی الجھن کا شکار ہے۔ بالآخر وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔

"بہت بری ہوں نا میں منجیت۔"

اس نے اچانک ہی نبیل کو مخاطب کیا تو وہ چونک اٹھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہہ رہی ہو تم؟" نبیل کو واقعی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ بیڈ پر......"

"اوہ مائی گاڈ۔" نبیل کو اب اس کے موڈ کی ساری سمجھ آ گئی تھی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ پاکستانی نہیں بھارتی معاشرے میں ہے اور یہاں کی قدریں وہاں سے بالکل مختلف ہیں۔

"کیسی بات کر رہی ہو تم کامنی۔ تم نے ایسا سوچا ہی کیوں۔ جانتی ہو کامنی میں فرش پر کیوں لیٹا؟ جاننا چاہو گی؟" اس نے اچانک ہی ڈرامائی انداز میں کامنی کی طرف دیکھا جو اس کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اس لیے کامنی کہ میں خود کو ابھی تمہارے لائق نہیں سمجھتا۔ ٹھیک ہے ایک حادثہ تمہیں بچاؤ دیوی تک لے گیا تھا لیکن یہ تو تقدیر کا کھیل ہے کامنی۔ میں بھی تو ایسے ہی حادثے کا شکار ہو کر تمہارے ساتھ بھٹک رہا ہوں کامنی۔ یہ تو سب وقت کی بات ہے۔ میں جب خود کو اس لائق سمجھوں گا تو تمہیں اپنا لوں گا۔ پلیز اس سے آگے نہ کوئی سوال کرنا نہ اس بات کو زندگی میں کبھی دہرانا کامنی! میں نے یہ پیشہ اپنی مرضی سے اختیار نہیں کیا۔ مجھے تو مجبوراً اس میں آنا پڑا اور کیا کرتا میں اس گورکھ دھندے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہارا سہارا درکار ہے۔ تم میری مدد کر رہی ہو کامنی میں تمہارا احسان مند ہوں۔"

اس نے جو جذباتی تقریر کامنی کے سامنے کر دی تھی اس پر دل ہی دل میں خود کو داد دے رہا تھا۔ خدا جانے یہ الفاظ کہاں سے اس کی زبان پر آرہے تھے لیکن اسے یقین ہونے لگا کہ حالات و واقعات نے اسے ایک اچھا اداکار ضرور بنا دیا ہے اور اب وہ آسانی سے کافی عرصے تک کامنی کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔ کم از کم تب تک جب تک کہ اس کا اگلا رابطہ نہ ہو جائے لیکن اچانک ایک خیال اس کے راستے کی دیوار بن گیا۔

کیا وہ کامنی کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ جائے گا؟

نہیں۔ اس نے خود سے کیا عہد دہرایا۔

کامنی نے [illegible] صرف نظر بھر [illegible] تو نبیل کو احساس ہوا کہ اس نے اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کو زبردستی روکا ہوا ہے جو اس کے گالوں پر کسی بھی لمحے بہہ سکتے تھے۔

"پلیز کامنی نارمل ہو جاؤ۔ اس موضوع پر ہم پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ ابھی کھانا کھا لو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دال کی کٹوری کامنی کی طرف بڑھائی جس نے شاید اس کا دل رکھنے کے لیے ایک لقمہ توڑ کر منہ میں ڈالا اور آہستہ آہستہ چبانے لگی۔ نبیل ہونٹوں پر مسکراہٹ جمائے اس کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا شاید وہ اس طرح اسے نارمل کرنا چاہتا تھا جلد ہی اس کی یہ کوشش کامیاب ہو گئی۔ جب کامنی بے اختیار مسکرا دی لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے گالوں پر آنسو بھی گر رہے تھے۔ آنسوؤں سے بھیگی اس مسکراہٹ نے اس کے سانولے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کی گہری کالی آنکھوں کا سحر دو چند ہو گیا تھا اور نبیل کو اپنے خون کا خمیر بدلنے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے دوسری مرتبہ کامنی کی موجودگی میں خود کو ایسا ابنارمل محسوس کیا تھا لیکن جلد ہی وہ نارمل ہو گیا۔ اس کے گرد و پیش تلخ سچائیاں پھیلی ہوئی تھیں جن سے دامن چھڑانا حالات سے فرار اس کے لیے ناممکن تھا۔

اسے اچانک ہی یاد آ گیا تھا کہ وہ ہوٹل سے اس عزم کے ساتھ نکلا ہے کہ پاکستان کسی پی سی او سے فون کر کے اگلا لائحہ عمل طے کرے گا۔

اچانک ہی کامنی کے چہرے کی کیفیات بدلنے لگیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کامنی کسی بات سے خوفزدہ ہو گئی ہے۔

"کیا بات ہے کامنی ... خیریت سے نا؟" اس نے کامنی کی طرف دیکھا جو پیچھے دائیں طرف دیکھ رہی تھی۔

''منجیت جلدی کرو۔ چلو یہاں سے نکلیں۔ اس نے اچانک ہی گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔''

''مگر کیا ہوا؟......''

''پلیز منجیت جلدی کرو۔ یہاں سے باہر جا کر بات کرتے ہیں۔'' اس نے نبیل کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ دونوں ڈھابے کے کاؤنٹر پر پہنچے جہاں ایک موٹا سکھ گاہکوں سے پیسے سمیٹ رہا تھا۔ انہیں اٹھتے دیکھ کر لڑکا بھی بھاگ کر ان کے نزدیک آگیا۔ اس نے تیز تیز بولتے ہوئے کچھ کہا جیسے جیسے وہ بول رہا تھا موٹے سکھ کی انگلیاں سامنے رکھے کیلکولیٹر پر چل رہی تھیں۔

''بہتر روپے ہوگئے مہاراج جی۔'' اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر کہا جس نے فوراً ہی سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔

روایت کے مطابق ڈھابے کے مالک نے باقی پیسے ایک تانبے کی پلیٹ میں رکھ دیے۔ نبیل نے دس روپے لڑکے کی ٹپ چھوڑ کر باقی پیسے اٹھا لیے اور کامنی کی طرف متوجہ ہوا جو گردن گھما کر مسلسل اس طرف دیکھ رہی تھی۔

نبیل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف مخاطب کیا اور اسی طرح بغیر رکے درمیان سے راستہ بناتا اسے ڈھابے سے باہر لے آیا۔

''کیا ہوا کامنی...... کیا بات تھی؟'' اس نے کامنی کو قدرے نارمل پا کر پوچھا۔

''وہ کلونت تھا وہاں۔'' کامنی نے صرف اتنا ہی کہا۔

''کلونت؟ کون کلونت؟'' نبیل نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی یہاں سے نکلو منجیت ہوٹل چل کر سب کچھ بتاتی ہوں۔'' کامنی ابھی تک گھبرائی ہوئی تھی۔ نبیل نے اس سے کچھ اور پوچھنا مناسب نہ جانا۔ اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جس نے جنگل کی انتہائی خطرناک راتیں اس کے ساتھ بسر کی تھیں جو چھلوا ڈاکو کے ساتھی کو قتل کر کے بھاگ آئی تھی اور جس نے راستے میں کہیں ایک لمحے کے لیے بھی بزدلی کا تاثر نہیں دیا تھا۔ اب کسی ''کلونت'' کو دیکھ کر اتنا زیادہ کیوں گھبرا گئی تھی۔ ضرور یہ کوئی بہت خطرناک شخص ہے...... اس نے سوچا ضرور یہ کامنی کو پہچانتا ہوگا۔ لیکن وہ بھی تو کامنی کے ساتھ ہے۔ اگر یہ شخص کامنی کے لیے اتنا خطرناک ہے تو اس کے لیے کتنا زیادہ خطرناک ہو سکتا ہے۔

اس نے سوچا تو خوف کی ایک لہر اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ پلیز نارمل رہو۔ چلو چلو ہم ہوٹل ہی چلتے ہیں۔'' اس نے کامنی کا بازو پھر تھام لیا اور مذہبی تہوار کی بھیڑ میں سے تیزی سے راستہ بناتے ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اگلے دس پندرہ منٹ کے بعد وہ ہوٹل کے سامنے موجود تھے جہاں ایک طوفان بدتمیزی ان کا منتظر تھا۔ یہ شاید کوئی مذہبی جلوس تھا۔ بڑا سا ''ہنومان'' ایک گاڑی کی چھت پر بھی رکھا تھا جس کے آگے پیچھے سینکڑوں کی تعداد میں لوگ زور زور سے مذہبی نعرے بلند کر رہے تھے۔ دونوں بمشکل ہوٹل کے کاؤنٹر تک پہنچے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر سے انہوں نے کمرے کی چابی لی اور گراؤنڈ فلور پر ہی موجود اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے کامنی نے میز پر رکھا ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا ٹیگ دروازے کے باہری ہینڈل میں لٹکا دیا۔

''بیٹھ جاؤ۔ نارمل ہو جاؤ۔'' اس نے کامنی سے کچھ کہنے سے پہلے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ فریج سے پانی نکال کر اسے پلایا اور اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''میں نے وہاں ''کلونت'' کو دیکھا ہے۔ کلونت سی آئی ڈی کا انسپکٹر ہے لیکن چھلوا کا تنخواہ دار کتا تھا۔ اس کا چھلوا کے ہاں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ چھلوا اس کے لیے خصوصی شراب، شباب کا اہتمام رکھتی تھی۔ آخری دنوں میں اس نے مجھ سے بھی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چھلوا نے اس کی اجازت نہ دی۔ جس کے بعد اس کا تبادلہ وہاں سے ہو گیا۔ اس نے آخری ملاقات میں مجھے دھمکیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اچانک ہی وہ کھڑی ہوگئی جس پر اپنی دانست میں اسے حوصلہ دینے کے لیے نبیل کو بھی کھڑے ہونا پڑا۔ لیکن اگلے ہی لمحے کامنی اس کے سینے سے لگ کر تقریباً رونے لگی۔

نبیل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے وہ سوائے اس کی کمر تھپتھپا کر اسے نارمل رہنے کی تلقین کے اور کیا کر سکتا تھا۔ کامنی نارمل ہو رہی تھی پھر وہ اس سے الگ ہوئی۔

''بہت حرامی اور گندہ شخص ہے یہ۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے چھلوا کی لائی ہوئی ایک عورت کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا کر مار ڈالا تھا غالباً اس نے اس کی کسی انتہائی غلیظ بات کو ماننے سے انکار کیا تھا۔ چھلوا اپنے دشمنوں کو مروانے کے لیے اسے ہی استعمال کیا کرتی تھی۔ تشدد کر کے ملزمان کو ہلاک کرنے میں یہ درندہ شہرت رکھتا ہے۔''

''مطمئن رہو کامنی! تمہاری حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اگر یہ تم تک پہنچ ہی گیا تو اس کی تمہارے ساتھ یہ زندگی کی آخری ملاقات ہوگی۔''

اس نے کچھ ایسے پریقین لہجے میں کہا کہ کامنی کو یقین آگیا۔

''میرے خیال سے ہم صبح ہی یہاں سے نکل جائیں۔ کسی اور شہر میں بیٹھ کر اگلا پلان بناتے ہیں۔ نجانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں تم پر بوجھ بن رہی ہوں۔ میری وجہ سے تم بھی......''

''نہیں کامنی پلیز...... دوبارہ تم کبھی یہ بات نہیں کہو گی۔ یاد رکھنا دوبارہ کبھی نہیں۔'' اس نے کامنی کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا اور کامنی کو اپنائیت کے اس احساس نے تمام خطروں سے بے نیاز کر دیا۔

انہوں نے کمرے میں لگے ٹی وی کا سوئچ آن کر دیا تھا اور ابھی ایک پروگرام دیکھنا شروع ہی کیا تھا جب اچانک کمرے کے باہر دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔

کامنی نے دروازے کے باہر ''ڈونٹ ڈسٹرب'' کا ٹیگ لٹکایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ دروازے پر دستک دینے والا ہوٹل کا کوئی ملازم نہیں۔ اگر ان سے کمرے میں بات کرنا ناگزیر بھی ہوتی تو وہ کمرے میں رکھے فون پر کرتے کیونکہ کمرے کے باہر ایسا سٹکر لگنے کے بعد ہوٹل انتظامیہ سمجھ جاتی ہے کہ مسافر آرام کر رہا ہے اور وہ اس کے آرام میں مخل نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟ نبیل کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کامنی سے پہلے اس کے دماغ میں یہ بات آگئی تھی کہ یہ کوئی بھی ہو ان کا دوست نہیں ہو سکتا۔

کامنی کو تو اس سے بھی زیادہ صورتحال کی سنگینی کا احساس تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو اس کا رنگ ہی اڑ گیا لیکن نبیل کے اعصاب قائم اور بحال تھے اور وہ اس طرح آسانی سے لڑائی ہارنے والا نہیں تھا۔ اس نے ہاتھوں کے اشارے سے کامنی کو نارمل رہنے اور دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور جتایا کہ وہ دروازے کے ساتھ

دوسری طرف اس پوزیشن میں کھڑا ہے کہ آنے والا اس کی زد میں آ جائے گا۔

کامنی نے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھتی۔ نبیل کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بیگ میں سے پستول نکال سکے یا اس خنجر تک رسائی حاصل کر لے جو ابھی تک اس کی پاس محفوظ تھا۔ اس نے پھرتی سے ٹی وی کے ساتھ دھرا پیتل کا وہ بھاری سا کسی دیوتا کا بت اٹھا لیا جس کا وزن تین چار کلو سے کم نہیں تھا اور خود ایسی پوزیشن میں ہو گیا کہ اندر آنے والے کی نظریں صرف کامنی کو دیکھ سکیں۔

کامنی نے دروازہ کھولا اور خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی کیونکہ دونوں کے اندازے کے مطابق وہ کلونت ہی تھا جس نے ہاتھ میں پستول پکڑ رکھا تھا۔ غالباً وہ ان کا تعاقب کرتا یہاں تک آیا تھا کیونکہ وہ سی آئی ڈی انسپکٹر تھا اس لیے دونوں کو اس نے بالکل شک نہیں ہونے دیا تھا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے دونوں کے کمرے میں پہنچ کر نارمل ہونے کا انتظار کیا تھا اور اب اچانک اعصابی دھماکے کی طرح ان کے سر پر پہنچا تھا۔

اس نے کامنی کی طرف پستول تانے اسے گالی دے کر مخاطب کیا "سالی! تم کیا سمجھتی تھی کہ مجھ سے بچ جاؤ گی۔ میں تو نجانے کب سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے تو چھلو کو بھی تیرے لیے کہہ دیا تھا لیکن اس نے بتایا کہ تو وہاں سے اپنے کسی یار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ شکار خود ہی شکاری تک پہنچ گیا۔ کدھر ہے تیرا وہ یار جس کے ساتھ باہر گھوم رہی تھی۔" اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کلونت نے ٹھیک ٹھاک شراب پی رکھی ہے اور سیدھا ان کی طرف آ گیا ہے۔

"ادھر ہوں۔" کلونت کی بات ختم ہوتے ہی اس کی عقب سے نبیل نے کہا اور جیسے ہی شراب کے نشے میں نیم مدہوش کلونت اس کی طرف گھوما اپنے ہاتھ میں پکڑا کسی دیوتا کا چار کلو بھاری پیتل کا مجسمہ نبیل نے پوری قوت سے اس طرح اس کی کنپٹی پر مارا کہ اسے ایک لمحے کے لیے سنبھلنے کی مہلت نہ مل سکی اور وہ پستول سمیت دھڑام سے زمین پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔

"دروازے کو لاک کر دو۔" اس نے کامنی سے کہا جس نے اگلے ہی لمحے نہ صرف دروازہ لاک کر دیا بلکہ اس کا پستول بھی اٹھا کر پھرتی سے نبیل کو تھما دیا۔

نبیل حیران رہ گیا۔ پستول لاک تھا۔ وہ گدھا کچھ زیادہ ہی اعتماد دکھائی دے رہا تھا جو اس طرح اندر چلا آیا۔

کلونت کی کنپٹی سے فوارے کی طرح بہنے والا خون قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ہوش میں تھا لیکن شراب کے نشے اور کنپٹی پر لگی ضرب کی شدت سے ڈھنگ سے بول بھی نہیں سکتا تھا البتہ مغلظات جیسے تیسے بک رہا تھا۔

"مار ڈالو اسے نبیت۔ مار ڈالو۔ پستول مجھے دو مجھے میں خود اپنے ہاتھ سے اسے ....." غصے اور خوف کے ملے جلے لہجے میں کامنی نے کہنا چاہا۔

"نو ... مرے گا تو یہ ضرور .... ورنہ ہم مارے جائیں گے لیکن پستول کی گولی سے نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے نبیل نے ایک طرف رکھا کمبل اور چادر اس پر پھینک دی جس کے بعد اس کے منہ پر سرہانہ رکھ کر اس پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ کلونت نے دو چار ہاتھ پاؤں مارے اور ٹھنڈا ہو گیا۔ نبیل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن کامنی نے اس کی موت کی تصدیق ضروری جانی اور اس کو اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھنے کے بعد اچانک تھرا کر پیچھے ہٹی۔

"یہ یہ تو واقعی مر گیا۔" اس نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"اچھا تمہارا کیا خیال تھا ابھی زندہ ہے؟" نبیل نے اس طرح مزاحیہ انداز سے کہا کہ کامنی کو اپنے حواس پر قابو پانا ہی پڑا۔

"اب کیا کریں؟" اچانک ہی کامنی کو اگلا سوال یاد آیا۔

"ویسے تو اس کمرے کو آگ لگا کر اس کا "کریا کرم" بھی کیا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال سے یہ کام کسی اور کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم اب یہاں سے نکلیں۔"

وہ بدستور مسکرا رہا تھا تا کہ کامنی نارمل ہو جائے۔

"مگر کیسے؟ باہر تو......" کامنی نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ اسے اچانک خیال آ گیا تھا کہ اس نے غلط سوال پوچھ لیا ہے۔

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نبیل نے تیزی سے باہر رکھی اپنی اور کامنی کی چیزیں بیگ میں ڈالنی شروع کر دیں۔ باہر شور میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا اچانک کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے پٹاخوں نے ماحول کو دہلا کر رکھ دیا۔

نبیل نے بیگ بیڈ پر رکھا اور کمرے کی اس کھڑکی کی طرف گیا جو ہوٹل کے پچھلی طرف لان میں کھلتی تھی۔ اس نے کامنی کو نزدیک بلا لیا۔ باہر روشنی میں ماحول کا جائزہ لیا اس طرف دور دور تک میدان خالی دکھائی دے رہا تھا۔ کھڑکی کے نزدیک اس نے کامنی کو کھڑے کرنے کے بعد کھڑکی کے ساتھ لگے سوئچ بورڈ سے کمرے کی لائٹ آف کی کھڑکی کھول کر باہر لگے بڑے سے شیشے پر بیڈ کا دوسرا سرہانہ جمایا اور اس پر زوردار کہنی ماری لیکن شیشہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

کامنی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"نو پرابلم" یہ کہتے ہوئے اس نے دوبارہ سرہانہ اٹھایا اور کلونت کے پستول کو فائرنگ پوزیشن میں کر کے اس کے ساتھ جما دیا اور پٹاخوں کی زوردار آواز میں دو تین فائر کر دیے۔ کامنی کو بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ آواز اندر سے آئی ہے یا باہر سے۔ اگلے مرحلے میں اس نے سرہانے کو ٹوٹے ہوئے شیشے کے ساتھ رکھتے ہوئے اس پر زوردار ٹھوکر ماری اس طرح شیشہ ٹوٹ کر باہر گر گیا کھڑکی کے ساتھ اس نے شیشہ توڑنے کی جگہ پر کمبل بچھا دیا اور پہلے کامنی کو نیچے اتارا پھر بیگ نیچے پھینکا اور آخر میں خود باہر آ گیا۔

"ویل ڈن۔" کامنی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"صبح تک نہ کوئی کمرے میں جائے گا نہ ہی اس طرف آئے گا اور تب تک ہم ضرور کسی محفوظ ٹھکانے تک پہنچ جائیں گے۔ یہ بتاؤ یہاں سے ریلوے سٹیشن کتنا دور ہے؟"

اس نے چلتے ہوئے کامنی سے دریافت کیا۔

"قریباً بیس سے پچیس منٹ پیدل راستہ ہے۔" کامنی نے اندازے سے کہا۔

"زبردست اس کا مطلب ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ چلو۔" اس نے کامنی کا ہاتھ پکڑا اور دونوں تیزی سے اس راستے پر چل دیے جو قدرے ویران دکھائی دے رہا تھا۔ اس راستے کا اختتام بازار کے پچھلی طرف ہوا اور اب وہ آبادی کے درمیان سفر کر رہے تھے لیکن ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے شہر کو کسی جن نے اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ غالباً اس چھوٹے سے شہر کی ساری آبادی ان مذہبی جلوسوں میں شامل تھی جو ہنومان جی کی خاص پوجا کے حوالے سے نکلے ہوئے تھے۔ اگر کہیں کوئی اکا دکا شخص دکھائی بھی دیا تو وہ انہیں نظر انداز کر کے گزر جاتا۔ غالباً یہی سمجھتا ہو گا کہ یہ کسی کے گھر مہمان آئے ہوئے ہیں۔

کامنی اسے مختلف تقریباً ویران راستوں پر گھماتی ہوئی اب ریلوے سٹیشن پر لے ہی آئی تھی۔ جو خلاف توقع خاصا آباد دکھائی دے رہا تھا یہاں ایک خوشگوار حیرت ان کی منتظر تھی جب انہیں علم ہوا کہ اجمیر شریف میں ''اُتسو'' (عرس) چل رہا ہے اور اگلے دس پندرہ منٹ بعد یہاں جو ٹرین رکے گی وہ اجمیر شریف ہی جائے گی۔

یہ سب وہ ہندو اور سکھ تھے جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے عرس پر جا رہے تھے ملک نبیل کو اندازہ ہوا کہ مسلمانوں سے زیادہ ہندوں اور سکھ خواجہ غریب نوازؒ کے عرس پر شرکت کرتے تھے۔

کھڑکی سے نبیل نے دو ٹکٹ خریدے اور تھوڑی دیر بعد وہ جس پسنجر ٹرین میں سوار ہوئے یہ غالباً کوئی خصوصی ٹرین تھی جس میں مسلمان ہندو سکھ اور دوسرے مذاہب کے لوگ سوار تھے اور ان سب کی منزل اجمیر شریف تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بھی اس ہجوم کا حصہ بنے اگلی منزل کی طرف گامزن تھے۔ نبیل نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دے گا۔ وہاں یقیناً پاکستان سے بھی مسلمان آئے ہوں گے اور سارے ہندوستان سے بھی۔ اس دوران اس کا پاکستان ٹیلی فون کرنے کا داؤ آسانی سے لگ سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں سے تو اکثر مسلمان پاکستان فون کرتے ہی ہوں گے دونوں نے قریباً اونگھتے ہوئے سفر طے کیا تھا۔ دونوں کو اپنے سامنے برتھ پر موجود ہندو فیملی کو مکمل انٹرویو دینا پڑا تھا جس میں کامنی نے بتایا تھا کہ انہوں نے تین سال پہلے شادی کی تھی۔ بھگوان کا دیا سب کچھ موجود ہے لیکن اولاد نہیں اور ان کے ''سائیں بابا'' نے کہا ہے کہ خواجہ پیا کے مزار پر جا کر منت مانگ لو۔ اولاد مل جائے گی اب وہ منت مانگنے جا رہے تھے فیملی کو ان سے بہت ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ اجمیر پہنچنے تک ایک دوسرے کے رشتہ دار بن چکے تھے۔

یہ بھی ایک گجراتی فیملی تھی جسے کامنی نے بڑی آسانی سے شیشے میں اتار لیا تھا۔ اجمیر کا سٹیشن آنے والا تھا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی اور دونوں کو امید تھی کہ یہ صبح ان کے لیے امید اور کامیابی لے کر آئے گی۔ وہ کئی دن سے مسلسل دوڑ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ آنے والی مسز پٹیل نے کامنی کو اپنی بیٹی اور مسٹر پٹیل نے منجیت سنگھ کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ وہ اس بات پر بہت خوش دکھائی دے رہے تھے کہ منجیت سنگھ سکھ اور پنجابی ہے جس نے ایک گجراتی لڑکی کے عشق میں اپنا گھر بار ہی نہیں، دھرم بھی چھوڑ دیا تھا اور اب وہ ان کا منہ بولا بیٹا بن گیا تھا۔

مسز پٹیل نے بتایا کہ وہ یہاں گزشتہ دس سال سے آ رہے ہیں اور اجمیر میں ان کی رہائش کا بندوبست بھی پہلے سے ہو جاتا ہے۔ انہوں نے دونوں کو سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب الگ نہیں بلکہ ان کے ساتھ رہیں گے دونوں نے ''ناں ناں'' کہتے ہوئے بالآخر ان کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا۔

ٹرین اجمیر ریلوے سٹیشن میں داخل ہو چکی تھی اور اب رینگتی ہوئی اپنے پلیٹ فارم کی طرف جا رہی تھی۔ نبیل کو یہاں پولیس معمول سے زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔

''اُتسو'' (عرس) کی وجہ سے زیادہ پولیس موجود ہے۔ غالباً کامنی نے اس کی تشویش محسوس کر لی تھی اور اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

نبیل نے سر پر مسٹر پٹیل کی دی ہوئی گجراتی ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور وہ پہلی نظر میں گجراتی ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ٹرین رکتے ہی پولیس والے قلیوں کے ساتھ مسافروں کی طرف لپکے۔

(اس سنسنی خیز داستان کی اگلی قسط شمارہ ستمبر میں ملاحظہ فرمائیں)

طارق اسمٰعیل ساگر

قسط نمبر 9

دونوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کامنی نے محسوس کیا کہ نبیل صورتحال سے، کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ شاید یہاں کی پولیس کو بھی ان مرد و عورت کا حلیہ بتایا گیا ہو جو اپنے کمرے میں ایک سی آئی ڈی افسر کو قتل کرنے کے بعد ہوٹل سے فرار ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہاں سے صرف یہی ٹرین اجمیر کی طرف آئی تھی اور غالب امکان تھا کہ "ملزم" اس میں موجود ہوں گے۔ پولیس والے اسی اطلاع اور اندازے پر ٹرین کو گھیرے میں لیے کھڑے تھے کہ شاید کسی اندھے کے ہاتھ کوئی بٹیر لگ جائے۔

اچانک ہی نبیل نے اپنے ہمراہی کے ایک بچے کو پیار آنے کے انداز میں گود میں اٹھا لیا جبکہ دوسری بچی کے ساتھ یہی عمل کامنی نے دہرایا۔ دونوں نے سامان میں سے بھی ایک ایک بیگ اٹھا لیا تھا اور اب وہ نیچے اترنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تیار تھے۔ گجراتی جوڑے کے لیے یہ بڑی خوش آئند بات تھی کہ انہیں کچھ دیر ہی کے لیے سہی اپنے شرارتی بچوں سے نجات مل گئی تھی۔

اب ترتیب کچھ اس طرح بن گئی تھی کہ نبیل نے ایک بچے کو اٹھا رکھا تھا اور وہ سب سے آگے تھا اس کے پیچھے گجراتی خاتون جس کے ساتھ وہ باتیں کر رہا تھا جبکہ اس کے خاوند کو دوسری طرف گود میں بچہ اٹھائے کامنی نے متوجہ کیا ہوا تھا۔ نبیل سب سے پہلے نیچے اترا اور اپنے ساتھی کی رہنمائی میں باہر چل دیا دونوں پر پولیس والوں نے نظر ضرور ڈالی تھی لیکن یہ بالکل معمول کا معاملہ تھا کسی نے ان پر ذرہ برابر بھی شک نہ کیا ان کے پیچھے اسی طرح کامنی اور گجراتی سیٹھ چل رہے تھے۔ دونوں نے قطعاً یہ گنجائش نہیں چھوڑی تھی کہ پولیس والے انہیں اس فیملی سے الگ سمجھیں۔ پلیٹ فارم سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے گفتگو کرتے باہر آ گئے جہاں بہت سے سائیکل رکشہ والے ان کے منتظر تھے۔ پہلے سے منتخب آرام گاہ کی طرف انہوں نے دو سائیکل رکشہ میں سفر کیا لیکن کامنی اور نبیل نے اس بات کا مکمل اہتمام کیا تھا کہ دونوں الگ الگ بیٹھیں ایک سائیکل رکشہ میں سیٹھ اور نبیل ایک بچے اور سامان کے جبکہ دوسرے میں کامنی سیٹھ کی بیوی اور ان کی بچی باقی سامان کے ساتھ بیٹھ گئے اور دونوں رکشے بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ دونوں بڑے پررونق بازار سے گزرتے ہوئے یہاں تک آئے تھے راستے میں مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کا اژدہام لگا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حضور سلام پیش کرنے آئے تھے۔ ان میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے شامل تھے۔ نبیل کے لیے حیرانگی کی بات یہ تھی کہ مسلمانوں سے زیادہ تعداد یہاں غیر مسلموں کی تھی جو بھارت ہی نہیں دنیا کے کونے کونے سے یہاں آئے تھے۔

رکشے اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک تنگ گلی میں بنا تین منزلہ مکان تھا جس کی دوسری منزل پر دو کمرے کا ایک فلیٹ سیٹھ صاحب نے ریزرو کروایا ہوا تھا۔ یہاں اردگرد موجود تمام بلڈنگیں "یاتریوں" ہی سے بھری تھیں۔ بازار میں چاروں طرف پھولوں، عطریات اور مزار سے متعلق دیگر لوازمات کی دکانیں تھیں یا پھر

درجنوں کی تعداد میں وہ ہوٹل جہاں چٹ پٹے اور مختلف ذائقوں کے کھانوں کی بہار لگی تھی۔

گجراتی سیٹھ کی فیملی یہاں چھ روزہ قیام کے لیے آئی تھی چونکہ وہ عرصے سے یہاں آرہے تھے اس لیے یہاں کے ماحول اور صورتحال سے خاصے روشناس تھے۔

سب سے پہلے معزز خاتون نے اپنے ایک بیگ سے دو تین چھوٹی چھوٹی دیگچیاں نکالنی شروع کیں پھر وہ اشیائے خورد ونوش جو وہ اپنے ساتھ ہی لے کر آئی تھی۔

"سیٹھ صاحب بازار کا کھانا نہیں کھاتے۔" اس نے پہلی خوشخبری سنائی جس نے نبیل کو تو نہال کر دیا۔

"بہت اچھی بات ہے۔" اس نے دل کھول کر اس فیصلے پر داد دی۔

کامنی نے رسوئی میں زبردستی ہی اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں انہوں نے شاندار اور بھرپور ناشتہ تیار کر لیا اور اب سب ایک دسترخوان پر بیٹھے کھا رہے تھے۔ کھانا گجراتی خاتون "پروس" رہی تھی۔ نبیل نے اپنے سامنے دھری "تھالی" کو اس وقت تک نہیں چھوا جب تک کہ اس نے باقی لوگوں کو مقامی روایات کے مطابق کھاتے ہوئے نہیں دیکھ لیا۔ اسے یہ بات بہت اچھی لگی کہ یہاں کھانا تقسیم کرنے والی خاتون تھالی میں اتنا ہی کھانا ڈالتی تھی جتنا آسانی سے کھایا جا سکے جس کے بعد ہی باقی کھانا ڈالتی تھی۔ نبیل نے گھر میں تیار کردہ دال اور میدہ کے امتزاج سے تیار کردہ گرما گرم پوریاں پہلی مرتبہ اتنی مزیدار کھائی تھیں۔ اس نے جان بوجھ کر اتنا ہی کھایا جتنا سیٹھ صاحب نے کھایا تھا جبکہ کامنی محسوس کر رہی تھی کہ ابھی اس نے سیر ہو کر نہیں کھایا لیکن نبیل ان لوگوں پر کوئی غلط تاثر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ سب لوگ عملاً گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ ساری رات کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا جبکہ کامنی اور نبیل کی حالت تو ان سے بھی زیادہ بری تھی۔ دونوں کو انہوں نے زبردستی ایک کمرے تک محدود کر دیا تھا۔ جبکہ دوسرے کمرے میں وہ خود آرام کر رہے تھے۔

"بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" کامنی نے طویل سانس لے کر کہا۔

"بے شک ان لوگوں کی وجہ سے ہم ایک بڑے عذاب سے بچ گئے۔" نبیل نے اپنی رائے پیش کی۔

"لیکن کب تک...... ابھی......"

"میں فون کرنے نیچے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد لائحہ عمل طے کریں گے۔" نبیل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ کامنی کی الجھن کو سمجھ سکتا تھا۔ ابھی تک وہ لوگ مفروروں والی زندگی ہی بسر کر رہے تھے جبکہ کامنی نے یہ بھی جان لیا تھا کہ نبیل اس قماش کا بندہ نہیں جس طرح کے لوگوں سے اسے اب تک واسطہ رہا تھا لیکن اس ساری بھاگ دوڑ کا انجام کیا ہوگا؟

نبیل نے اس سے متعلق کیا سوچ رکھا ہے؟ کیا فیصلہ کرے گا وہ؟ ایک عورت ہونے کے ناطے اسے اس بات کا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ نبیل اس سے متاثر ہے لیکن وہ جس طرح کی محبت کا اظہار کر رہا تھا ایسی محبت تو ان کی "دھارمک" کتابوں میں ہی ہو سکتی تھی یا پھر پرانی ہندی فلموں میں۔

نبیل بھی یہی سوچ رہا تھا۔

آخر کب تک وہ کامنی کو اپنے ساتھ رکھے گا۔ وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے اس سے جان چھڑا سکتا تھا لیکن نجانے کون سی طاقت تھی جو اسے ایسا کرنے سے روکتی تھی۔ اس نے کامنی کو اپنی ذمہ داری بنا لیا تھا اور دل ہی دل میں یہ عہد کیا تھا کہ اسے ایک محفوظ زندگی دینے کے بعد ہی اس سے الگ ہوگا۔

"میں فون کرنے جا رہا ہوں۔" اس نے اچانک ہی کامنی کو چونکایا۔

"مم...... میں بھی چلوں تمہارے ساتھ؟" کامنی نے کہا۔

"نہیں کامنی۔ اس کی ضرورت نہیں۔ اطمینان رکھنا میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے اسے بہر صورت پورا کروں گا۔" اس نے اپنی دانست میں کامنی کو اطمینان دلایا۔

"نہیں منجیت! ایسی کوئی بات نہیں...... وہ تو میں......"

"نو پرابلم......" اس نے کامنی کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور جیب میں کچھ نوٹ ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"گڈ لک۔" کامنی نے دروازے کے قریب کہا۔

"میرے خیال سے یہ لوگ سو رہے ہیں۔ بہتر ہے انہیں میرے باہر جانے کی خبر نہ ہو۔" اس نے کامنی سے سرگوشی کی۔

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ بے فکر رہو۔" کامنی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اچھا میں چلوں۔ رب راکھا۔" کہتے ہوئے وہ دروازے سے باہر آ گیا۔ کامنی کمرے کی کھڑکی سے اسے بازار میں جاتے ہوئے اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ بازار کے ہجوم میں گم نہیں ہو گیا۔

نبیل کو یہاں بازار میں کہیں کہیں پاکستانی چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ وہ لوگ تھے جو "زائرین" کے گروپ میں یہاں آئے ہوں گے۔ یہاں قریباً ہر دوسرے ہوٹل اور دکان پر پی سی او بھی کھلے تھے جن پر بڑے بڑے اردو الفاظ میں لکھا تھا یہاں سے انٹرنیشنل کال کی جا سکتی ہے۔ کچھ ہوٹل والوں نے تو پاکستانی یاتریوں کے لیے خصوصی ریٹ بھی لگائے ہوئے تھے۔ نبیل نے وہاں اکا دکا پاکستانیوں کو فون کرتے بھی دیکھا تھا۔

وہ اب ایک ایسے ہی "ڈھابے" پر آ گیا تھا جہاں سے پہلے اس نے چائے پی پھر "پی سی او" کا ڈبہ خالی دیکھ کر کاؤنٹر پر ادائیگی کر کے اس طرف دھڑکتے دل سے چل دیا۔

"پاکستان کال کرنی ہے۔" اس نے PCO پر بیٹھے سردار سے کہا۔

"ضرور مہاراج کیوں نہیں۔ تابعدار ہیں جی آپ کے۔ کیا نمبر ہے چوہدری صاحب؟" سردار پاکستانیوں سے خاص انسیت رکھتا تھا۔ اگلے دو منٹ بعد وہ ملک ناصر سے فون پر رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

ملک ناصر نے اس کی "ہیلو" سے ہی اسے کہا تھا۔

"اپنا نام مت لینا۔ باتیں پھر ہوں گی۔ ایک نمبر لکھ لو۔ یاد کر لو۔ اس پر فوراً رابطہ کر کے باقی معاملات طے کرتے ہیں۔" ملک ناصر کی آواز کی کپکپاہٹ سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کے بھائی کی جذباتی کیفیت کیا ہوگی۔

"باقی سب تو اچھا ہے نا بھائی جان؟" نبیل نے بمشکل کہا۔

"سب خیر ہے۔ نمبر سن۔ نمبر سن۔" کہتے ہوئے اس نے ایک مقامی نمبر بتایا۔

PCO والے سردار صاحب نے کیبن میں ایک پنسل موٹے دھاگے سے باندھ کر لٹکائی ہوئی تھی اور کچھ پرچیاں رکھی تھیں۔ سردار کا تو یہ بزنس رہا ہوگا لیکن نبیل کے لیے یہ تائید غیبی تھی۔ اس نے جلدی سے نمبر نوٹ کیا اور ناصر نے "اللہ راکھا" کہہ کر فون بند کر دیا۔ جس پرچی پر نمبر لکھا تھا وہ اپنی جیب میں ڈال لی اور پھرتی سے باہر آ گیا۔

اس نے باہر آنے میں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ اس ڈھلتی عمر اور بڑی بڑی مونچھوں والے "سفید پوش" کو دیکھ کر کیا تھا جو مسلسل اس PCO کے سامنے چکر لگا رہا تھا۔ نبیل کو فوراً اس کی اصلیت کا اندازہ ہو گیا تھا اور اس

نے سفید پوش کو موقع دیے بغیر وہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت جانی۔ اگلے ہی لمحے وہ بازار کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

سفید پوش اس کی طرف سے مایوس ہو کر PCO والے سردار سے جا ٹکرایا۔

''کہاں فون کیا تھا اس نے؟'' اس نے چھٹتے ہی دریافت کیا۔

''پاکستان۔ کیوں؟ کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' سردار بھی بڑا اکھڑ مزاج لگتا تھا۔

''اوہ نہیں سردار جی وہ آپ کو تو پتہ ہی ہے ناں۔ ان لوگوں کا بڑے خطرناک بندے ہیں۔ دیکھنا تو پڑتا ہے ناں۔'' اس نے سردار کو اپنی دانست میں اعتماد میں لیتے ہوئے کہا تھا لیکن سردار نے اس کی بات کا برا منایا وہ بھی کسی پولیس والے کا نزدیک دور کا رشتہ دار تھا۔

''اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ تم لوگوں کی وجہ سے ہمارا دھندہ آدھا رہ گیا ہے۔ تمہاری شکل دیکھ کر بے چارے غیر ملکی یہاں فون بھی نہیں کرتے۔ ناں اور کوئی PCO تمہیں دکھائی نہیں دیا جو ادھر ہی صبح سے ڈیرے لگائے ہوئے ہیں۔'' اس نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

''سردار جی! غصہ تو نہ کریں۔ میں بھی چندی گڑھ کا رہنے والا ہوں۔ بھائی ہیں آپ کے۔ کیا کریں نوکری کا معاملہ ہے۔'' سی آئی ڈی والا کوئی پھڈا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ...... کسی گاہک کے تھے لگنے دو۔'' سردار نے الٹا ہاتھ ہلا کر اسے رخصت ہونے کا اشارہ کیا اور بیچارہ مونچھوں والا سفید پوش وہاں سے چلا گیا۔

''کامنی! بس ہم اب آزاد ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے پیاروں کو خبر پہنچا دی ہے۔ سب اچھا ہو جائے گا۔'' اس نے کمرے میں پہنچتے ہی کامنی کو خوشی سے بے قابو ہو کر قریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ کامنی اس کی خوشی کی شدت کا اندازہ کر سکتی تھی۔

''ویل ڈن۔ ویل ڈن۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''بس اب ہمیں ایک لوکل نمبر پر فون کرنا ہے لیکن یہاں سے نہیں کہیں اور سے۔'' نبیل نے اگلی بات کی۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' کامنی نے کہا۔

''میرے خیال سے ہم اپنے محسنوں سے بھی اب الگ ہو جائیں تو بہتر ہے۔'' نبیل نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''جیسے تم چاہو منجیت لیکن یہ خیال رکھنا کہ اب ہمیں آگے ایسی کوئی Blessing نہیں ملے گی۔ یہ ہمارا بہت مضبوط Cover ہے جب تک خود کو سو فی صد محفوظ نہ کیا تو ایسے سہارے کو ہاتھ سے گنوانا مناسب نہیں۔'' اس نے منجیت کو سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کامنی یوں بھی ہم انہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے۔ کوئی شک نہ ہو جائے انہیں۔ کسی سے بات نہ کر لیں اور پھر یہ سلسلہ آگے نہ چلا جائے۔ اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ ہم کوئی موبائل سم حاصل کر سکتے ہیں۔'' اس نے کامنی سے اچانک ہی پوچھا۔

''ادھر گجرات میں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں منجیت۔ یہاں کا مجھے علم نہیں۔ میرا خیال ہے مل جائے گی۔ کوئی شناخت دکھانی پڑتی ہے۔ میں بہانہ کر لوں گی۔'' کامنی نے اس کی طرف پر یقین نگاہوں سے دیکھا۔

''زبردست کامنی۔ زبردست۔ ٹھیک ہے آج ان کے ساتھ وقت گزار کر کل ان سے رخصت لیتے ہیں۔ یہاں سے لوگی یا کسی دوسرے شہر سے؟'' اس نے کامنی سے دریافت کیا۔

''یہاں غیر ملکی یاتری بھی بڑی تعداد میں آئے ہوئے ہیں۔ سی آئی ڈی والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ کچھ مشتبہ چہرے میں نے راستے میں دیکھے تھے۔ میرے خیال سے دونوں چیزیں موبائل اور سم کسی اگلے شہر سے لیں گے۔''

کامنی نے رائے دی۔

''بالکل صحیح کہا۔ ٹھیک ہے۔ سکھ کی نیند سو جاؤ۔ کل ہمارے لیے اچھا ہی ہوگا۔''

اس نے زبردستی ''انشاء اللہ'' کے الفاظ گول کر دیے۔

خدا جانے اس کے لہجے میں کیا اطمینان چھپا تھا کہ کامنی واقعی سکھ کی نیند سو گئی اس نے اس مرتبہ نبیل کو موقع نہیں دیا تھا اور اپنا بستر پہلے سے زمین پر لگا لیا تھا کیونکہ اس کمرے میں بھی ایک ہی بیڈ تھا اور ان کے میزبانوں نے انہیں میاں بیوی جانتے ہوئے اس کمرے میں دھکیلا تھا۔

دونوں کب تک بے خبری کی نیند سوتے رہے کسی کو اس کا احساس نہ ہو سکا۔ دونوں کی آنکھ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سے کھلی تھی۔ دروازے پر دستک دینے کا انداز اتنا شریفانہ تھا کہ انہیں پوچھے بغیر ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سیٹھ صاحب کی فیملی ہی ہو سکتی ہے۔

دروازہ نبیل نے کھولا تھا اور کامنی نے بڑی پھرتی سے وہ چادر اور تکیہ اٹھا کر پلنگ پر رکھ دیا جو اس نے کارپٹ پر بطور بستر استعمال کیا تھا تاکہ کسی کو ان پر شک نہ ہو۔

''شما کرنا بھائی جی۔'' دروازہ کھلنے پر سیٹھ صاحب کی بیگم کی شکل دکھائی دی۔ ''دراصل شام ہو رہی ہے۔ ہم مزار پر جا رہے ہیں۔ میں نے آپ کا کھانا رسوئی میں رکھ دیا ہے۔ یہ گھر کی دوسری چابی ہے اگر آپ باہر جائیں تو تالا لگا کر جائیں۔ واپسی پہلے ہو جائے تو کھول لیں۔ ٹھیک ہے ناں؟''

''ٹھیک ہے بھابی جی۔ معافی چاہتا ہوں۔ ہم گہری نیند سو گئے۔ بہت تھکاوٹ ہو رہی تھی۔'' نبیل نے اس سے معذرت خواہ لہجے میں کہا۔

اس دوران کامنی بھی اس کے ساتھ کھڑی ہو گئی تھی اور وہ بھی گجراتی زبان میں اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔ نبیل نے اندازہ لگایا کہ گجراتی میں بات کرنے پر وہ بہت خوش ہوتی تھی اور کامنی کو اس کی اس کمزوری کا شدت سے اندازہ بھی تھا اور وہ اس کا بھرپور استعمال بھی کر رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ پہلے پہل ایسے ہی ہوتا ہے۔ ابھی کوئی بچہ لوگ نہیں آیا ناں۔ اس سے پہلے خوب موج مستی کر لو بعد میں تو ہماری طرح ہو جاؤ گے۔'' اس نے قہقہہ لگایا تو نبیل اور کامنی بھی بے ساختہ مسکرا دیے۔

دونوں نے انہیں رخصت کیا اور واپس آ کر کچن میں چلے گئے جہاں گجراتی خاتون نے ان کے لیے زبردست کھانا بنا کر رکھا تھا۔ دونوں نے جی بھر کے کھایا اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔

''میرے خیال سے ہمارا زیادہ باہر گھومنا مناسب نہیں۔'' نبیل نے اپنا عندیہ بیان کیا۔

''ہاں۔ لیکن خواجہ پیا کے ہاں حاضری تو دے لیں اگر قسمت سے یہاں آ ہی گئے ہیں تو۔''

کامنی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ خواجہ معین الدین چشتی جو مسلمان بزرگ ہیں ان لوگوں کے نزدیک اتنا مقام رکھتے ہیں۔

''پہلے کبھی آئی ہو یہاں؟'' اس نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

''نہیں...... لیکن میرے پتا جی آتے ہیں اور یہاں

’’دیگ‘ کی نیاز بھی دے کر جاتے ہیں۔‘‘ کامنی نے جواب دیا۔

اسے بے نام سا احساس ندامت ہو رہا تھا کہ ایک مسلمان ہوتے ہوئے وہ اس بات کو شدت سے کیوں محسوس نہیں کر رہا جبکہ ایک ہندو لڑکی اسے بار بار مزار پہ جانے کی ترغیب دے رہی ہے۔ نجانے اس کے لاشعور میں ایسا کیا خوف تھا جو اسے مزار کی طرف جانے سے روک رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ یہاں پاکستان سے بھی زائرین آتے ہیں گو کہ ان کی تعداد بمشکل سو پچاس ہی ہوتی ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اس کا آشنا چہرہ اس سے ٹکرا جائے پھر وہ سوچتا یہاں ہزاروں انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رواں دواں ہے کیا ضروری ہے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ محفوظ رہے؟! ابھی وہ اسی کشمکش میں مبتلا تھا جب کامنی کی آواز اس کے پردہ سماعت سے ٹکرائی۔

’’چلو منجیت چلیں۔‘‘

’’چلو۔‘‘ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور دونوں مزار کی طرف روانہ ہو گئے... انہیں کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی یہاں سب لوگ اسی سمت جا رہے تھے یا اس سمت سے اسی طرف آ رہے تھے۔

’’یہاں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ راستہ بنا ہوگا۔‘‘ کامنی کی اس اطلاع پر اس نے قدرے سکھ کا سانس لیا

دونوں اب مزار کے نزدیک پہنچ چکے تھے جہاں بھیڑ کا یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔

’’تم عورتوں کی طرف چلی جاؤ۔ پندرہ منٹ بعد ہم یہاں ملیں گے۔‘‘ نبیل نے اچانک ہی اسے ایک ’’تبرکات‘‘ والی دکان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔

’’او کے۔‘‘ کامنی نے جواب دیا اور دوسری طرف مڑ گئی جبکہ وہ خود مزار کے اس راستے کی طرف چل دیا جدھر باقی سب لوگ جا رہے تھے۔ دھکے کھاتا بالآخر وہ مزار تک پہنچ ہی گیا۔ اس دوران اسے تین مرتبہ یہاں کے متولیوں نے اس طرح جکڑا تھا کہ تینوں مرتبہ ان کے پھیلے ہاتھوں پر پانچ دس روپے رکھنے کے بعد ہی اس کی جان چھٹی تھی۔ یہ لوگ ہر آنے والے ہر زائر سے تقریباً زبردستی چندہ وصول کر رہے تھے۔

نبیل کسی نہ کسی طرح مزار کے احاطے میں پہنچ گیا۔ جہاں ایک کونے میں رک کر اس نے دل ہی دل میں فاتحہ پڑھی اور دعا مانگنے کے بعد واپسی کے لیے مڑا۔ یہاں آنے سے بالاشبہ اس کے دل کو بہت سکون مل گیا تھا اور کوئی نادیدہ طاقت اس کے کانوں میں کہہ رہی تھی کہ جلدی وہ اپنے پیاروں کے درمیان پہنچ جائے گا۔

یہی سوچتا وہ ہجوم میں راستہ بناتا باہر جا رہا تھا جب اچانک ہی زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس کے سامنے حوالدار شبیر قادری کھڑا تھا۔ حوالدار شبیر قادری اس کے تھانے کا منشی محرر تھا اور علاقے کا مشہور نعت خواں تھا۔ تقریباً ہر سال وہ خواجہ معین الدین چشتی کے عرس پر زائرین کے ساتھ آیا کرتا تھا۔

’’سر جی! السلام علیکم جی۔‘‘ اس نے نبیل کو پہچانتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ نبیل کو کچھ سمجھ آتے اچانک ایک زوردار دھکے سے وہ آنے والوں سے ٹکرایا اور جان بوجھ کر اسی رخ پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے اپنے عقب میں۔ ’’سر جی۔ ملک صاحب۔‘‘ کی آوازیں پہلے تو سنائی دیں لیکن پھر دوسری آوازوں کا شور اس پر غالب آ گیا۔ نبیل نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اس طرح بھیڑ کے بیچوں بیچ چکر کاٹتے ہوئے راستہ بناتا اس دکان تک پہنچ گیا جہاں کامنی پہلے سے موجود تھی۔

’’بڑی دیر لگا دی۔‘‘ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

’’بہت رش ہے۔ مشکل سے نکلا ہوں۔‘‘ نبیل نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔

ابھی تک اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو تھیں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر گزرا کہ وہ خفیہ پولیس کی نظروں میں نہیں آیا تھا ورنہ تو شبیر قادری نے اسے مروا دینا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہر پاکستانی زائر کے پیچھے ایک بھارتی انٹیلی جنس والا لگا ہوگا اگر وہ شبیر قادری کو اس سے ملتے دیکھ لیتا تو نبیل کی کمبختی آ جاتی۔

’’میرے خیال سے ہم کوئی موبائل یہاں سے خرید لیں۔ سم کسی اور علاقے سے لے لیں گے۔‘‘ کامنی نے اپنی رائے پیش کی۔ اسے اچانک کچھ یاد آ گیا تھا۔

’’ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ لیکن یہاں سے؟‘‘ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

’’اس بازار سے نہیں۔ بڑی مارکیٹ سے۔‘‘ کامنی نے اگلی بات کہہ کر اس کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا کرنا چاہا۔

’’خطرہ مول لیا جائے یا اس سے بچا جائے۔‘‘ ایک سوال اچانک اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس نے فوراً ہی دوسرا فیصلہ کر لیا۔

’’کامنی ایک ضروری بات کرنی تھی۔‘‘ اس نے اچانک ہی کامنی کو مخاطب کیا۔

’’خیریت تو ہے ناں؟‘‘ کامنی نے اس کے چہرے کی بدلتی رنگت کا احساس کر لیا تھا۔

’’میں...... وہ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے یہاں اپنی مخالف پارٹی کے دو تین بندے دکھائی دیے ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ انہوں نے مجھے دیکھا ہے یا نہیں لیکن ہمارے لیے اب یہاں سے جلدی نکل جانا ہی مناسب ہوگا۔‘‘ کامنی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’میں کوئی ہنگامہ نہیں چاہتا۔ اگر انہوں نے میری جھلک دیکھ لی ہے تو وہ مجھے ڈھونڈنے اور مارنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم......‘‘ اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’نہیں منجیت! بھگوان جانتا ہے مجھے اپنی جان کی نہیں صرف اور صرف تمہاری فکر ہے۔ ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ ہم گھر جاتے ہیں وہاں جا کر اگلا منصوبہ بنائیں گے۔‘‘ کامنی نے کہا۔

دونوں تھوڑی دیر بعد گھر پہنچ گئے۔ ابھی تک ان کے میزبان واپس نہیں آئے تھے۔

’’ہم ان کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد ان سے اجازت لے لیں گے تم کوئی اچھا سا بہانہ کر دینا۔ مجھے تو ان بے چاروں کے سامنے کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں سوجھے گی۔‘‘ نبیل نے فیصلہ کیا۔

’’بے فکر ہو جاؤ۔ میں ان کی ہم زبان ہوں انہیں مطمئن کر لوں گی۔‘‘ کامنی نے بتایا۔

نبیل مطمئن ہو گیا۔ نجانے کیوں اسے کامنی پر بہت اعتماد ہونے لگا تھا وہ لاشعوری طور پر اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کا قائل ہو گیا تھا۔ اگر کامنی اسے جنگل میں نہ ملتی تو اس کے لیے ایک خطرناک مفرور کی حیثیت سے یہاں تک پہنچنا ممکن نہ ہوتا۔ وہ نہ تو یہاں کی زبان ڈھنگ سے بول سکتا تھا نہ ہی اسے یہاں کے معمولات زندگی سے بھرپور آگاہی تھی۔ یہ کامنی ہی تھی جو ہر مرحلے پر اس کے اور آمدہ مصائب کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اگر اس نے ٹرین کے سفر کے آغاز ہی میں اس گجراتی فیملی سے تعلق نہ بنا لیا ہوتا تو ان لوگوں کے لیے اجمیر میں اتنے پھندے لگے تھے کہ کسی نہ کسی میں پھنس جاتے۔

دونوں کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ کامنی اس کے لیے ’’رسوئی‘‘ سے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ تھوڑی

در بعد ان کے میزبان بھی گھر پہنچ گئے۔ دونوں نے یہی تاثر دیا تھا جیسے وہ میزبانوں کی آمد سے کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچے ہوں۔

''ہم لوگ آج واپس جائیں گے۔'' کامنی نے اچانک ہی اعلان کر کے اپنے میزبانوں کو قدرے سوگوار کر دیا۔

''اکٹھے ہی چلتے۔''

''کل تک تو رکو۔''

دونوں نے باری باری کہا۔

''بات یہ ہے کہ ادھر گھر سے مسلسل پیغام آ رہے ہیں آج سات ماہ ہو جائیں گے پنجاب نہیں گئے۔ ماتا جی بہت اداس ہیں آج بھی انہوں نے خاص طور سے فوراً آنے کے لیے کہا ہے۔'' نبیل نے ہمت کر کے اپنا حصہ بھی گفتگو میں ڈال دیا۔

''مجھے مشکل سے چھ دن کی چھٹی ملی ہے۔ آج دو دن تو ہو گئے۔ اس طرح تو.....'' کامنی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ٹھیک ہے بہن کامنی جیسے آپ کی مرضی۔'' سیٹھ صاحب نے غالباً ان کی مجبوری کا احساس کر لیا تھا۔

''لیکن ادھر گجرات میں ایسا نہیں چلے گا۔ سمجھ گئی ناں؟'' ان کی مسز نے کامنی سے کہا۔

''ارے بہن جی آپ تنگ آ جائیں گی ہم سے۔ بس گجرات پہنچنے دیں ہمیں۔'' کامنی نے مسکراتے ہوئے جھوٹ بولا۔

دونوں نے آپس میں ٹیلی فون نمبروں کے تبادلے بھی کر لیے تھے۔ کامنی نے انہیں ایک نمبر دے دیا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ اس نمبر پر کم از کم ان کی موجودگی میں فون نہ کریں۔ کیونکہ یہ نمبر اب شاید بند ہو چکا تھا۔ احتیاطاً اس نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنا موبائل فون گھر بھول آئی ہے جواب بند ہو گیا تھا اور واپسی پر ہی کھلے گا۔

دونوں انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے پر بضد تھے لیکن کامنی اور نبیل دونوں نے انہیں روک دیا۔ ان کے لاشعور میں بیٹھے خوف نے ابھی تک انہیں بہت محتاط کیا ہوا تھا اور وہ دونوں کوئی ایسا خلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جس سے دشمن ان تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر لے۔

نبیل نے جن لوگوں کے ہاتھوں اتنے زخم اٹھائے تھے اور جنہوں نے اس کی تفتیش کی تھی ان سے متعلق وہ کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ خود ایک پولیس آفیسر تھا اور جانتا تھا کہ اس کے فرار کے بعد وہ لوگ چپ نہیں بیٹھے ہوں گے۔ نبیل کو اس تلخ سچائی کا شدت سے احساس تھا کہ وہ ایک پاکستانی شہری ہے جسے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں اپنے کسی بھی ناجائز مقصد کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔ اسے کسی بھی وقت ''دہشت گردوں کا سرغنہ'' بنا کر پریس کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے اور وہ پاکستان کے لیے حادثاتی طور پر بھی کسی رسوائی کا سامان بننے سے مر جانا زیادہ بہتر جانتا تھا۔

دونوں اپنے بیگ سنبھالے نیچے اتر آئے۔ رات کے نو بج رہے تھے اور یہاں سے دس بجے دہلی کے لیے ٹرین چلتی تھی، چونکہ عرس کی وجہ سے اجمیر شریف کا اسٹیشن بہت مصروف اور پُر ہجوم تھا اس لیے انہیں امید تھی کہ یہاں وہ آسانی سے اپنے اگلے منصوبے پر عمل کر سکتے ہیں۔ رکشہ انہوں نے اسٹیشن کے نزدیک ایک مارکیٹ میں چھوڑ دیا۔ یہ کراچی کے بوہری بازار جیسی کوئی مارکیٹ تھی جہاں چھوٹی چھوٹی دکانوں اور ٹھیلوں پر عوام کا رش لگا ہوا تھا۔ یہاں پرانی اور قابل استعمال چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ اس مارکیٹ کا تعارف گاڑی میں سفر کے دوران بڑے جوش و خروش سے سیٹھ صاحب نے کروا دیا تھا اور بتایا تھا کہ وہ جب بھی اجمیر شریف آتے ہیں یہاں سے ہی شاپنگ کرتے ہیں۔ انہوں نے بڑی رازداری سے دونوں کو بتایا تھا کہ یہاں زیادہ تر دو نمبر اور چوری کا مال ہی فروخت ہوتا ہے۔ دونوں اس امید پہ یہاں آئے تھے کہ گوہر مقصود ان کے ہاتھ لگ جائے۔

دونوں اس وقت وہاں موجود بھیڑ کے درمیان راستہ بناتے گزر رہے تھے کہ ایک سولہ سترہ سالہ نوجوان جس نے عربی مسلمانوں جیسا لباس پہن رکھا تھا سامنے آ گیا۔

''سر جی! موبائل چلے گا؟ ایک نمبر مال ہے مہاراج۔'' اس نے نبیل اور کامنی کی طرف دیکھا۔

''کہاں ہے..... دکھاؤ۔'' کامنی نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تولتے ہوئے پوچھا۔

''ادھر صاحب..... ادھر آئیں۔''

یہ کہتے ہوئے لڑکا ان کے آگے آگے چلنے لگا۔ سفر کا اختتام بازار میں موجود بھیڑ کے بیچوں بیچ راستہ بناتے ہوئے قریباً پانچ منٹ بعد ہی ہو گیا۔ دونوں ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے کھڑے تھے جہاں مراد آباد کے پیتل کے برتن فروخت کیے جاتے تھے۔ دونوں حیران تھے کہ یہاں موبائل کہاں سے آ گئے؟ دکان پر صرف دو گاہک جوڑ توڑ کر رہے تھے۔

''ادھر آ جائیں میڈم۔ اندر آ جائیں۔'' لڑکے نے انہیں اشارے سے دکان کے اندر ایک قدرے خفیہ گوشے کی طرف بلایا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا پھر نبیل کے سر ہلانے پر دونوں اندر چلے گئے۔ دکان کے درمیان ایک لکڑی کا تختہ لگا کر پیچھے ایک طرح کا اسٹور بنایا گیا تھا جس میں برتن رکھے تھے البتہ وہاں دو تین اسٹول بیٹھنے کے لیے موجود تھے۔ دونوں نے ایک ایک اسٹول سنبھال لیا۔

لڑکے نے پھرتی سے برتنوں کے ڈھیر میں چھپائے تین موبائل نکالے اور انہیں دکھانے لگا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ تینوں کی خوبیاں اس طرح بڑھ چڑھ کر بیان کر رہا تھا جیسے تینوں موبائل الگ سے صرف اس دکان کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔

نبیل نے کامنی کی طرف دیکھا۔ جس نے ''ریلائنس'' کا ایک موبائل پسند کر لیا تھا لڑکے نے اس کے جو دام بتائے کامنی نے اس سے آدھی قیمت کی آفر کی جو اس نے تھوڑی رد و قدح کے بعد قبول کر لی۔

''کوئی سم دکھاؤ، ہم اسے ٹیسٹ تو کر لیں۔'' نبیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ لیں صاحب۔ یہ لیں۔ ادھر کوئی 2 نمبری نہیں چلتی صاحب ہم دس سال سے دھندہ کر رہے ہیں۔ سارا انڈیا جانتا ہے شیخ جی کی دکان پہ ہیرا پھیری نہیں ہوتی۔'' کہتے ہوئے لڑکے نے اپنے موبائل سے سم نکال کر اس موبائل میں ڈال دی۔ فون مکمل چارج تھا۔

نبیل نے فوراً وہ نمبر ملایا جو اسے دیا گیا تھا دوسری طرف سے قدرے بھاری آواز میں ''ہیلو'' کہا گیا۔

''میں منجیت بول رہا ہوں۔'' اس نے ہدایت کے مطابق پنجابی میں بات کی۔

''جی آیاں نوں ویر جی۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''آپ دہلی جا سکتے ہیں؟'' سوال ہوا۔

''ہاں۔'' نبیل نے مختصر جواب دیا۔

''گاندھی مارگ پہ ہوٹل شوبرا پہنچیں وہاں آپ کے نام پر کمرہ بک ہے بالکل بے فکر ہو جائیں۔ وہیں ملاقات ہو گی۔'' دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا۔

نبیل کا دل خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کامنی کی طرف دیکھ کر کہا جو کوئی اور ہی پلان بنا رہی تھی۔

اس نے اپنے پرس سے نوٹ نکال کر لڑکے کو تھما دیے۔

"دیکھو منے ہم مہاراشٹر سے آئے ہیں۔ رش میں کسی نے ان کی جیب سے موبائل نکال لیا۔ بار بار PCO سے فون کرتے اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم ہمارے لیے سم (SIM) کا بندوبست کر دو تو تمہاری کمیشن بھی دے دیں گے۔"

لڑکے نے ان کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھا۔ انہیں ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کو کہا اور دکان کے کاؤنٹر پر موجود اپنے ساتھی سے اشارے کنائے میں کچھ بات کر کے واپس آ گیا۔ دونوں امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"دیکھئے میڈم! آپ نے مجھے اپنا بھائی کہا ہے۔ آپ بھلے لوگ لگتے ہیں۔ پہلے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا آج کل سرکار نے ذرا سختی کی ہوئی ہے لیکن آپ کے لیے میں کچھ کرتا ہوں۔" اس نے دونوں کو خوش کر دیا۔ نبیل دل ہی دل میں کامنی کو داد دے رہا تھا۔

لڑکے نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا جس میں دو تین سم موجود تھیں۔ ایک اس نے ان کی طرف بڑھا دی۔

"ارے بھیا بھگوان تجھے سکھی رکھے۔ تو نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ کبھی مہاراشٹر آیا تو ہم تجھے خوش کر دیں گے۔ یہ میرے سردار جی ہیں نا ان کا ٹرانسپورٹ کا بزنس ہے۔" اس نے نبیل کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکا ان سے متاثر ہونے لگا تھا۔ اس نے انہیں سم کا نمبر بتایا اور کامنی کی طرف سے ممبئی کا ایک ایڈریس بھی نوٹ کر لیا۔

اب وہ موبائل فون کے مالک تھے۔ دونوں نے دل ہی دل میں جانے کتنی مرتبہ اللہ اور بھگوان کا شکر ادا کیا تھا۔

دونوں اب پیدل ہی اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ یہاں سے اسٹیشن تک لوگوں کی بھیڑ لگی تھی۔ اگلے دس منٹ بعد وہ اجمیر کے اسٹیشن پر موجود تھے جہاں ٹکٹ گھر کے سامنے لمبی قطاریں لگی تھیں۔ نبیل نے قدرے مایوس نظروں سے کامنی کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے اسے مطمئن کر دیا۔

"بے فکر ہو جاؤ سردار جی! ٹکٹ خود چل کر ہمارے پاس آئیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اپنے نزدیک ان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے ایک قدرے ڈھلتی عمر کے لیکن خاصے تنومند قلی کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

"جی میڈم؟" اس نے کامنی کی شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے کہا۔ جس نے مغربی لباس زیب تن کر رکھا تھا اور نبیل کو بھی اجمیر سے خریدے پینٹ کوٹ میں اپنا ہم سفر کر لیا تھا۔

"بھائی صاحب! دلی کے لیے دو ٹکٹ مل جائیں گے؟" اس نے ادھوری بات کہہ کر قلی کی طرف دیکھا۔

"ہرے رام..... ہرے رام۔" قلی نے کانوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"میڈم! آپ دیکھ رہی ہیں کتنا رش لگا ہے کل تک کوئی جگہ نہیں ٹرین میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی صاحب۔" اس مرتبہ کامنی نے اسے ایسی ادائے دلربانہ سے مخاطب کیا تھا کہ نبیل بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"لیکن کسی کے کام تو آنا چاہیے ناں؟ ہم تمہارا حق دیں گے۔ پلیز ذرا ایمرجنسی ہے۔" اس نے قلی کو اپنی نانی کے قریب المرگ ہونے کی کہانی بھی سنا دی۔

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم لیکن......" قلی نے اپنی بات نامکمل چھوڑ کر اس کا ردعمل جاننا چاہا۔

"پیسوں کی فکر نہ کرنا۔ جتنے کے بھی فسٹ کلاس کے ٹکٹ ملیں ہم تمہارا حق اس کے علاوہ دیں گے۔" اس مرتبہ نبیل نے مداخلت کی تھی۔

"ہاں۔ ہاں اور تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولیں گے۔" کامنی نے اضافہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔" قلی نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"آپ آئیں میرے ساتھ۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" نبیل نے دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔ دونوں قلی کے تعاقب میں چل دیے جو انہیں اسٹیشن کے برآمدے میں ایک کمرے میں لے گیا جہاں دو قلی اور ایک بابو بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"آ بھئی رام راج کیسا ہے تو؟" اسے دیکھتے ہی تینوں نے نعرہ بلند کیا۔

"سر جی! یہ ہمارے جاننے والے ہیں۔ دلی کے دو ٹکٹ مل جائیں تو....." اس نے اپنے مخصوص انداز سے آنکھ کا اشارہ کیا۔

"باہر کے حالات دیکھ رہا ہے ناں تو؟" بابو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مہاراج! اپنے جاننے والے ہیں۔ عزت کا معاملہ ہے۔" قلی نے طے شدہ ڈائیلاگ پھینکا۔

تھوڑی بحث اور ناں ناں کے بعد جب باقی دونوں قلیوں نے بھی "بابو جی" پر زور ڈالا تو وہ بمشکل ڈبل ریٹ پر ٹکٹ دینے پر راضی ہوئے۔

"آپ بڑے بھاگوں والے ہیں مہاراج۔" اس نے نبیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کسی کی ایڈوانس بکنگ کینسل ہوئی ہے۔ صرف وہی دو ٹکٹ ہیں۔ یہاں آپ کو پرسوں تک تین گنا قیمت پر بھی ٹکٹ نہیں ملے گا۔ یہ تو رام راج اپنا بھائی ہے۔"

"ہمیں بھی اپنے بھائی بہن ہی سمجھیں بابو جی۔" کامنی نے مسکراہٹ اچھالی اور "بابو جی" کے جبڑے پھیل گئے۔ انہوں نے اپنے یونیفارم کے اندر کی کسی خفیہ جیب سے ایک ایڈوانس بکنگ سلپ نکالی اور ان کی طرف بڑھا دی۔

"یہ منوہر لال اور مسز کے نام پر بک تھی۔ آپ سے کوئی نام تو پوچھے گا نہیں پھر بھی بتائے دیتا ہوں۔" اس نے داد طلب نظروں سے کامنی کی طرف دیکھا۔

"دھنواد۔" کامنی نے کہا اور بابو جی کی باچھیں کھل گئیں۔

فسٹ کلاس کے دو ٹکٹ ڈبل قیمت پر خریدنے کے بعد انہوں نے کمرے سے باہر آ کر قلی رام راج کو سو روپے کا نوٹ دیا تو وہ حیرت اور خوشی سے دمک اٹھا۔

"بھگوان آپ کا بھلا کرے میڈم جی۔ کبھی بھی ٹکٹ کی ضرورت ہو تو اس "داس" کا نام یاد رکھیں۔ اسٹیشن کے باہر بھی کسی کو میرا نام بتائیں گی تو سیدھا میرے پاس لے آئے گا۔ میں یہاں کی یونین کا جنرل سیکرٹری ہوں میڈم۔" بالآخر اس نے اپنا مکمل تعارف بھی کروا دیا۔

"بہت دھنواد بھیا جی آپ کا ہم لوگ تو اجمیر شریف آتے رہتے ہیں۔" کامنی نے مناسب جانا کہ گاڑی کی آمد تک اسے مصروف رکھے۔

"نمبر رکھ لیں میرا میڈم جی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی نبیل کو تھما دیا جو اس نے مسکراتے ہوئے جیب میں ڈال دیا۔

یہاں پولیس اور خفیہ کے لوگ چاروں طرف موجود تھے ان کی موجودگی کا احساس شدت سے نبیل کو تھا لیکن اس احساس کی شدت پر اب احساس تحفظ غالب آنے لگا

تھا جس نے اسے بالکل نارمل کر دیا تھا اور وہ اپنے چہرے سے اجنبیت کا کوئی تاثر نہیں دے رہا تھا۔

ٹرین آگئی۔

رام راج گارڈ کو ان کے پاس لے آیا تھا۔ اس نے زبردستی دونوں کو چائے کے دو گلاس بھی تھما دیے تھے جو اس کے ایک چمچے کی پھرتی سے وہاں پہنچے آخر وہ ان کا جنرل سیکرٹری تھا۔ گارڈ نے انہیں کوئی بہت ہی زبردست قسم کے وی آئی پیز جانتے ہوئے مکمل پروٹوکول دیا تھا۔ انہیں دو ٹکٹ تھامے ہوئے اس ٹرین کے غالباً سب سے زیادہ آرام دہ ڈبے تک لایا تھا۔

رام راج نے ان کا بیگ بڑے اہتمام سے رکھا اور اس وقت تک ان کے سر پر موجود رہا جب تک ٹرین نے روانگی کا "وسل" نہیں بجا دیا جس کے بعد وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرتے ہوئے نیچے اتر آیا۔

"اسے کہتے ہیں رام راجیہ" اس کے اترتے ہی بے ساختہ کامنی کے منہ سے نکلا اور اس کی بات کا مطلب جان کر نبیل قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

ٹرین رینگنے کے بعد رفتار پکڑ رہی تھی جب گارڈ دوبارہ اطمینان کرنے کے لیے ان کے پاس آگیا۔

"میں اگلے ڈبے میں موجود ہوں میڈم۔ کوئی بھی سیوا میرے لائق ہو تو ضرور یاد کیجیے۔ رام راج جی اپنے بھائی ہیں۔" اس نے بتیسی نکالی جواب میں نبیل کو بھی زبردستی مسکرانا پڑا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے آپ کو ہی تکلیف دیں گے ناں۔" کامنی نے مسکراہٹ اچھالی اور گارڈ واپس لوٹ گیا۔

"میرا خیال ہے دلی تک یہ سلسلہ چلے گا۔" نبیل نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"منجیت بابو! بھگوان کی کرپا سے چھوٹے موٹے کام تو میں آسانی سے چلا لیتی ہوں۔ ایک تم ہی میری پرسنیلٹی سے متاثر نہیں ورنہ تو ....." اس نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں کامنی! تم یہ بات نہیں کہہ سکتی۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ میں کسی بھی طرح کا اظہار کر سکوں لیکن جلد ہی میں بہت کہنے اور سننے کے لائق ہو جاؤں گا۔" نبیل کے لہجے کی سنجیدگی نے کامنی کے دل میں چنگاریاں چھوڑ دی تھیں وہ چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی اور جب کامنی کی آنکھیں تقریباً چھلکنے والی تھیں تو اس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

نبیل اس کے دلی جذبات سے آگاہ تھا لیکن ابھی وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنی اصلیت کو بے نقاب کر دے۔ ابھی وہ بڑے صبر سے دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ البتہ اس نے اپنے آپ سے یہ عہد ضرور کیا تھا کہ وہ کامنی کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑے گا خواہ اس کے لیے اسے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔

☆☆☆
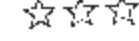
دلی تک کا سفر اس کی زندگی کا بہترین سفر تھا۔ ان کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوبیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ دونوں کا تعلق دہلی سے تھا اور اپنی روایات کے مطابق شادی کے بعد "خواجہ پیا" کے ہاں سلام کرنے گئے تھے۔ دونوں کا تعلق ایک کھتری فیملی سے تھا۔ کامنی نے دونوں کا مکمل انٹرویو لے لیا تھا۔ نبیل اوپر والی برتھ پر لیٹ گیا۔ اسے جلد ہی نیند آگئی جس کے بعد سامنے والی برتھ کا نوجوان دولہا بھی اوپر برتھ پر سو گیا۔

کامنی اور دلہن نچلی برتھ پر سوتی جاگتی رہیں۔ دلی آنے سے پندرہ بیس منٹ پہلے گارڈ پھر انہیں "نمسکار" کرنے آ گیا۔ وہ دونوں کی خیریت پھر دریافت کر رہا تھا اور ایسے درباری لہجے میں بات کر رہا تھا کہ ان کے ہم سفر دونوں کو وی آئی پیز سمجھنے لگے تھے۔

صبح ہو رہی تھی جب ٹرین دہلی کے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ ٹرین رکی، دونوں اطمینان سے نیچے اتر آئے۔ نبیل نے بیگ خود پکڑ لیا تھا اور اب دونوں اسٹیشن کے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جا رہے تھے۔

کامنی نے اپنی منزل بتائی۔ گاندھی مارگ پر ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سامنے ٹیکسی رک گئی جس پر انگریزی میں بڑے بڑے لفظوں سے "شوبرا" لکھا تھا۔ ٹیکسی والے کو نبیل نے فارغ کیا اور دونوں بڑی تمکنت اور وقار سے چلتے ہوئے ہوٹل کے ریسپشن پر پہنچ گئے۔

ہوٹل کے استقبالیہ پر ایک خوش جمال ادھ ننگی لڑکی نے ان کا استقبال کیا۔

"میرا نام منجیت سنگھ ہے۔" نبیل نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ کامنی نے بھی ایسی ہی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائی ہوئی تھی۔

"آپ کا "ہارد ک من" (دل کی گہرائیوں) سے سواگت ہے۔" نام سنتے ہی لڑکی ضرورت سے زیادہ مؤدب ہو گئی تھی۔

اس نے فوراً انٹرکام پر کسی مسٹر پرکاش سے بات کی اور اسے "مسٹر منجیت سنگھ" کی آمد کی خبر دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک شخص تقریباً بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کی آمد بتا رہی تھی کہ بڑی تیزی سے ان کا نام سن کر تقریباً بھاگتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔

"نمستے سر! نمستے میڈم!" اس نے تقریباً ڈنڈوت کرنے کے انداز میں ان کے سامنے ہاتھ باندھے۔

"نمستے جی۔" جواب میں کامنی نے بھرپور مسکراہٹ سے ہاتھ جوڑے تھے۔

"آیئے سر! آیئے آپ کا کمرہ بالکل تیار ہے۔" اس نے دونوں سے بڑے مؤدب لہجے میں کہا۔

ان کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود ایک ویٹر نے ان کا بیگ اٹھا لیا اور کمرہ نمبر 203 کے سامنے رکھ کر رخصت ہو گیا۔ یہ غالباً اس ہوٹل کا وی آئی پی روم تھا کیونکہ کمرہ کھلنے پر اندر کی سجاوٹ دیکھ کر نبیل آسانی سے اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ کمرہ کسی بھی طرح فائیو اور سیکس اسٹار ہوٹلوں سے کم آسائش نہیں رکھتا۔

بیگ مینیجر پرکاش نے اندر رکھا تھا۔

"سر! راجن بھائی نے آپ کے متعلق خصوصی حکم دیا ہے۔ اسے اپنا ہی ہوٹل سمجھیں۔ کل صبح تک وہ آپ سے مل لیں گے۔ آپ بریک فاسٹ کہاں کرنا پسند فرمائیں گے؟" اس نے بڑے مؤدب لہجے میں انہیں آگاہ کیا۔

"ابھی تھوڑا فریش (FRESH) ہو جائیں پھر بتاتے ہیں۔" کامنی نے جواب دیا۔

"ANY TIME میڈم.....!" اس نے تقریباً کورنش بجا لاتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

"راجن بھائی۔" اس کے جاتے ہی کامنی نے مسکراتے ہوئے نبیل کی طرف دیکھا۔ "اگر میں بھول نہیں رہی تو یہ ممبئی کے بہت بڑے "بھائی لوگ" کا نام ہے۔ شاید۔"

اس نے استفہامیہ نظروں سے نبیل کی طرف دیکھا۔

"ہاں کامنی۔" نبیل کو کچھ علم نہیں تھا اس نے محض اندازے سے ہی ہاں کہی تھی۔

"منجیت تم تو بہت بڑے آدمی ہو۔ میرا مطلب ہے جس کے لیے راجن بھائی......" کامنی ضرورت سے زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھی۔

"کامنی! تمہیں شاید یقین نہ آئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ بس ایسے ہی نام سنا ہے جیسے تم نے...... میں نے صرف اپنے بڑے بھائی کو اپنے زندہ رہنے کی اطلاع دی تھی

اور کہا تھا کہ اب میں اس گندے کھیل سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے انہوں نے گاؤں آنے سے منع کیا اور یہاں پہنچنے کے لیے کہا تھا۔ آگے کیا ہونے والا ہے؟ مجھے علم نہیں لیکن میں تمہیں صرف ایک بات یقین کے ساتھ بتلا سکتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"میں جانتی ہوں منجیت!"

کامنی کی آواز نبیل کو بہت اجنبی لگی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے کامنی کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے دیکھے اور وہ سسکیاں لیتی بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

تین چار منٹ تک نبیل کی طرف سے بھرپور کوشش کے بعد وہ نارمل ہوئی تھی۔ نبیل کو اس کے جذبات کی شدت کا اس سے بڑھ کر اور کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔

"پلیز کامنی! ایسے نہ کرو۔ پلیز......" نبیل نے اس کے نارمل ہونے پر کہا۔

"تم انسان نہیں کوئی "اوتار" ہو منجیت۔ تم نے مجھے اتنا مان دیا، اتنی عزت دی، تم کوئی اور ہو...... تم منجیت نہیں ہو سکتے۔" اس نے بڑے جذباتی انداز سے کہا۔

"اچھا پلیز ابھی نارمل رہو...... میں موبائل پر بات کر کے انہیں اپنے متعلق بتاتا ہوں تم ہاتھ لے لو۔" نبیل نے اسے کہا اور موبائل پر نمبر ملانے لگا جبکہ کامنی واش روم میں چلی گئی۔

"منجیت!" اس نے دوسری طرف فون ملنے پر کہا تھا۔

"یہ تمہارا نمبر ہے کیا؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"یہاں ہم نے چور بازار سے خریدا ہے۔" منجیت نے بتایا۔

"او۔ کے۔ اسے زیادہ استعمال نہ کرنا۔ صبح تک تم سے رابطہ کریں گے۔ ENJOY YOURSELF یہاں تم دونوں بالکل محفوظ ہو۔ بھائی کو اطلاع ہو گئی ہے۔ کوئی پرابلم ہو تو میرے کو فوراً بولو۔ ابھی آپ کو بھائی کا دوسرا "مسیج" مل جائے گا۔ آپ ہوٹل سے باہر جہاں جانا ہو جا سکتے ہو۔ پرکاش کو بولو وہ خود ارینج (ARRANGE) کرے گا۔ او۔ کے۔" اس مرتبہ دوسری طرف بات کرنے والا کوئی مقامی تھا لیکن گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ ان کی اہمیت سے آگاہ تھا۔

نجانے کیوں اس کا جی چاہا کہ کامنی کے ساتھ ایک مرتبہ دلی ضرور دیکھ لے۔ جانے زندگی میں پھر کبھی موقع ملے نہ ملے۔ اس کا حلیہ اب ایسا زبردست ہو گیا تھا کہ گرفتاری کے وقت کی تصویر اس سے ملتی ہی نہیں تھی۔

"یہ بھائی کا دوسرا "مسیج" کیا ہے؟" اس کو اچانک یاد آیا۔ کامنی واش روم سے تیار ہو کر باہر نکلی تو اس کی نظر پر ایک نظر ڈالنے کے بعد نبیل کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کامنی کو پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ نجانے اس کے سانولے چہرے پر ایسا کیا سحر آیا تھا کہ نبیل کے لیے اس پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔

"خیریت تو ہے نا سردار جی؟" کامنی نے اس کی طرف مسکراہٹ اچھالی۔

"کامنی تم بہت سندر ہو۔ بہت حسین ہو تم۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور کامنی کے موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے۔

نبیل جب واش روم سے تیار ہو کر باہر آیا تو منیجر پرکاش کا پیغام موجود تھا وہ اس سے ملنے کے لیے کمرے میں آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔

"اجازت ہے مہابلی؟" کامنی نے اس کی طرف جگر پاش نظروں سے دیکھا۔

"بلا لو بے چارے کو۔" نبیل نے بالوں میں کنگھی پھیرتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر بعد منیجر پرکاش "بھائی" کے اگلے "مسیج" کے ساتھ حاضر تھا۔ اس نے ایک بند لفافہ نبیل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھائی نے یہ آپ کو دینے کا حکم دیا ہے۔ گاڑی تیار ہے۔ ڈرائیور اور گارڈ آپ کے ساتھ ہوں گے۔ آپ نے جہاں بھی جانا ہو مجھے حکم دیں۔ بریک فاسٹ سے متعلق کیا حکم ہے؟" اس نے مودب لہجے میں دریافت کیا۔

"ابھی ہم ادھر کمرے میں بریک فاسٹ کریں گے کچھ آرام کے بعد کسی شاپنگ مال پر جائیں گے۔ کچھ گارمنٹس خریدنے ہیں۔" نبیل کے بجائے کامنی نے جواب دیا۔

"او۔ کے۔ میم...... کانٹی نینٹل بریک فاسٹ چلے گا کیا؟" پرکاش نے ان کی چوائس دریافت کی۔ "یا آپ جو بھی فرمائیں۔"

"ٹھیک ہے۔ کانٹی نینٹل چلے گا۔ کیوں منجیت؟" کامنی نے محبت سے پوچھا۔

"او۔ کے۔" نبیل نے سر ہلایا اور پرکاش کمرے سے چلا گیا۔

پرکاش کے باہر نکلتے ہی نبیل نے لفافہ چاک کیا دونوں حیران رہ گئے۔ یہ رقم ان کی توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ بھارتی کرنسی میں اس کے پاس پچاس ہزار روپیا آ گیا تھا۔

"زبردست۔ اچھی شاپنگ ہو جائے گی۔ کیوں میڈم؟" کہتے ہوئے نبیل نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

کامنی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا بات ہے یہ تم مجھے بار بار یوں اجنبیوں کی طرح کیوں دیکھنے لگی ہو؟ میرے سر پہ کیا سینگ نکل آئے ہیں؟" نبیل نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"منجیت ITS TOO MUCH (یہ بہت بڑی رقم ہے)" کامنی نے بے ساختہ کہا۔

"THEN WHAT? (پھر کیا؟) ارے یہ تو تمہاری ایک مسکراہٹ کی قیمت بھی نہیں۔" کہتے ہوئے اس نے سارے نوٹ کامنی کے اس بٹوے میں ڈال دیے جو اس نے اجمیر روانگی سے ایک روز پہلے خریدا تھا۔

کامنی اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ دونوں خاموش تھے۔ نبیل نے ٹی وی کا ریموٹ آن کیا اور سامنے ایک نیوز چینل کھل گیا۔ کئی چینل گھمانے کے بعد اس نے بالآخر کامنی کی طرف دیکھا۔

"کہاں فکس کروں؟"

"جہاں دل چاہے ... کوئی نیوز چینل لگا دو۔" کامنی نے کہا اور دروازے کی طرف متوجہ ہوئی کسی نے بڑی مودب دستک دی تھی۔

"یس کم ان۔" کامنی نے کہا اور دروازہ کھل گیا۔

پرکاش کی کمانڈ میں اس ہوٹل کی غالباً سب سے زیادہ خوبصورت دو ویٹرس اور ایک ویٹر نے ان کا ناشتہ اٹھا رکھا تھا جو کسی بارات کے ناشتے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے وہاں موجود میز پر تمام ڈشیں سجا دیں۔ میز پر تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں بچی تھی۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو سر تو۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے نبیل کی طرف دیکھا۔

"اس کے بعد بھی ... یہ بہت ہے مسٹر پرکاش...... بہت زیادہ۔" نبیل نے حیرت سے بریک فاسٹ دیکھا۔ یہی حال کامنی کا تھا۔

جس طرح یہ جلوس آیا تھا اسی طرح واپس لوٹ گیا۔

"آیئے ملکہ عالیہ۔" نبیل نے درباری انداز میں کامنی سے کہا جس نے بے ساختہ قہقہہ لگا دیا۔

دونوں نے شاید زندگی میں اتنا بھرپور بریک فاسٹ نہیں کیا تھا کہنے کو تو یہ کانٹی نینٹل بریک فاسٹ تھا لیکن اس میں انڈہ ڈبل روٹی سے دلی کی نہاری اور

پراٹھے تک موجود تھے۔

نبیل نے تو سیر ہو کر کھایا کیونکہ بہت عرصہ بعد اسے اس طرح کا کھانا نصیب ہوا تھا جبکہ کامنی نے اس کے ضد کرنے پر ہی اتنا کچھ کھا لیا تھا۔ اب دونوں گرم گرم کافی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆

قادر بھائی کے لیے یہ خبر کسی موت کی خبر سے کم نہیں تھی۔ ایک مرتبہ پھر راجن نے اسے شدید دھچکا لگایا تھا۔ سنگاپور کی فلائٹ سے آنے والی اس کی پانچ کروڑ کے ہیرے کسٹم نے اس کی دونوں کوریئر لڑکیوں سمیت پکڑ لیے تھے۔ یہ دونوں ایئر ہوسٹس تھیں جو عرصے سے قادر بھائی کے لیے بڑے خطیر معاوضے پر کام کر رہی تھیں۔ ان کی گرفتاری کے ساتھ ہی اسے کسٹم میں اپنے "سورس" انسپکٹر جانکی داس کا فون موصول ہوا تھا۔

"قادر بھائی یہ سارا دھندہ راجن نے چوپٹ کیا ہے۔ آج ادھر ڈیوٹی پر اچانک راجن والے ڈپٹی کی ڈیوٹی لگی تھی جس نے ساری فلائٹ چھوڑ کر دونوں ایئر ہوسٹس کو چیک کیا اور...."

"تم وہاں کیا جھک مار رہے تھے۔" قادر بھائی نے اسے تین چار گالیاں دے کر غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"بھائی یہ اوپر کا معاملہ ہے۔ اپن کی یہاں نہیں چلنے والی۔ بولا نا، ڈپٹی کرن خان اس کا خاص بندہ ہے۔" انسپکٹر جانکی داس نے اسے حقائق سے آگاہ کیا تو قادر بھائی کا ماتھا گھوم گیا۔

"ہیرے کو اس کی لاش چاہیے۔ آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہونی چاہیے۔ آخری رات۔ جاؤ جاؤ ہیرے کو راجن کی موت کی خبر چاہیے۔ سنا کیا؟" اس نے اپنے قریب موجود چھاکر کو مخاطب کیا۔

"قادر بھائی آج اسے خلاص کر کے گا۔ تیرے اس کی موت کی خبر سنے بغیر چھاکر واپس نہیں آئے گا۔ چلو۔" چھاکر نے اپنے چمچوں کی طرف دیکھا جو فلمی انداز میں صحن میں کھڑی گاڑی کی طرف لپک رہے تھے۔

اچانک ہی فون کی گھنٹی بجی۔ قادر کے ایک چمچے نے فون اٹھایا۔

"قادر بھائی دلی سے کیشب کا فون ہے۔" اس نے موبائل پر ہاتھ رکھ کر قادر بھائی کی طرف دیکھا۔

"وہ ہیرے کو...." اس نے غصے سے فون تھاما۔

"ہاں بول کیشب؟" غصہ ابھی تک برقرار تھا لیکن دوسری طرف کی اطلاع نے قادر بھائی کو قدرے نارمل کر دیا۔

"قادر بھائی ادھر شوبرا میں پنجاب سے راجن کا کوئی خاص بندہ آیا ہے۔ بڑے دم والا بندہ ہے سالا۔ ساتھ میں ایک لونڈیا بھی ہے۔"

شوبرا ہوٹل میں موجود قادر بھائی کے مخبر نے اسے دلی سے اطلاع دی تھی جو قادر بھائی کے نزدیک بہال کے سب سے بڑا تحفہ تھا۔

"ابے کیشب نظر رکھ سالے پر۔ ابھی تیرے سے پنڈت رابطہ کرتا ہے۔ جانے نہ پائے۔ سمجھ گیا نا؟" قادر نے بڑی بے چینی سے کہا۔

"قادر بھائی ہم تو تیرا غلام ہے بابا۔ ادھر ہی موجود ہوں میں۔"

"یہ ہوئی نا بات۔ اب آیا سالا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" قادر نے قہقہہ لگایا۔ اسے چھوڑ کر دلی میں پنڈت کا نمبر ملاؤ۔" اس نے اپنے چمچے کو حکم دیا۔

اگلے ہی لمحے "دلی کا ڈان" "پنڈت" لائن پر موجود تھا۔

(پل پل رنگ بدلتی اس سنسنی خیز داستان کی اگلی قسط شمارہ اکتوبر میں ملاحظہ فرمائیں)

تعاقب

طارق اسمٰعیل ساگر

خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے والے ایک نوجوان کی کہانی جو آسمان سے گرنے کے بعد کھجور میں اٹک گیا تھا

تعاقب

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

ملک نبیل کا تعلق گجرات کے ایک نواحی قصبے سے ہے خاندانی دشمنی کی وجہ سے اپنی والدہ اور بھائیوں کے حکم پر وہ غیر قانونی طور پر ایک لانچ کے ذریعے پاکستان سے بھاگ رہا ہے۔ لانچ سمندری طوفان میں گھر کر بھارتی نیوی کی فائرنگ کا نشانہ بنتی ہے۔ ملک نبیل گرفتار ہو کر بھارتی عقوبت خانے میں پہنچ جاتا ہے۔ ملک نبیل کی تفتیش ہوتی ہے دہشت گردی کا الزام لگتا ہے لیکن ثابت نہیں ہوتا جس پر انڈین انٹیلی جنس اُسے پاکستان کے خلاف بطور پراپیگنڈا استعمال کرتی ہے اور عالمی پریس کے سامنے اُسے دہشت گرد بنا کر پیش کرتے ہیں یہ خبر نبیل کے کزن ملک ناصر کو پاکستان انٹیلی جنس کے ذریعے ملتی ہے۔ ملک ناصر سے پاکستان انٹیلی جنس رابطہ کرتی ہے وہ انہیں یقین دلاتا ہے کہ اُس کا بھائی کوئی دہشت گرد یا جرائم پیشہ نہیں گردش حالات نے اُسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ انٹیلی جنس والے اُس کی بات مان لیتے ہیں۔ انسانی سمگلر سلطان خان کو لانچ تباہ ہونے کی اطلاع مل چکی ہے۔ نبیل کی تفتیش مکمل ہو چکی ہے اور اب پولیس اس کا چالان دلی کی تہاڑ جیل کے لئے لے جا رہی ہے، ملک نبیل حوالدار عجائب سنگھ کا اعتماد حاصل کر چکا ہے ٹرین پہاڑی اور جنگلی علاقے میں جا رہی تھی جب اچانک ایک زوردار دھماکے نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ٹرین پر علیحدگی پسندوں نے ان میں فوجیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر حملہ کیا تھا۔ سینکڑوں لوگ زخمی اور درجنوں مارے گئے عجائب سنگھ کی ٹانگ ٹوٹ گئی جسے ملک نبیل نے بڑی ہمت سے ڈبے سے باہر نکالا اور اُس کی ٹانگ کو پگڑی سے باندھ کر قدرے پرسکون کرنے کے بعد ایک محفوظ جگہ بٹھا دیا۔ عجائب سنگھ نے اُسے کہا کہ اس کی جیب میں موجود چابی سے ہتھکڑی کھولے اور چابی رکھ کر بھاگ جائے اس طرح کسی کو اُس پر شک نہیں ہوگا۔ ملک نبیل نے شکریہ ادا کیا اور سامنے جنگل میں فرار ہو گیا۔ نبیل کسی نہ کسی طرح جنگل میں ایک ٹھکانہ چھپنے کے لئے ڈھونڈ چکا ہے اور اب وہ تھکا ہارا سو رہا ہے جب اچانک اُس کی آنکھ شور کی آواز سے کھلتی ہے۔ اور کامنی جو بھلوا دیوی کے گروہ سے جان بچا کر بھاگی ہے نبیل سے ٹکرا جاتی ہے۔ بھلوا کے ساتھی اُس کے تعاقب میں ہیں دونوں مل کر جنگل سے نکلنے کا منصوبہ بناتے ہیں اور مختلف رکاوٹوں کو عبور کرتے ایک محفوظ جگہ پہنچتے ہیں۔ کامنی اُسے سامنے کا منظر دکھا رہی ہے۔ نبیل نے کامنی کی مدد سے جنگل کی اس خطرناک دنیا سے اپنا دامن چھڑا لیا، دونوں سرکاری محکمے کی جیپ میں بیٹھ کر فرار ہو گئے، دوران سفر کامنی نے اُسے اپنی کہانی سنائی تو نبیل نے دل میں عہد کیا کہ وہ کامنی کو محفوظ ٹھکانے پر پہنچائے بغیر کہیں نہیں جائے گا۔ دونوں اب ایک بس میں سفر کرتے ہوئے اگلے شہر پہنچے ہیں جہاں پولیس نے ناکہ لگا رکھا ہے۔ دوسری طرف ملک ناصر نے سلطان خان سے کراچی میں رابطہ کیا جس نے یقین دلایا کہ وہ ملک نبیل کو انڈیا سے نکالنے کے لئے اپنی جان لڑا دے گا اس نے نبیل کے لئے ایک فون نمبر دیا اور کہا جیسے ہی وہ رابطہ کرے اُسے یہ فون نمبر دے دیا جائے۔ نبیل اور کامنی سے اچانک سی آئی ڈی انسپکٹر کلونت ٹکراتا ہے جسے وہ مار کر اپنے کمرے میں فرار ہوتے ہیں اور اجمیر جانے والی ٹرین پر سوار ہو جاتے ہیں۔ (اب آگے پڑھیے)
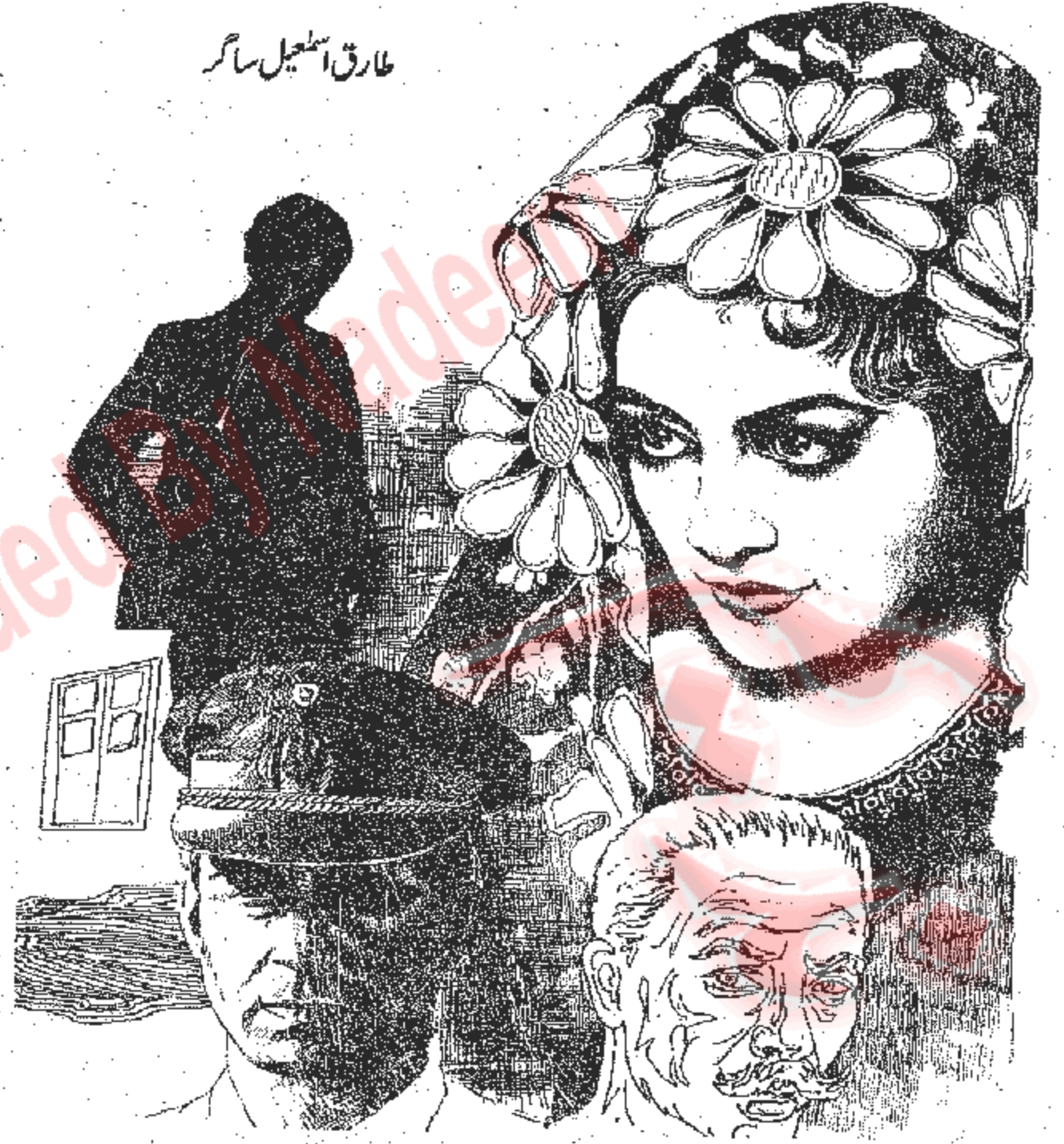
طارق اسمٰعیل ساگر

آخری قسط

"کیا حکم ہے قادر بھائی"......!

پنڈت کو جیسے ہی علم ہوا کہ لائن پر قادر بھائی موجود ہے، اُس نے اپنے ساتھ لیٹی فاحشہ کو جھٹکے سے پرے پھینکا اور فون اُٹھا لیا۔

"ہاں پنڈت...... ابھی کیشب کول وہ تیرے کو بتاتا ہے سب کچھ......"

اُس نے پنڈت کو اُس کا مشن سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے باس تعمیل ہوگی" پنڈت نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی غلطی نہ کرنا...... بڑی مشکل سے سالے راجن کو انڈر پریشر کرنے کا موقع ملا ہے"۔ اُس نے پنڈت کو "چیتاؤنی" دی۔

"میرے پر چھوڑ دو باس......" پنڈت نے اطاعت گزاری۔

"ٹھیک ہے"

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہوگیا۔

اگلے ہی لمحے وہ کیشب سے فون پر رابطہ کر رہا تھا اور کچھ دیر بعد دونوں ہوٹل کے باہر مختصر ملاقات کر رہے تھے، جس میں کیشب نے اُسے منجیت سنگھ کے متعلق آگاہی دیتے ہوئے بتایا تھا کہ آج دوپہر کے بعد کسی بھی وقت وہ ہوٹل سے باہر شاپنگ کرنے جائیں گے، کیونکہ پرکاش نے اُن کے لئے خصوصی گاڑی اور گارڈز تیار رکھنے کی ذمہ داری اُسے سونپی ہے۔ دونوں کے درمیان طے پایا تھا کہ وہ ہوٹل سے گاڑی کی روانگی پر ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہلے سے موجود پنڈت کے دونوں لڑکوں کو اشارہ کر دے گا جو موٹر سائیکل پر اس کار کا تعاقب کریں گے جس کے بعد پنڈت اُسے قابو کر لے گا۔

دونوں لڑکے کارروائی سے کچھ ہی دیر پہلے کیشب کا فون ملنے پر ہوٹل پہنچ گئے تھے اور جیسے ہی منجیت اور کامنی کی گاڑی تیار ہوئی وہ کیشب کے اشارے پر اُس کا تعاقب کرنے لگے۔ اُن کی طرف سے اطلاع ملنے پر پنڈت نے آگے بندوبست کیا ہوا تھا۔

○

ٹرک نے اس طرح اچانک اُن کا راستہ روکا تھا کہ ڈرائیور بھی بوکھلا کر رہ گیا، اُس نے پوری قوت سے بریک لگائے تھے لیکن گاڑی پھر بھی آہستہ سے ہی سہی ٹرک سے ٹکرا گئی۔

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ملک نبیل کے وہم و گمان میں بھی وہ کچھ نہیں تھا جو اگلے ہی لمحے وقوع پذیر ہوا۔

اُن کا باڈی گارڈ اور ڈرائیور دونوں اپنی دانست میں بڑی پھرتی اور غصے سے باہر نکلے تھے کہ اس ٹرک والے کی خبر لیں، جب اچانک ہی گاڑی کے دونوں اطراف دو موٹر سائیکلیں اُن کے قریب رُکیں۔ دو بندوقوں کا رُخ اُن کی طرف تھا، اس سے پہلے کہ باڈی گارڈ کو کچھ سمجھ آئے، ایک موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے مکروہ چہرے والے لڑکے نے باڈی گارڈ کی طرف پستول تان کر اُس کے ہاتھ سے بندوق چھین لی۔

اُس نے ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں کو اپنی پستول کی نوک پر لیا اور ٹرک کے ساتھ کھڑا کر دیا، جبکہ اُسی کے باقی ساتھی اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

"باہر نکلو"...... انہوں نے نبیل کی طرف پستول تان کر کہا۔

نبیل اس صورت حال سے کچھ گھبرایا ضرور تھا، لیکن وہ خوفزدہ نہیں تھا۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟...... اُس نے سنبھل کر پوچھا۔

"ابے آتا ہے یا اُسے تیرے سامنے......؟" بات اُدھوری چھوڑ کر اُن کے ایک ساتھی نے کامنی کا ہاتھ تھام کر اُسے باہر کی طرف کھینچنا چاہا۔

"ٹھہرو...... خبردار انہیں کچھ نہ کہنا۔ میں آتا ہوں تمہارے ساتھ"

نبیل نے کہا اور باہر آ گیا...... کامنی گھبرانا نہیں میں واپس آؤں گا۔ اُس نے کامنی سے کہا۔

ابھی وہ بمشکل کھڑا ہوا تھا، جب ایک تیز رفتار کار کے بریک اُن کے نزدیک چرچرائے کار کا پچھلا دروازہ کھلا جہاں ایک کونے میں مسلح غنڈہ موجود تھا، باہر کھڑے نوجوان نے نبیل کو اس طرح اچانک دھکا دیا کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر گرا اور باہر کھڑا نوجوان اپنی پستول سمیت اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

اب پوزیشن یہ تھی کہ نبیل دو مسلح غنڈوں کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے کار کے ایکسیلیٹر نے آواز نکالی۔ چکر کاٹا اور کار ہوا ہوگئی، جبکہ دونوں موٹر سائیکل سوار بھی اُن کے عقب میں چل دیئے تھے، البتہ اُنہوں نے روانگی سے پہلے سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے کار کے دونوں پچھلے ٹائر برسٹ کر دیئے تھے۔

ٹرک بھی اُن کے ساتھ ہی گیا تھا، اب وہ تینوں وہاں اکیلے تھے۔ ڈرائیور اور باڈی گارڈ دونوں غصہ اور بے بسی کے ملے جلے جذبات سے ایک دوسرے کی طرف اور کامنی احتجاجی انداز میں اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔

دونوں مغلظات اُگل رہے تھے۔ غصے میں کھول رہے تھے۔ پھر ڈرائیور نے ہوش کیا اور ڈیش بورڈ سے موبائل نکال کر کسی کا نمبر ملایا۔

"سر! بڑا "انیائے ہوگیا"...... اُس نے نمبر ملنے پر کسی سے کہا دوسری طرف سے پوچھنے پر اُسے مختصر واقعہ بتایا اور ہدایت ملنے پر "جی جی" کرنے کے بعد فون بند کر دیا۔

"میڈم آپ تشریف رکھیں۔ ہم ہوٹل واپس جا رہے ہیں، مطمئن رہیں ہم سر کو شام تک آپ کے پاس لے آئیں گے" اُس نے پریشان حال کامنی سے کہا جو گھبرا کر کار سے باہر نکل آئی تھی۔

اس نے اپنی آنکھوں میں آمنے آنسوؤں کو کمال ضبط سے روکا ہوا تھا۔

"بے بسی اور بذیانی آنکھوں سے اُس نے اُن کی طرف دیکھا اور وہیں بیٹھ گئی، جہاں پہلے بیٹھی تھی۔ کار میں منجیت سنگھ کے علاوہ سب کچھ موجود تھا۔ شاپنگ کے لفافے سیٹ پر دھرے تھے اور وہ موبائل جو منجیت نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ کمال ہوشیاری سے سیٹ کے نیچے پھینک دیا تھا تاکہ کامنی کے ہاتھ لگ جائے۔

تینوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے کہ حملہ آور کون ہیں؟

یہ کوئی اُچکے لٹیرے تو تھے نہیں۔ ایسا ہوتا تو وہ منجیت کے بجائے سامان اور کامنی پر توجہ دیتے۔ کون تھے یہ لوگ؟

ان کا ہم سے کیا لینا دینا؟

کیا اب کبھی وہ منجیت سے مل پائے گی؟ اُس نے کیوں کہا تھا کامنی گھبرانا نہیں۔ میں واپس آؤں گا"۔

کیا منجیت کو علم تھا کہ اُن کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے؟ اُس نے کامنی کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ اسے کیوں نہیں بتایا؟ شاید اس لئے کہ پھر کامنی اُسے ہوٹل سے باہر ہی نہ جانے دیتی؟ کامنی سوچتی رہی اُس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ گاڑی ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی۔

نبیل کو اس اچانک پیش آمدہ صورتحال نے بوکھلا کر رکھ دیا تھا، اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کسی کو اُس کے اغوا میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، وہ اس ملک میں پہلی مرتبہ اپنی بدقسمتی کے ہاتھوں پھنسا تھا، یہاں نہ کوئی اُسے جانتا تھا اور نہ ہی وہ کسی سے آشنا تھا۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟"...... اُس نے بالآخر حوصلہ کر کے اپنے اغواء کاروں سے دریافت کیا۔

جواب میں خاموشی طاری رہی، جس نے اُسے اُلجھن کا شکار کر دیا، اُسے اس بات پر غصہ آنے لگا تھا کہ ان لوگوں نے اس کی بات کا جواب کیوں نہیں دیا۔

جس گاڑی میں اُسے بٹھایا گیا اُس کے شیشے کالے تھے، اندر سے باہر کا منظر تو صاف دکھائی دیتا تھا، جبکہ باہر سے کچھ نظر نہیں آتا تھا کہ گاڑی میں کون سوار ہے۔

"تم لوگ کیا گونگے اور بہرے ہو"...... نبیل نے قدرے غصے سے کہا۔

"چپ چاپ بیٹھے رہو ورنہ...... اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے نوجوان نے دھمکی آمیز لہجے میں گردن موڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ورنہ کیا؟ کیا کر لو گے میرا؟"۔ نبیل چاہتا تھا انہیں غصہ دلوا کر کوئی تو بات اُن کے منہ سے نکلوائے۔

"ابے چپ کرتا ہے یا اُتاروں تیرے بھیجے میں گولی"......

ساتھ بیٹھے ہٹے کٹے غنڈے نے اُس کی پسلیوں میں پستول کی نالی دباتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تم جو کوئی بھی ہو۔ میرا تم سے کچھ لینا دینا نہیں، میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں...... تم ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہوئے ہو" نبیل نے انہیں سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اُسے اب تک واقعی اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کوئی اُسے کیوں اغواء کرے گا۔

"اگر بھائی کا حکم نہ ہوتا تو تیری زبان تیرے تالو سے الگ کر کے پھینک دیتے"۔

اگلی سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے کہا۔

"بھائی کا حکم"...... نبیل نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اب اُسے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی کہ یہ کون ہیں! اُسے علم تھا کہ انڈیا میں "بھائی لوگ" کن کو کہتے ہیں!

لیکن وہ "بھائی لوگوں" کی لڑائی میں کہاں پھنس گیا۔

اچانک ہی ایک خیال نے اُسے لرزا کر رکھ دیا۔

اس نے سوچا وہ بھی تو کسی "راجن بھائی" کی پناہ میں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ راجن کے کسی دشمن نے اُسے راجن کا خاص بندہ جان کر اُٹھا لیا ہو۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف اسی نوعیت کی کارروائیاں کرتے رہتے تھے۔

"کون ہو سکتا ہے وہ؟"...... اُس نے خود سے سوال کیا اور کوئی جواب نہ ملنے پر تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہا۔

یہ بہت پر اعتماد لوگ تھے یا پھر پرلے درجے کے بے وقوف ابھی تک نبیل کو سمجھ نہیں آئی تھی کیونکہ وہ دلی کی بھری پُری سڑکوں پر گاڑی چلا رہے تھے، اُنہیں اسی بات کی پرواہ بھی نہیں تھی کہ کوئی انہیں چیک کر سکتا ہے۔ دلی کی سڑکوں پہ پولیس بھی موجود تھی۔

"تم جو کوئی بھی ہو۔ یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے غلط بندے کو اُٹھا لیا ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو ان کی بہت قیمت چکانی پڑے گی۔ سمجھے تم"؟ نبیل نے اپنی دانست میں انہیں غصہ دلانے کی کوشش کی تھی، لیکن اُس کی توقعات کے برعکس اغواء کاروں نے زوردار قہقہے لگا کر اُس کی بے بسی کا مذاق اُڑایا اور اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگے، جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت چیز ہے۔

اچانک ہی گاڑی کو زوردار جھٹکا لگا۔ نبیل کو اندازہ ہو گیا کہ دلی کی اس ٹریفک میں ڈرائیور نے اپنی دانست میں تیزی دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی کار ایک دوسری کار کو اوورٹیک کرتے ہوئے آگے جانے والے ایک لوڈر راکشے سے ٹکرا گئی تھی۔

جس لوڈر سے گاڑی ٹکرائی تھی اُس کا سکھ ڈرائیور اور اُس کا ساتھی زور زور سے گالیاں دیتے باہر آ گئے تھے اور اب وہ ڈرائیور کے دروازے پر کھڑے تھے۔

"باہر نکل اوئے (سکھ نے جو شاید نشے میں تھا اسے گالی دے کر کہا)

"سردار جی! جانے دیں۔ غلطی تمہاری ہے"......

ڈرائیور نے اپنے بے قابو غصے کو کنٹرول کرتے ہوئے چاہا کہ کسی طرح آگے نکل جائے۔ لیکن لوڈر ایسی پوزیشن میں کھڑا تھا کہ وہ ایک انچ بھی دائیں بائیں نہیں ہو سکتا تھا۔

"کہاں پھنسا دیا سالے"...... آگے بیٹھے غنڈے نے ڈرائیور کو گالی دے کر کہا، اسی اثناء میں اُن کے پیچھے آگے دائیں بائیں گاڑیوں کی قطار لگ گئی تھیں۔

دونوں سکھ انہیں مسلسل گالیاں دے کر للکار رہے تھے۔ بالآخر ڈرائیور کے لئے خود پر قابو رکھنا ناممکن ہو گیا وہ مغلظات بکتا باہر نکل آیا اور سکھوں سے گتھم گتھا ہو گیا۔

تین چار ایکشن ایک ساتھ ہوئے تھے۔ پولیس کے تین چار جوان بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔ اگلی سیٹ والا غنڈہ گالیاں دیتا دوسرے سکھ سے ٹکرایا تھا۔ درجنوں لوگوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔

"کیا بات ہے...... کیا ہوا، باہر نکلو۔ باہر نکلو" پولیس والوں کی آوازیں سنائی دیں۔

نبیل کے دائیں بائیں بیٹھے اغوا کاروں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اپنے پستول اگلی سیٹوں کے نیچے رکھ دیے دروازے کھول کر باہر آ گئے۔

نبیل نے بھی اُن کی تقلید کی تھی۔ اُن کے گرد تماش بینوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ دونوں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر سکھوں پر حملہ آور ہوئے تھے جن کی مدد کے لئے نبیل نے سڑک کے دوسری طرف سے تین چار سکھوں کو بھاگ کر اس طرف آتے دیکھا تھا، قریباً تمام لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ کوئی انہیں آپس

میں لڑنے سے منع کر رہا تھا۔ کچھ لوگ باقاعدہ لڑائی چھڑانے کی کوشش میں دو تین گھونسے کھانے کے بعد انہیں گالیاں دے رہے تھے۔ پولیس والے ڈنڈے لے کر اُن پر پل پڑے تھے۔ شور بڑھتا جا رہا تھا اور اس سے بڑی غیبی مدد کا نبیل تصور ہی نہیں کرسکتا تھا۔

وہ بڑی ہوشیاری سے ہجوم کے اندر ہی اندر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ اپنے اپنے کام میں مصروف لوگوں میں سے کسی کا دھیان اس لئے بھی اُس کی طرف نہیں گیا کیونکہ وہ اس لڑائی کا حصہ نہیں بنا تھا۔ جبکہ باقی چاروں گدھے اپنے کام میں جتے تھے۔ بمشکل تین چار منٹ میں وہ اغواہ کاروں کی گرفت سے نکل کر سڑک کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ اُسے دو ہی جگہوں کے نام یاد تھے ایک تو گاندھی پارک کا ''شوبرا ہوٹل'' جہاں وہ قیام پذیر تھے اور دوسرے کناٹ پیلس جہاں سے اُنہوں نے شاپنگ کی تھی۔ اُسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں سے ہوٹل کتنی دور ہے۔ البتہ اُسے اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کناٹ پیلس سے صرف پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر ہے۔

حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کسی نے اُس کی تلاشی نہیں لی تھی اور اُس کی جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ نبیل نے بجلی کی سی پھرتی سے اُس آٹو رکشہ کے ڈرائیور تک رسائی حاصل کی تھی جو رکشہ کے باہر پنجوں کے بل پر کھڑے ہو کر سڑک کے دوسری طرف لگے تماشے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ''کناٹ پیلس چلے گا کیا؟'' اس نے اچانک ہی ڈرائیور کے کندھے کو تھپتھپا کر پوچھا۔

ڈرائیور نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

''ارے یہ تماشا تو یہاں لگا ہی رہتا ہے'' ۔ پھر کبھی دیکھ لینا چل میرے کو جلدی نکلنا ہے''......مقامی زبان کا انداز اپناتے ہوئے اُس نے ڈرائیور سے کہا اور اُس کا جواب سنے بغیر رکشہ میں بیٹھ گیا۔

ڈرائیور اگلے ہی لمحے سیٹ پر موجود تھا۔ اُس نے میٹر ڈاؤن کیا اور چل دیا۔ اپنی سواری کے کپڑوں سے اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ کوئی ''موٹی آسامی'' ہے اور بڑی پھرتی سے آٹو رکشہ چلاتا اگلے بیس منٹ میں کناٹ پیلس پہنچ گیا۔

''کہاں اُتریں گے صاحب''...... اُس نے نبیل سے پوچھا۔ ''بس یہیں اُتار دو''......نبیل اس کے علاوہ کیا جواب دیتا اس نے میٹر پر بنے کرائے سے جب پانچ روپے زائد دیئے تو رکشہ ڈرائیور نے اس کے لئے دعاؤں کا وظیفہ شروع کر دیا اُس کے دعائیں دینے کے انداز سے نبیل کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا مخاطب مسلمان ہے۔

○

پرکاش کے فون نے راجن کا پارہ آسمان پر پہنچا دیا تھا اُس کے لئے زندگی میں اس سے بڑی ذلت اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی کہ دبئی سے مستان بھائی نے اُسے پہلی مرتبہ ایک اہم کام سونپا تھا، اُسے ان دونوں کو مستان بھائی تک پہنچانا تھا اور اب یہ خبر مل رہی تھی کہ اُسی کا مہمان اغواہ ہو گیا ہے۔

راجن نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ دلی میں پرکاش سے زیادہ قابل اعتماد بندہ اُس کے لئے اور کوئی نہیں ہوسکتا اور یہ ناممکن ہے کہ پرکاش نے اُس کے مہمانوں کی حفاظت میں کوئی کمی کی ہو۔

''دلی میں اپنے تمام لڑکوں کو ایکٹو کر دے۔ یاد رکھنا پرکاش اگر ہمارے مہمان کو کچھ ہو گیا تو راجن بھائی اس ذلت سے مرنا بہتر سمجھے گا''۔

یہ کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا ابھی اپنے ساتھیوں سے بات ہی کر رہا تھا جب اُس کے ''کار خاص'' نے اطلاع کر دی کہ یہ ''قادر بھائی'' کا کارنامہ ہے۔ راجن کو فوراً سمجھ آگئی کہ قادر بھائی نے اپنے ہیروں کا بدلہ لینے کے لئے یہ گھناؤنا اقدام کیا ہے۔

''لیکن اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ منجیت سنگھ اُس کا مہمان ہے؟''

راجن نے سوچا اور فوراً ہی پرکاش کا نمبر ملایا۔

''میری بات دھیان سے سن''......اُس نے سلسلہ ملتے پر کہا۔

''یہاں تیرے قریب کوئی آستین کا سانپ ہے جسے اس بات کا علم تھا کہ یہ میرے مہمان ہیں۔ اس نے قادر بھائی کو اطلاع دی ہے اور یہ تو جانتا ہے تو کہ دلی میں ''چنڈت'' ہی اُس کا خاص آدمی ہے۔ اُسے قابو کر ......اور ہاں ہوٹل میں قادر کے مخبر کو ڈھونڈ اور سالے کو پیک کر کے قادر تک پہنچا دے...... سمجھ گیا ناں''

''راجن بھائی آج شام سے پہلے آپ کا مہمان ہمارے ساتھ ہوگا۔ میں ساری اسٹوری سمجھ گیا ہوں...... اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو......دلی میں راجن بھائی کے بندے کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھے یہ میرے لئے قابل برداشت نہیں راجن بھائی''...... پرکاش آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

''اے پرکاش بھیجا ٹھنڈا رکھ۔ بہت سوچ سمجھ کر تیرے کو کچھ کرنے کا ہے سمجھ گیا ناں...... ایک دم فریز ہو جا......ایک دم......'' راجن کے لہجے میں جانے کیا قہر چھپا تھا کہ پرکاش ایک دم فریز ہو گیا۔

○

دونوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ راجن بھائی کے سامنے اس کے دو اہم مہرے بیٹھے تھے۔

''عثمان''...... اس نے ایک گٹھے جسم اور چھوٹی داڑھی والے نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا......''بڑا گہرا زخم لگایا ہے۔ میرے کو قادر نے...... مجھے شام سے پہلے پہلے اُس کے دو بندے چاہئیں، دونوں خاص بندے...... میری بات سمجھ گئے ناں۔ تبادلہ کرنا ہے۔ اپنا بندہ واپس لینا ہے اُس سے......'' اس نے عثمان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''عثمان بھائی بے فکر ہو جا...... تیرا کام ہو جائے گا......'' عثمان نے بڑے پُریقین لہجے میں کہا اور اپنے موبائل فون سے مختلف نمبر ملا کر اپنے چمچوں کو احکامات جاری کرنے لگا۔ راجن اب اپنے دوسرے ساتھی سے مخاطب تھا۔

شائستہ اعجاز کی ڈائری

میری ڈائری میں تحریر سعد اللہ شاہ کی یہ غزل جو مجھے بہت پسند ہے،

رنگ اُترنے میں بہت دیر لگی
دل ٹھہرنے میں بہت دیر لگی
تیری آنکھوں کی طرح گہرا تھا
زخم بھرنے میں بہت دیر لگی
بات کرنا تھی ذرا سی تجھ سے
بات کرنے میں بہت دیر لگی
کٹ گئی رات تیرے خوابوں میں
دن گزرنے میں بہت دیر لگی
کب سمیٹا تھا کسی نے مجھ کو
کب بکھرنے میں بہت دیر لگی
زندگی گزری ہے پل میں میری
سعد مرنے میں بہت دیر لگی

(شائستہ اعجاز......کراچی)

”ابے ٹھاکر...... سن لیا ناں تو نے...... میرے کو ذلت نہیں اُٹھانے کا...... مستان بھائی کو ناراض کرنے کا مطلب سمجھتا ہے ناں تو...... سارا دھندہ چوپٹ...... سالے پولیس والے چوہوں کی طرح مار ڈالیں گے ہمیں اگر انہیں معلوم پڑ گیا کہ مستان بھائی ہم سے ناراض ہے......“

اُس نے اپنے ساتھی کو ”چیتاونی“ دی۔

”راجن بھائی ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ میں نے تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ اس سے جان چھڑا لے۔ بولے تو سالے کو آج ہی خلاص کرتا ہوں......“

ٹھاکر نے اپنے مخصوص مراٹھی انداز میں کہا۔

”نہیں ٹھاکر، ابھی نہیں۔ ارے دشمن کو مارنا کوئی بہادری نہیں۔ کوئی بچہ بھی اُسے چھپ کر گولی مار سکتا ہے...... میں تو اُسے للکار کر ماروں گا۔ سب کے سامنے...... سسکا سسکا کر ماروں گا سالے کو“ اُس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

”جلدی کر لے راجن بھائی۔ بہت پریشانی پیدا کرنے لگا ہے سالا......“

ٹھاکر نے اُس کی طرف دیکھا۔

”بس دیکھتا جا...... اب تو نکل......“ راجن نے کہا اور دوسرے ہی لمحے ٹھاکر وہاں سے نکل گیا۔

عثمان اور ٹھاکر دونوں انڈر ورلڈ کے ”چیتے“ تھے اور راجن بھائی کو اس بات کا یقین تھا کہ اُس کے دونوں نمک خور معاملے کی سنگینی سے آگاہ ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ اصل میں اُن سب کا دھندہ مستان بھائی کی نظر کرم کا محتاج ہے۔ اگر اُسے اس حادثے کی بھنک بھی لگ گئی تو وہ اُن کو زندہ درگور کر دے گا۔

O

کیشب ہوٹل کی پارکنگ میں اپنا موٹر سائیکل نکال کر سٹارٹ کرنے کی تیاری میں تھا۔ اُسے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ پنڈت نے منجیت سنگھ کو اغوا کر لیا ہے اور اب اُسے قادر بھائی کی طرف سے بڑا انعام ملنے والا تھا۔ وہ ممبئی میں بھی قادر بھائی کے لئے کام کرتا تھا، لیکن پولیس میں دو تین کیس درج ہونے کے بعد اپنے آبائی شہر دلی میں آ گیا تھا۔ قادر بھائی سے چونکہ اُس کے دیرینہ تعلقات تھے اور اُس کے چھوٹے موٹے کام بھی وہ کرتا آ رہا تھا، یہاں بھی اُس نے قادر بھائی کو اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ممبئی کے انڈر ورلڈ مافیا کے جتنے بھی ”ڈان“ ہیں اُن کے لئے دلی سرکار تک رسائی بہت ضروری ہے۔ ان لوگوں نے دلی میں اپنے اپنے ٹھکانے بنا رکھے تھے اور یہاں بھی وہ معاملات کو ممبئی کی طرح چلا رہے تھے۔

اُس کی ڈیوٹی تو صبح 8 بجے ختم ہو گئی تھی لیکن وہ اب تک جان بوجھ کر یہاں رہا تھا تاکہ اپنے کام کا انجام دیکھ کر ہی جائے، اُسے یہ دھڑکا بہرصورت لگا ہوا تھا کہ اگر پرکاش کو جو دلی میں راجن بھائی کا ”کارخاص“ تھا اس بات کی بھنک بھی لگ گئی کہ اس نے یہ حرکت کی ہے تو دلی میں کوئی اُسے بچانے نہیں آئے گا۔ پرکاش کے ہاتھ بہت لمبے تھے اور وہ یہاں شوبرا ہوٹل میں صرف اس لئے ملازمت کر رہا تھا کہ یہ دراصل راجن بھائی کا ہوٹل تھا۔ قادر بھائی کو اس بات کا علم تھا اور اُس نے کسی نہ کسی طرح کیشب کو یہاں فٹ کروا دیا تھا، کیونکہ ممبئی میں بھی اُسی نے گیارہ سال ہوٹلوں کی نوکری ہی کی تھی اس تجربے کی بنیاد پر اُسے یہاں بھی جاب مل گئی۔

شوبرا ہوٹل میں اُس کی تنخواہ تو اُس کی مرضی کے مطابق نہیں تھی لیکن قادر بھائی کے حکم پر اُس کو یہیں قیام کرنا تھا، کیونکہ ہوٹل سے دوگنا زیادہ ماہوار تنخواہ تو قادر بھائی اُسے خود دیا کرتا تھا۔ کیشب کو ہر بری علت لگی ہوئی تھی اُسے روزانہ شراب، شباب درکار تھا اور یہ ناممکن تھا کہ وہ مہینے میں ایک دو مرتبہ گھڑ دوڑ پر جوا نہ کھیلے، جس میں وہ کبھی کبھی جیت بھی جاتا تھا۔ جبکہ اکثر ہارتا ہی تھا، لیکن حساب کتاب کرنے کے بعد اُسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ زیادہ خسارے میں نہیں جا رہا۔

شوبرا ہوٹل میں اُس نے اپنے کردار کے بالکل برعکس انداز اپنایا تھا اور یہاں ایک مظلوم کی حیثیت سے نوکری حاصل کی تھی۔ اُس نے پرکاش کو بتایا تھا کہ اُس کی ماں کینسر کی مریض ہے، جبکہ دو بچے معذور ہیں، جن کی کفالت بہرحال ایک مسئلہ تھا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اُس نے کبھی شادی بھی نہیں کی تھی وہ ایسے جھنجٹوں کا قائل ہی نہیں تھا۔ ممبئی سے اُس کے فرار کا بڑا سبب ایک ایسی ہی لڑکی بنی تھی جو اُس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ تامل ناڈو کی رہنے والی اُس معصوم لڑکی کو جو ممبئی کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہی تھی اُس نے بڑی چالاکی سے شیشے میں اُتارا، اُس کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کئے اور جب اُسے حمل ہوا اور اُس نے شادی کے وعدے یاد دلانے شروع کئے تو کیشب کے لئے بڑے مسائل کھڑے ہو گئے۔

کسی نہ کسی طرح اُس نے لڑکی کو حمل گرانے پر راضی کیا اور اپنی ایک واقف عطائی ڈاکٹر کے پاس لے گیا، جس نے دوران آپریشن غلطی سے زچہ و بچہ دونوں کو مار ڈالا۔ لڑکی کا والد وکیل تھا اُس نے کیشب کا ناطقہ بند کر دیا۔ قادر بھائی نے اُسے ہر مرحلے پر بچایا، لیکن اب اُسے پولیس سے بچانا ممکن نہیں رہا تھا، کیونکہ لڑکی کے وکیل والد نے ہیومن رائٹس والوں سے رابطہ کر لیا تھا۔

ہیومن رائٹس کی یہ ”مہلائیں“ اپنے ٹارگٹ کو انجام تک پہنچانے سے پہلے کبھی چین سے نہیں بیٹھتی تھیں اور کیشب کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اب قادر بھائی بھی اس کے لئے کچھ نہیں کر سکے گا۔ جس روز ان ”مہلاؤں“ نے پہلا مظاہرہ کیا وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دلی بھاگ آیا۔ چالاک بندہ تھا نہ اُس کے اصلی ٹھکانے کی کسی کو خبر تھی نہ اُس نے کبھی کسی کو بتایا۔ اس کے ساتھی یہی سمجھتے ہے کہ وہ راجستھان کا رہنے والا ہے، صرف قادر بھائی کو اُس نے اعتماد میں اس لئے لیا تھا کہ سونے کے انڈے دینے والی اس مرغی سے اُسے ابھی انڈے ملنے کی اُمید تھی۔ اُس نے دلی میں بھی کسی کو اپنی اصلیت نہیں بتائی تھی اور ہر جگہ اپنے متعلق مختلف کہانیاں سنائی ہوئی تھیں۔ اُسے اس بات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا کہ کل کیا ہوگا۔ اس نے خود کو ہمیشہ آج کے لئے زندہ رکھا تھا۔

قادر بھائی کے لئے اُس نے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ قادر بھائی کے ذریعے ہی ''پنڈت'' نے اُس سے رابطہ قائم کیا تھا اور اب پنڈت اور اُس کے ساتھی لڑائی جھگڑے کے الزام میں اپنی ضمانتیں کروا رہے تھے۔ پولیس والوں نے کہ پنڈت اُن کا مستقل گاہک تھا گاڑی کی تلاشی لے کر اسلحہ برآمد نہیں کیا۔ پنڈت کو گاڑی سمیت بھگا دیا تھا۔ جبکہ اُس کے تینوں ساتھیوں کو لاک اَپ میں دونوں سکھوں کے ساتھ بند کر دیا تھا۔

پنڈت کے لئے انہیں لاک اپ سے نکالنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ سڑک پر ہونے والے اس لڑائی جھگڑے کی میڈیا نے کوریج کر لی تھی اور اب انہیں بھگانے کا سیدھا مطلب تھا اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھونا۔ میڈیا نے صبح سے شام تک اس خبر کا سیاپا کیا تھا۔ پنڈت کی خوش قسمتی تھی کہ کسی نے اُسے شناخت نہیں کیا ورنہ اُسے بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی اپنی ضمانت کروانی پڑتی۔

کیشب کو اسی سانحے کی خبر نہیں تھی اُسے صرف یہ علم تھا کہ اس کا مشن مکمل ہو گیا اور آج نجبر وار ہونے کی وجہ سے وہ قادر بھائی کی طرف سے ملنے والے خصوصی انعام کے بل بوتے پر خاص سنڈے نائٹ منائے گا، اُس نے چار پانچ روز پہلے ہی ایک ''کال گرل'' سے تعلقات قائم کئے تھے جو اُس کے جنسی معیار کے عین مطابق تھی، لیکن اس کا ریٹ کیشب کے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا جو اب حل ہو چکا تھا۔

○

''کیا بات ہے کیشب۔ بڑی جلدی جا رہے ہو''......

اچانک ہی عقب سے اُسے پرکاش کی آواز سنائی دی جس نے اُس کے اعصاب پر ٹائم بم چلا دیا۔

''سر جی وہ میں نے میڈم سوانی کو بتا دیا ہے۔ ماتا جی کو ہسپتال لے جانا ہے آج...... بڑی مشکل سے وقت ملا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں یہاں سرکاری ہسپتالوں کا کیا حال ہے...... میں غریب آدمی ہوں سر جی۔ وہ تو آپ کی کرپا سے کچھ دھندہ چل رہا ہے ورنہ تو شاید ماتا جی کے لئے کچھ نہ کر پاتا...''

اُس نے اپنی روایتی چرب زبانی کا مظاہرہ کیا۔

''پرکاش نے نزدیک آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''چھوڑو یار۔ چلے جانا۔ اِدھر آؤ ایک ضروری کام ہے تم سے، یہ سالے ایکسائز والے جان کو آ گئے ہیں...... تم ہی نمٹ سکتے ہو ان سے''

پرکاش نے کوئی تاثر دیئے بغیر اُس سے معمول کے مطابق بات کی، کیشب کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ یہاں سارا کھیل ہی بگڑ گیا ہے۔ اُس نے بادل نخواستہ موٹر سائیکل دوبارہ سٹینڈ پر کھڑی کی اور پرکاش کے ساتھ چلتا ہوا بیسمنٹ کے اُس بڑے ہال کمرے تک پہنچ گیا، جس سے وہ لوگ گودام کا کام لیا کرتے تھے لیکن یہاں خلاف توقع تین اجنبی چہرے بھی اُس کے منتظر تھے جبکہ چوتھے کی شناخت اُسے ہو چکی تھی یہ منجیت سنگھ تھا جو اُسی کی اطلاع کے مطابق اغواء ہو چکا تھا لیکن اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

کیشب کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔ اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ پرکاش نے اس کے چہرے پر اُڑتی ہوائیاں اور بدلتی رنگت کو محسوس کر لیا تھا۔

''کیا بات ہے کیشب تمہاری طبیعت خراب ہو گئی ہے کیا؟'' اُس نے اچانک ہی طنزیہ لہجے میں کہا اور کیشب سمجھ گیا کہ اب وہ مارا گیا۔

''ممم مجھے شما کر دیں۔ بھگوان کے لئے مم مجھے شما (معاف) کر دیں'' اچانک ہی پرکاش کے قدموں سے لپٹ گیا'' پرکاش نے اُسے کندھے سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''لیکن کس بات پر...... تم نے ایسا کیا جرم کیا ہے جس پر اس طرح معافیاں مانگ رہے ہو''......

''ممم میں نے......''

بات نامکمل ہی تھی جب وہاں موجود اُس کے منتظر میزبانوں نے اُس کی دھلائی شروع کر دی۔ کیشب کے حلق سے خوف کے مارے ایسی عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں، جن کی نبیل کو تو بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

○

نبیل کناٹ پلیس سے ایک ٹیکسی کے ذریعے شوبرا ہوٹل پہنچا تھا۔ اُس کی اچانک آمد نے پرکاش کو خوش ہونے سے زیادہ حیرت زدہ کر دیا۔

''سر جی آپ......'' اُس نے خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں...... دلی کی ٹریفک کا شکریہ جس نے ان درندوں سے میری جان چھڑا دی۔ ورنہ تو وہ مجھے......''

نبیل اُدھورا فقرہ چھوڑ کر مسکرانے لگا۔

''Thank God'' بے ساختہ پرکاش کے منہ سے نکلا...... مجھے بہت افسوس ہے سر! آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ آپ کو ہماری وجہ سے تکلیف ہوئی......'' اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی تھی۔

پرکاش اُسے کمرے تک چھوڑنے آیا تھا جہاں پریشان حال کامنی حیرت زدہ ہو کر سسکیاں لیتی اس سے لپٹ گئی۔ جسے نبیل نے بمشکل نارمل کیا جس کے بعد اس نے کامنی سے جدا ہونے کے بعد کی ساری کہانی اُسے سنائی۔

غزل

اس سے پہلے کہ زمیں زاد، شرارت کر جائیں
ہم ستاروں نے یہ سوچا ہے کہ ہجرت کر جائیں
دولت خواب ہمارے جو کسی کام نہ آئی
اب کسی کو نہیں ملنے کی، وصیت کر جائیں
دہر سے ہم یونہی بیکار چلے جاتے تھے
پھر یہ سوچا کہ چلو، ایک محبت کر جائیں
اک ذرا وقت میسر ہو تو آ کر میرے دوست
دل میں کھلتے ہوئے پھولوں کو نصیحت کر جائیں
ان ہوا خواہوں سے کہنا، کہ ذرا شام ڈھلے
آئیں اور بزم چراغاں کی صدارت کر جائیں
دل کی ایک ایک خرابی کا سبب جانتے ہیں
پھر بھی ممکن ہے کہ ہم تم سے مروت کر جائیں
شہر کے بعد تو صحرا تھا، میاں، خیر ہوئی
دشت کے پار بھلا کیا ہے کہ وحشت کر جائیں
ریگ دل میں کئی نادیدہ پرندے بھی ہیں دفن
سوچتے ہوں گے کہ دریا کی زیارت کر جائیں

(ادریس بابر)

''مجھے تو پہلے ہی ڈر لگا ہوا تھا کہ یہ ''بھائی لوگ'' بڑے خطرناک ہوتے ہیں، منجیت اب تمہارا کیا پروگرام ہے''؟ اُس نے نبیل کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

نبیل اُس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''کامنی اگر تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو تو مطمئن ہو جاؤ۔ یہ لوگ کون ہیں اچھے ہیں؟ بُرے ہیں؟ مجھے اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہمیں یہ آسرا میرے بڑے بھائی صاحب کی طرف سے ملا ہے اور میں اُن پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا تم بھگوان پر کر سکتی ہو...... یہ حادثہ تھا۔ ممکن ہے کسی غلط فہمی میں ہو گیا ہو۔ لیکن اپنے جیتے جی یہ لوگ ہم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے...... کامنی

ہمارے اگلے پروگرام کی خبر بھی ہمارے "میزبانوں" ہی کو ہے۔ اسی لئے میں نے ابھی تک تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دیا، لیکن تمہیں یقین دلاتا ہوں میرے جیتے جی کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔" نبیل نے یہ بات معمول کے مطابق کی تھی، لیکن کامنی کا ردِعمل بہت جذباتی تھا وہ نثار ہونے کے انداز میں اُس سے دیر تک چمٹی رہی۔

شاپنگ بیگ سامنے دھرے تھے.....!

پرکاش نے اُن کے لئے کمرے میں چائے اور لوازمات بھیج دیئے تھے اور نبیل کو بتایا تھا کہ آج رات کی فلائیٹ سے وہ ممبئی جارہے ہیں۔ نبیل نے یہ خبر فوراً کامنی سے شیئر کی تھی جس نے اُس پر دل سے صاد کردیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی پرکاش اجازت لے کر اُس کے کمرے میں آیا تھا اُس نے نبیل سے نیچے چلنے کی درخواست کی تھی اور یہاں لا کر اُسے یہ "سرپرائز" دیا تھا۔

"آیئے سر! آپ کو زحمت ہوئی۔ معافی چاہتا ہوں"..... پرکاش نے اُسے کہا اور دونوں وہاں سے باہر آگئے۔

کیشب کا اُن لوگوں نے کیا حشر کیا؟ نبیل کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ آستین کے سانپ کی کم از کم سزا کیا ہوسکتی ہے۔ اب وہ اپنے کمرے میں کامنی کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اُسے اب تک پے در پے جس قسم کے حادثات کا سامنا ہوا تھا اور جیسے ایک کے بعد دوسری مصیبت اُس کے گلے لگی تھی حیرت انگیز طور پر قدرت نے اُسے ان مصیبتوں سے کھن سے بال کی طرف نکال بھی لیا تھا۔ جس سے نبیل کو یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ جلد یا بدیر وہ اپنے وطن ضرور واپس جائے گا۔

اُس نے محسوس کیا تھا کہ اُس سے ملاقات کے بعد کامنی کے رویّے میں بہت تبدیلی آگئی ہے وہ اب تک ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں کیسے رہی تھی؟ یہ بات ابھی تک نبیل کو ہضم نہیں ہورہی تھی۔ سوائے کامنی کی بہادری اور جنگل میں درپیش واقعات کے اُس نے کامنی کے رویے میں کبھی شدت پسندی نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے محسوس کیا تھا کہ نبیل سے ملاقات کے بعد جیسے جیسے وہ نبیل کے قریب آرہی تھی اُس کا رویہ روایتی مشرقی گھرانوں کی لڑکیوں جیسا ہورہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اُس نے شلوار قمیض پہننا شروع کردی تھی اور سکھ لڑکیوں کی طرح اپنا سر بھی ڈھانپ کر رکھتی تھی کیونکہ ابھی تک نبیل اُس کے نزدیک منجیت سنگھ ہی تھا۔

کیشب کے ساتھ اُن لوگوں نے کیا سلوک کیا ہوگا؟ اس کا علم تو نبیل کو نہیں تھا لیکن اس کا اندازہ ضرور تھا کہ انہوں نے کیشب کو معاف نہیں کیا ہوگا۔ جس دنیا کے یہ مکین تھے وہاں شاید کسی کو معاف کرنے کی گنجائش ہی موجود نہیں تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو کامنی"؟

کمرے کی کھڑکی سے ٹیک لگائے اپنے خیالات میں گم کامنی سے اُس نے اچانک ہی سوال کیا تو وہ چونکی۔

"کچھ نہیں..... فائنل ایئر میں ہم اپنے کالج کی طرف سے ٹرپ پر دلی آئے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی تھی۔ اُن دنوں کی کچھ یادیں تازہ کررہی ہوں....." کامنی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔

"ماضی کبھی کسی کی جان نہیں چھوڑتا۔ اچھا یا برا۔ ہر شخص اُسے یاد ضرور کرتا ہے"..... نبیل نے جانے کس ترنگ میں کہہ دیا۔

"ہاں منجیت ٹھیک کہا تم نے..... جب میں پھلوا کے ساتھ تھی تب بھی مجھے گجرات اپنے گھر کی یادیں ستاتی رہتی تھیں۔ شاید میں بہت پہلے وہاں سے بھاگ کر آجاتی لیکن اپنی زندگی تباہ کرنے والے درندے کو زندہ چھوڑ دینا میرے لئے ممکن ہی نہیں تھا..... منجیت کبھی کبھی میں حیران ہوجاتی ہوں بچپن میں مجھے بلیوں سے بھی ڈر لگتا تھا۔ اکیلی اندھیرے کمرے میں نہیں جایا کرتی تھی..... اور وہ وقت بھی آیا جب میں نے درندوں سے بھی ڈرنا چھوڑ دیا....."

کامنی ابھی تک اُسی کیفیت کا شکار تھی۔

"ہاں کامنی ہمارے بزرگ کہا کرتے ہیں زمانہ بہترین اُستاد ہے۔ انسان کو وہ سب کچھ سکھا دیتا ہے جو وہ کبھی بھی سیکھنا بھی نہیں چاہتا....." منجیت نے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے"..... کامنی نے ٹھنڈی سانس لی۔

دونوں اب اگلے حکم کے منتظر بیٹھے تھے جب انٹرکام کی گھنٹی بجی اور پرکاش نے منجیت کو مطلع کیا کہ اُن کے میزبان کا نمائندہ انہیں لینے کے لئے آیا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ہی پرکاش ایک پٹاخہ قسم کی الٹرا ماڈرن لڑکی کے ساتھ اُن کے کمرے میں موجود تھا۔

"آئی ایم جینا!"

اُس نے باری باری دونوں سے مصافحہ کیا۔ کامنی نے محسوس کیا کہ منجیت اُس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار تھا وہ زیرلب مسکرادی۔

"ہم لوگ چھ بجے کی فلائٹ سے ممبئی جارہے ہیں"..... اگلی اطلاع موصول ہوئی..... "ابھی ہماری ہوٹل سے روانگی میں ایک گھنٹہ باقی ہے، آپ ریڈی ہوجائیں"..... اُس نے دونوں کی طرف باری باری دیکھ کر کہا۔

اُس کی گفتگو اور اعتماد سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ دونوں سے بخوبی آگاہ ہے، کیونکہ اُس نے اپنے چھوٹے سے بیگ سے انڈین ایئر لائن کے دو ٹکٹ نکال کر دیئے تھے جن پر "منجیت سنگھ اور مسز منجیت سنگھ" درج تھا۔

"میں آپ کا ویٹ (انتظار) کرتی ہوں سر".....

اُس نے منجیت سے اتنے مؤدبہ لہجے میں بات کی تھی کہ اُسے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

پرکاش اور لڑکی باہر چلے گئے۔ کامنی نے ٹکٹ پر درج نام پڑھنے کے بعد انہیں نبیل کی طرف لوٹاتے ہوئے کہا۔

ہمزاد

ایک مرتبہ مولانا حسرت موہانی اور مولانا سلیمان ندوی "کامریڈ" کے دفتر جانا چاہتے تھے۔ راستہ معلوم نہ تھا۔ اچانک حسرت صاحب نے ایک راہگیر کو پکار کر کہا: "میاں چھپ چھپ کر کیوں چلتے ہو؟ ساتھ چلو، ذرا کامریڈ کا دفتر بتاؤ!" کسی عربی مدرسے کے طالب علم کا سا لباس پہنے وہ "راہگیر" بے تکلف آگے آگے اور یہ دونوں پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ راستے میں حسرت نے ندوی صاحب سے کہا: "یہ ہمارے ہمزاد ہیں۔ یہ یا ان کے بھائی ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں اور ایسے مشکل وقت میں کام آتے ہیں۔" راہگیر دراصل خفیہ پولیس کا آدمی تھا۔

☆☆☆

ابراہم لنکن نے خانہ جنگی کے دوران اپنے تمام جرنیلوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر کارروائی کی اسے رپورٹ بھیجی جائے۔ ایک دن ایک جنرل کا تار آیا کہ "چھ گائیں ہاتھ لگی ہیں۔ ان کے بارے میں حکم"؟

ابراہم لنکن نے جوابی تار دیا: "ان کا دودھ نکال لیے۔"

(محمد شاہد نیاز۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

”تمہیں اعتراض تو نہیں“......

نبیل بے اختیار مسکرادیا...... ”نہیں“ کامنی مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا“

نبیل نے محسوس کیا کہ اُس کے جواب سے کامنی کی رنگت چند لمحوں ہی کے لئے سہی تبدیل ہوگئی تھی۔

دونوں نے کناٹ پلیس سے خریدے کپڑے زیب تن کئے۔ نبیل شاندار نیلے سوٹ اور شہرت میں ملبوس تھا اور کامنی نے سرخ رنگ کی کامدار ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ دونوں امیر گھرانے کے چشم و چراغ دکھائی دے رہے تھے۔

پرکاش نے روانگی پر اُن سے پھر منجیت سنگھ کے ساتھ ہونے والی بدمزگی پر معافی مانگی اور اُن سے درخواست کی کہ جب بھی وہ زندگی میں کبھی دوبارہ دلی آئیں تو اُسے خدمت کا موقع ضرور دیں۔

جنیا اُن کی سیکریٹری کی حیثیت سے اُن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی، شاید اُسے بطور خاص ممبئی سے اسی مشن پر بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ راجن بھائی دوبارہ کسی بھی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا جب اُسے پرکاش نے فون پر اطلاع دی کہ منجیت سنگھ اغواء کاروں کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا ہے اور ہوٹل پہنچ گیا ہے تو راجن نے خوشی سے بے اختیار ناچنا شروع کردیا تھا۔ اُس کے ساتھی اُسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

راجن کے لئے یہ زندگی کی سب سے بڑی خوشخبری تھی وہ خود بے چینی سے منجیت کا منتظر تھا وہ خود اس بہادر لڑکے سے ملنا چاہتا تھا جس نے اُس کے ازلی دشمن قادر بھائی کو زمین پر ناک رگڑنے پر مجبور کردیا تھا۔ ”جینا“ اُس کی خاص ورکر تھی جسے صرف وی آئی پیز کے لئے مختص کیا گیا تھا، راجن نے اُسے بھی خصوصی ہدایات کے ساتھ دلی بھیجا تھا۔

دلی ایئرپورٹ پر کار سے اُترتے ہوئے نبیل کی زمانہ شناس نظروں نے بخوبی اندازہ لگالیا تھا کہ یہاں کار پارکنگ سے لاؤنج تک اُن کی حفاظت کے خصوصی بندوبست کئے گئے تھے اور پراسرار سائے اُن کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

دونوں کی فسٹ کلاس میں بکنگ تھی جیسے ہی وہ جینا کے ساتھ کاؤنٹر پر پہنچے فوراً انڈین ایئرلائن کی ایک مستعد میزبان نے انہیں ”خوش آمدید“ کہا۔ ”جینا“ نے انہیں وہیں بٹھا کر خود کاؤنٹر کا رُخ کیا تھا اور اب وہ تین بورڈنگ پاس لے کر واپس آرہی تھی۔

تینوں وی آئی پی لاؤنج میں آگئے تھے۔ جہاں سرد گرم مشروبات سے اُن کی تواضع کی گئی اور یہ سلسلہ ممبئی کے سانتا کروز ایئرپورٹ پر جہاز لینڈ کرنے تک جاری رہا۔ اپنے ساتھ ہونے والے اس وی آئی پی سلوک پر نبیل اور کامنی دونوں بہت حیران تھے، لیکن دونوں اپنی حیرانگی ایک دوسرے سے شیئر نہیں کرسکتے تھے۔

نبیل کو تو قدرت کی ستم ظریفی پر ہنسی آرہی تھی کہ اُسے پہلے انسان سے جانور بنادیا گیا اور بغیر کسی جرم کے زندگی کا بدترین عذاب کاٹا۔ اگر وہ خود مضبوط جسم کا مالک اور تربیت یافتہ کمانڈو نہ ہوتا تو اب تک اُس کی چھٹی ہوگئی ہوتی۔ وہ عام انسان تھا، جسے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی نے تربیت یافتہ پاکستانی دہشت گرد بنادیا تھا اور آج وہ ”دہشت گرد“ انڈین ایئرلائن کی اس پرواز میں ایک وی آئی پی کی حیثیت سے سفر کررہا تھا جس کے پہلو میں اُس کی زندگی میں اب تک آنے والی خواتین میں سے سب سے زیادہ خوبصورت خاتون بھی موجود تھی......

کامنی بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا شکار تھی۔ زندگی نے اُسے بھی پے درپے چرکے لگائے تھے اور اب وہ ایک اجنبی کے ساتھ اس حیثیت میں عازم سفر تھی کے

دل سے ایک ہی ”پرارتھنا“ (دعا) بھگوان کے حضور نکل رہی تھی کہ اس خوبصورت سفر کا کبھی اختتام نہ ہو، لیکن سفر ختم ہوگیا۔ جہاز کے مائیک سے اعلان ہو رہا تھا کہ وہ ممبئی کے ”سانتا کروز“ ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں اور اعلان کرنے والی ایئر ہوسٹس یہاں کے موسم کی خبر دے رہی تھی۔ مسافروں کا انڈین ایئرلائن کے زمناب پر شکریہ ادا کررہی تھی۔

”جینا“ نے بطور احترام اُن سے کچھ فاصلے پر سیٹ لی تھی، لیکن جہاز کے لینڈ کرتے ہی اُس نے احتراماً اُن کا بیگ پکڑ لیا۔ جس میں اب صرف کپڑے تھے۔ دونوں پستول منجیت نے بطور تحفہ پرکاش کو دے دیئے تھے کیونکہ اب اُسے اُن کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

○

”سانتا کروز“ سے ”جوہو“ کے اس شاندار بنگلے تک کا سفر اُن کے لئے زندگی کا یادگار سفر تھا۔ انہیں غیر ملکی مہمانوں کی طرح شاندار پراڈو میں بٹھایا گیا جس کے آگے اور پیچھے دو گاڑیوں میں مسلح محافظ اُن کی حفاظت پر مامور تھے۔ جینا اُن کے ساتھ موجود تھی۔

دونوں اب ایک شاندار بنگلے میں موجود تھے۔ جہاں اُن کے لئے خصوصی ڈنر تیار کیا گیا تھا۔ یہاں محافظ اور خادم دونوں موجود تھے۔ جینا نے اُن کے ساتھ ہی یہاں قیام کیا۔

رات کے قریباً بارہ بج رہے تھے جب وہ شاندار ڈنر سے فارغ ہوئے، یہاں دنیا کی مہنگی ترین شرابیں موجود تھیں، لیکن اُن کے میزبان حیران رہ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ اُن کے مہمانوں نے ”بار“ کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

جینا انہیں بیڈروم تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے منجیت کو بتایا کہ اگلے چند منٹ بعد اُن کے پاس موجود

قائداعظم زندہ آباد

جولائی 1934ء میں قائداعظم بلوچستان تشریف لائے تو انہوں نے اُردو میں تقریر کی اور اس دوران ایک واقعہ بھی سنایا جو اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ ہندوستان کے قریے قریے میں بسنے والے ہر فرد کی خواہش کیا تھی۔ قائداعظم نے کہا، میں سی پی میں سفر کررہا تھا کہ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی جہاں ریلوے لائن کی مرمت ہورہی تھی میں ریلوے اسٹیشن پر ٹہلنے لگا تو وہاں مسلمان مزدور جمع ہوگئے اور انہوں نے ”پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد“ کے نعرے لگانا شروع کردیے۔ میں نے ان سے پوچھا: ”مجھے بتاؤ کہ تم جو نعرے لگا رہے ہو، ان کا مطلب کیا ہے۔“ انہوں نے کہا: ”ہمیں معلوم ہے کہ مسلمان جہاں اکثریت میں ہوں گے وہ علاقے پاکستان بنیں گے۔“ میں نے کہا ”یہاں تو ہندو اکثریت میں ہیں لہٰذا تم تو پاکستان میں شامل نہیں ہوسکتے، پھر ان نعروں کا کیا فائدہ؟“ انہوں نے جواب دیا ”ہمارے بہت سے مسلمان بھائی آزاد ہوکر جب ایک نئی ریاست بنائیں گے تو ہمیں اس لیے بہت خوشی ہوگی۔“ بحوالہ قائداعظم ہاؤ کا روکردار...... صفحہ نمبر 38-37 (”جہاد کشمیر“ 16 جون 97ء)

فون پر اُس کا بھائی ملک ناصر اُس سے بات کرنے لگا۔

اس اطلاع نے نبیل کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑادی۔ اجمیر شریف سے خریدا ہوا موبائل ابھی تک اُن کے پاس محفوظ تھا۔

نبیل سمجھ رہا تھا کہ یہ سارا بندوبست سلطان خان نے ہی کیا ہے اور دل ہی دل میں اُس کو کئی مرتبہ خراج تحسین بھی پیش کرچکا تھا واقعی ملک ناصر نے کسی اپنے جیسے مرد کے حوالے کیا تھا نبیل کو، ورنہ تو آئے روز لیکی بے شمار گمنام لاشیں سمندروں کے ساحلوں پر ملتی ہیں، جو نبیل جیسے غیر قانونی طور پر انسانی سمگلنگ سے تعلق رکھنے والوں کے ”شکار“ ہوتے ہیں۔

اُس کے خیالات کا سلسلہ ٹیلی فون پر بجنے والی گھنٹی کی آواز سے ٹوٹا۔ دوسری طرف ملک ناصر لائن پر مخاطب تھا اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تو تھے نہیں۔

ملک ناصر سے گفتگو کرتے ہوئے نبیل کی آواز بھرآ گئی۔ وہ جان بوجھ کر کمرے سے باہر بالکنی میں آ گیا تھا تا کہ کامنی اُن کی گفتگو نہ سن سکے۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے ملک ناصر کو اس بات سے بھی آگاہ کیا تھا کہ اُس کے ساتھ ایک عورت بھی ہے جو اُس کی مددگار ہے اور وہ اُسے اکیلے نہیں چھوڑ سکتا۔

ملک ناصر نے یہ بتا کر اُسے چونکا دیا کہ اُسے پہلے سے اس بات کی خبر ہے۔ ظاہر ہے وہ اُس کے ایک ایک پل کی خبر رکھتا تھا۔ اُس نے نبیل کو اگلے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے بتا دیا کہ اب اُس کی اگلی منزل کون سی ہے اُس نے نبیل کو یقین دلایا تھا کہ اب وہ مکمل محفوظ ہاتھوں میں ہے یہ لوگ مر تو سکتے ہیں لیکن اپنے وعدے سے نہیں مکر سکتے۔ کیونکہ ان کا سلطان خان سے کاروباری تعلق ہے اور یہ لوگ کبھی اُسے ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اُس نے نبیل کو مطمئن کرنے کے بعد دعائیں دیتے ہوئے فون آف کر دیا۔

○

اب وہ مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے وہ کامنی کو اعتماد میں لے کر اپنی اصلیت بیان کر دے، کیونکہ جن ہاتھوں میں پہنچ چکا تھا وہاں پہنچنے کے بعد اگر خدانخواستہ کامنی اُسے کوئی نقصان بھی پہنچانا چاہتی تو وہ اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ گو کہ کامنی کے ساتھ اتنے دن گزارنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ وہ نبیل کے ساتھ غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا لیکن دونوں بیدار تھے۔ نیند دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔ اگر نبیل اپنی زندگی کا بہت بڑا فیصلہ کرنے جا رہا تھا تو کامنی کو بھی کسی نادیدہ قوت نے احساس دلایا تھا کہ آج اُس کی زندگی کی سب سے اہم رات ہے۔

''کامنی!''...... بالآخر نبیل نے ہمت پکڑی۔

''جی''..... کامنی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''وقت آ گیا ہے کہ میں تمہیں تمام حقائق سے آگاہ کر دوں تا کہ تم بالکل آزاد اور کھلے ذہن کے ساتھ کوئی بھی فیصلہ کر سکو۔'' نبیل نے کہا۔

کامنی کا دل زور سے دھڑکا۔

''کامنی میں وہ نہیں جو تم مجھے دیکھ رہی ہو...... میرا نام منجیت سنگھ نہیں نبیل ملک ہے۔''

''میں جانتی ہوں نبیل......'' کامنی نے اس کی بات کاٹ کر اُسے حیرت زدہ کر دیا۔ اُس نے حیرانگی سے کامنی کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا ''حیران نہ ہو نبیل...... میں نے تمہیں ہوٹل میں قرآنی آیات پڑھتے سن لیا تھا اور اس سے بھی پہلے میں نے تمہارے کردار سے اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ہرگز وہ نہیں ہو جو خود کو ظاہر کر رہے ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اب تک تم نے میری طرف میلی نظروں سے بھی نہیں دیکھا...... جو اس بات کا ثبوت تھا کہ تم......'' اُس نے اپنی بات اُدھوری چھوڑ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے نبیل کی طرف دیکھا۔

''میں بہت معافی چاہتا ہوں اتنی دیر سے اپنی اصلیت بے نقاب کرنے پر لیکن میری مجبوری کا اندازہ تم لگا سکتی ہو کامنی۔ میں نہ کوئی دہشت گرد ہوں نہ ہی میرا تعلق کسی مجرموں کے گروپ سے ہے، میں تو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر یہاں تک آ گیا ہوں...... میں تو اپنے گھر سے پناہ کی تلاش میں نکلا تھا......''

یہ کہہ کر اُس نے بلا کم و کاست اُسے ساری کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ دشمنی کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنی ماں کے مجبور کرنے پر سمندر کے راستے جا رہا تھا جب یہ حادثہ پیش آیا اور وہ یہاں تک پہنچ گیا۔

''مجھے اُمید ہے کامنی تم مجھے معاف کر دو گی''......

اپنی گفتگو کے خاتمے پر اُس نے کہا ابھی اُس کی بات بمشکل مکمل ہوئی تھی جب کامنی روتی ہوئی اُس کے سینے سے لگ گئی۔

''تم میری توقعات سے بڑھ کر عظیم انسان ہو نبیل۔ کاش کاش میں تمہیں بتا سکتی میرے دل میں......''

بات اُدھوری رہ گئی۔ اُس کی آواز پھر بھرآ گئی تھی۔

''تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں کامنی۔ ہمارے ہاں کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں بھی تمہارے متعلق ایسے ہی جذبات رکھتا ہوں، کامنی لیکن میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا اگر میں اپنی اصلیت بتائے بغیر تم سے کوئی بھی تعلق قائم کرتا......''

نبیل کی اس بات نے کامنی کو ہلا کر رکھ دیا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ دنیا میں کسی مذہب کے پیروکار عورت کے لئے ایسے عظیم جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اُس کے معاشرے میں تو عورت کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت کبھی حاصل ہی نہیں رہی تھی۔

''کامنی! میں نے اپنے اللہ سے عہد کیا تھا اگر زندہ سلامت نکل گیا تو تمہیں کبھی اکیلی اور بے یارو مددگار نہیں رہنے دوں گا۔ اس کا بندوبست میں نے کر لیا ہے...... ہم نیپال جا رہے ہیں۔ ہمارے دوست تمہارے گھر والوں سے رابطہ کریں گے۔ میں انتہائی کوشش کروں گا کہ انہیں نیپال میں بلاؤں۔ وہ تمہیں قبول کرنے کے لئے جو بھی شرط لگائیں وہ میں پوری کروں گا۔ کوئی بھی شرط۔''

کراچی

جاگتی راتوں کا شہر
اب شام سے سب
بند گھروں میں ہوئے ناصر
کیا وقت تھا
جب شہر یہ
سوتا ہی نہیں تھا

(ناصر علی سید...... کراچی)

اُس نے کامنی کو اگلے پروگرام سے آگاہ کیا۔

''وہ مجھے کبھی نہیں اپنائیں گے نبیل......'' کامنی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر وہ راضی نہیں ہوتے تو ان کی مرضی۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گا۔ عزت آبرو کے ساتھ۔ تم ہمارے ساتھ رہو۔ ہمیں دیکھو۔ سمجھو۔ اس کے بعد اگر تم مجھے اس قابل سمجھو کہ میں تمہارا جیون ساتھی بن سکوں تو میں اسے خوش قسمتی سمجھوں گا!''

نبیل کی بات نے کامنی کی زبان گنگ کر دی تھی۔ دنیا میں کوئی انسان عورت کی اتنی عزت بھی کر سکتا ہے۔

اُس جیسی بُرے ماضی کے حامل عورت کی۔ وہ ایک ٹک نبیل کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ ایسا خوبصورت بھرپور نوجوان جو یقیناً اچھے بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس نے اُسے انڈیا میں بھی محفوظ رکھا ہے۔ اس کو کس بات کی کمی رہی ہوگی۔

کامنی نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اُس کے حلق میں پھنس گئے بس اُس کی آنکھیں تھیں۔ جن سے آنسو ساون بھادوں کی بارش کی طرح بہہ رہے تھے۔

"کامنی مطمئن رہنا کوئی بات تمہاری مرضی کے خلاف نہیں ہوگی۔ اگر تم چاہوگی تو میں پاکستان میں تمہارے کسی ہم مذہب سے......"

"نہیں نبیل نہیں...... خدا کے لئے ایسا نہ کہو...... میں تو...... میں تو......"

وہ پھر رونے لگی۔ نبیل نے اُسے بمشکل نارمل کیا۔

دونوں رات دیر گئے تک باتیں کرتے رہے۔ نبیل نے اُسے بتایا تھا کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی خود کو اس کے ملک میں مجبور محسوس نہیں کرے گی۔ جب اُس کا جی چاہے گا نبیل اُس کے دوستوں کو بھارت کے کسی بھی ہمسایہ ملک میں بلا کر اُن کی ملاقات کروائے گا۔ اُس کی ہر خواہش کا احترام کرے گا۔

کامنی کو اس کی باتیں سن کر یقین نہیں آرہا تھا کہ پرماتما کی بسائی اس دنیا میں ایسے انسان بھی پائے جاتے ہیں۔ دونوں مطمئن ہو کر سو گئے۔ آج پہلی مرتبہ نبیل نے اُس کے سامنے نماز ادا کی تھی۔ کامنی اُسے حیرت، خوشی اور روحانی سرشاری کے عالم میں دیکھتی رہی۔

صبح اُن کی ملاقات ساڑھے پانچ فٹ کے ایک سیاہی مائل گندمی رنگ کے انسان سے کروائی گئی۔ جس نے اپنے گلے اور بازوؤں میں چینوں اور انگوٹھیوں کی شکل میں قریباً پاؤ بھر سونا پہن رکھا تھا۔ وہ جس سیاہ شیشوں والی مرسڈیز گاڑی میں آیا تھا وہ شاید بھارتی وزیراعظم کے استعمال میں بھی نہ رہی ہو۔ اُس کے گرد مسلح محافظ ایسے چل رہے تھے جیسے وہ کسی بڑے ملک کا صدر ہو۔

راجن نے دونوں سے دلی میں ہونے والے حادثے پر معافی مانگی اُن کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود دونوں کے گلے میں بطور تحفہ ایک ایک سونے کی بھاری چین ڈال دی۔ ایک قیمتی گھڑی الگ سے نبیل کے ہاتھ پر باندھ دی۔ وہ کامنی کو "بھابی جی" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا ہر مرتبہ اس کے ایسا کہنے پر کامنی شرم سے دوہری ہو جاتی تھی اور نبیل اُس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ کبھی ممبئی آنے کا من ہو تو مستان بھائی کو بولو اپن کو حکم دے۔" راجن نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

نبیل کو کیا معلوم یہ "مستان بھائی" کون تھا؟ لیکن یہ اندازہ اُسے ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا بھی گورو ہے اور سلطان خان نے اُس کے ذریعے ہی سارا کام کروایا ہے۔

○

راجن بھائی چلا گیا......

تیسرے روز وہ نیپال کے لئے انڈین ایئر لائنز میں عازم سفر تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ ممبئی سے کھٹمنڈو جانے والی انڈیا ایئر لائنز کے فسٹ کلاس میں براجمان تھے۔ معمول کے مطابق "جینا" اُن کی ہم سفر تھی۔ اُن کی سفری دستاویزات کب تیار ہوئیں؟ کس نے تیار کیں؟ انہیں اس بات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ تمام مراحل ایک مستعد سیکرٹری کی طرح "جینا" نے طے کروائے تھے۔ جہاز کھٹمنڈو پر لینڈ ہوا۔ دونوں "جینا" کی معیت میں

امیگریشن سے باہر آئے جہاں ایک "بڑی شاندار گاڑی اُن کی منتظر تھی۔

ایک مؤدب شوفر نے اُن کے لئے دروازہ کھولا۔ تینوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ "جینا" حسب سابق اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی تھی۔ گاڑی چلی اور مختلف سڑکوں سے گزرتی "دھول کھیل" کے پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئی۔ پہاڑوں کے درمیان سیڑھیوں کا ایک مختصر سلسلہ طے کرکے وہ ایک "ریزورٹ" پر پہنچے جہاں ملک ناصر اور سلطان خان اُن کے منتظر تھے۔

ملک ناصر نے نبیل کو دیکھتے ہی بانہیں پھیلا دیں۔ نبیل اور ناصر دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ سلطان خان نے اُسے گلے لگایا۔ کامنی نے اپنی روایت کے مطابق دونوں کے قریب زمین چھو کر پاؤں چھوئے دونوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُسے پیار دیا تو کامنی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ شفقت پدری سے آشنا ہو رہی ہو۔

○

ملک سوہنا کی گاؤں میں آمد کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن آج وہ کراچی سے جس مشن پر یہاں آیا تھا اُس کی کامیابی کے بعد ہی وہ سرخرو ہوتا۔ اُس نے ملک ناصر سے ملاقات کے بعد یہ عہد کیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہوگا، اس لڑائی کو ختم کروائے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ جب سے اُس نے نبیل کی کہانی سنی تھی کس طرح اس دشمنی سے جان چھڑانے کے لئے وہ غیر قانونی طور پر غیر ملک بھاگ رہا تھا اُس کا ضمیر اُسے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔

ملک سوہنا جانتا تھا کہ ساری برادری میں صرف وہی ایک ایسا شخص جو گزشتہ بائیس سال سے جاری دشمنی کو ختم کروا سکتا ہے۔ ورنہ تو دونوں خاندان تباہ ہو جائیں

خرچ کرنے سے پہلے مرجانا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے دیکھا کہ ان کے پاس کھجور کے چند ڈھیر ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: "اے بلال رضی اللہ عنہ! یہ کیا ہے؟" انہوں نے عرض کیا۔ "آپ ﷺ کے مہمانوں کے لیے انتظام کیا ہے۔" (کہ جب بھی وہ آئیں تو ان کے کھلانے کا سامان پہلے سے موجود ہو)۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ "کیا تمہیں اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ دوزخ کی آگ کا دھواں تم تک پہنچ جائے۔" (یعنی اگر تم ان کے خرچ کرنے سے پہلے ہی مر گئے تو پھر ان کے بارے میں اللہ کے ہاں سوال ہوگا)۔ اے بلال رضی اللہ عنہ! خرچ کرو اور عرش والے سے کمی کا ڈر نہ رکھو۔

(اخرجہ البزار باسناد حسن والطبرانی واخرجہ ابو نعیم فی الحلیہ 149/1)

گے اور وہ وقت بھی آئے گا جب اُن کے گھرانوں میں صرف عورتیں ہی باقی رہ جائیں گی۔ اُس نے ملک ناصر سے جب اس سلسلے میں بات کی تو اُسے کوئی اچھا جواب نہیں ملا تھا۔ لیکن ملک سوہنا جیسے مدبر اور زمانہ ساز بندے نے بالآخر ملک ناصر کو اس پر قائل کر لیا تھا کہ اگر ملک جگو سرنڈر کرنے پر تیار ہو اور اُن کی شرائط بھی مان لے تو وہ صلح کے لئے تیار ہے۔

ملک ناصر کی نیپال روانگی کے بعد اُس نے ملک جگو کو کراچی بلایا تھا اور اُس سے سیدھی بات کی تھی کہ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ اس سوال پر ملک جگو روہانسا ہو گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسی دشمنی نے دونوں برادریوں کا بیڑہ غرق

کر کے رکھ دیا ہے وہ بھی صلح ہی چاہتا ہے چونکہ اب مزید بیواؤں کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ جس کے بعد اُس نے ملک جگو کے سامنے کچھ تجاویز رکھی تھیں۔ ملک جگو نے وہ قبول کر لی تھیں لیکن اس سے درخواست کی تھی کہ وہ برادری کے باقی لوگوں کو بھی اعتماد میں لینے کے بعد جواب دینے کی پوزیشن میں ہوگا اور آج وہ اس بات چیت کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے آیا تھا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اس نے علاقے کی تینوں بڑی برادریوں کھوکھروں، پٹھانوں اور کشمیریوں کے بھی بڑوں کو ساتھ لے لیا تھا۔

ملک جگو اور اُس کے بھائیوں نے یہ جان لیا تھا کہ دشمنی جاری رکھنے کی قیمت کیا ادا کرنی پڑے گی۔ اب خاندان میں لڑکوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی تھی اور آنے والی نسلوں کو وہ اس دشمنی کی بھینٹ چڑھانے سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ کاروبار تباہ ہو رہے تھے۔ پولیس افسران کے مہینے اور تحفے تحائف کے علاوہ تھانے کچہریوں کے اخراجات بھی اب اُن کے لیے پریشان کن مسئلہ بن رہا تھا۔

رات کو عشا کی نماز کے بعد معززین علاقہ کی موجودگی میں ملک جگو اور برادری کے تمام بڑوں نے اللہ کو حاظر ناظر جان کر عہد کیا کہ وہ طے شدہ شرائط پر صلح کرنے کے لیے تیار ہیں اور ملک ناصر پر اپنے سارے خون معاف کرتے ہیں۔

ملک سوہنا نے وہیں نماز شکرانہ ادا کی اور اگلے روز ملکاں والی جانے کا عزم کیا، کیونکہ ایک روز پہلے کی فلائیٹ سے ملک نبیل، ناصر اور وہ لڑکی جسے ملک نبیل شادی کرنے جا رہا تھا اُن کے ساتھ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ ملک ناصر نے ابھی تک فون پر ملک سوہنا کو صرف اتنا بتایا کہ ملک نبیل نے اس سفر میں جو تکالیف کاٹی ہیں اُن کا انعام اُسے ایک خوبصورت لڑکی کی شکل میں ملا ہے، جس سے وہ شادی کرے گا، اور اب وہ اُسے باہر نہیں بھیجیں گے۔ زیادہ تفصیل نہ ملک سوہنے نے دریافت کی نہ ہی انہوں نے بتایا۔

○

کھٹمنڈو سے پی آئی کی فلائیٹ لاہور لینڈ کی تو اس میں ناصر، نبیل اور کامنی موجود تھے۔ کامنی کے کاغذات عائشہ کے نام سے تیار ہوئے تھے اور نبیل کی درخواست پر ناصر نے اُس کا یہی نام آگے بتایا تھا۔ وہ تین دن کھٹمنڈو میں مقیم رہے۔ اسی دوران بعد از خرابی بسیار نبیل نے کامنی کے گھر والوں سے فون پر رابطہ کروا دیا تھا۔ اُس کے باپ اور ماں نے تو نام ہی لینے سے انکار کر دیا بلکہ والد نے نبیل کی اچھی خاصی کلاس بھی لے لی اور اُسے کہا کہ اگر اُس نے دوبارہ اُن سے رابطہ کیا تو وہ پولیس میں کیس درج کروا دے گا۔

نبیل نے احتیاط اپنا اصلی کے بجائے نقلی نام بتایا تھا اور اُن سے بار بار درخواست کی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے بات ہی کر لیں۔ اگلے روز صبح تک بمشکل کامنی کا بھائی بات کرنے کے لیے تیار ہوا جس نے سسکیاں لیتی کامنی سے صاف کہہ دیا کہ وہ اُن کے لیے ایک سال پہلے ہی مر گئی تھی اور درخواست کی کہ آئندہ کبھی اُن سے رابطہ نہ کیا جائے۔ ملک ناصر تمام حالات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ نبیل نے اُسے اعتماد میں لے کر تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ملک ناصر آخر اُس کا کزن تھا، مردانگی اور غیرت مندی ہی اُن کے بہترین اثاثے تھے اُس نے سختی سے نبیل کو تلقین کی تھی کہ وہ پھلواڑا کو والا قصہ کسی کو نہیں سنائے گا اور اُس نے واقعی غیرت مندوں اور جوانوں والا فیصلہ کیا ہے، جس لڑکی نے اس کی جان بچانے میں اتنا اہم کردار ادا کیا اُسے اکیلے چھوڑنا بے غیرتی ہے۔

اُس نے نبیل سے صرف ایک درخواست کی تھی کہ وہ کامنی کی مرضی کے بغیر اُسے نہ اسلام قبول کرنے پر راضی کرے نہ ہی اُس سے شادی کرے، دونوں باتیں تب ہی ممکن ہوں گی جب اُن کا دل و دماغ تسلیم کر لے کہ کامنی نے یہ فیصلے اپنی مرضی اور آزادی سے کیے ہیں۔ چونکہ سلطان خان نے اُن کی سفری دستاویزات تیار کروائی تھیں جس کے لیے مجبوراً انہیں کامنی کا نام عائشہ رکھنا پڑا۔ یہ الگ بات کہ کامنی نے اس پر جس خوشی کا اظہار کیا اُس سے دونوں ہی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

لاہور ائیر پورٹ پر گھر کی تمام قابل ذکر خواتین اُن کی منتظر تھیں، دونوں بھائی اُن کے ساتھ تھے۔ سب سے پہلے ملکانی زینب نے کامنی کو اپنی بانہوں میں سمیٹا جس کے بعد باقی ملکانیوں نے اُس کا سر ماتھا چوما۔ کامنی یوں محسوس کر رہی تھی جیسے یہ اُس کا نیا جنم ہو۔ وہ ایک ہی لمحے میں کئی صدیاں آگے نکل آئی تھی اور ماضی کو ایک حادثہ سمجھ کر بھلا چکی تھی۔

گاؤں میں اپنے استقبال کی تیاریوں نے اُسے دنگ کر دیا۔ سارے گاؤں کی عورتیں ملک نبیل کی ”سوانی“ کو دیکھنے کے لیے اُمڈ آئی تھیں۔ دو دن تک کامنی سرشاری کے عالم میں اُن کی زندگی کا حصہ بنی رہی، تیسرے دن اُس نے ملک ناصر سے کہا کہ وہ کلمہ پڑھنا چاہتی ہے۔ کامنی کے قبول اسلام کی تقریب اس کی زندگی کی یادگار تقریب تھی۔

○

اگلے روز ملک ناصر کے ڈیرے پر ملک سوہنا، بشیر کھوکھر، حسو بٹ اور سمندر خان اپنے دس بارہ ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے، انہوں نے ملک ناصر کے سامنے ساری گفتگو کا خلاصہ بیان کیا اور بتایا کہ اردگرد کے تمیں دیہاتوں کے معززین اس صلح کے لیے اُس کے سامنے ہاتھ باندھنے کو تیار ہیں۔ ملک ناصر خاندانی اور غیرت مند نوجوان تھا۔ اُس نے بغیر کسی بحث تمحیص کے تمام باتوں پر صاد کر دیا جس کے ساتھ ہی دونوں دیہاتوں میں ڈھول بجنے لگا۔ مساجد میں اعلانات ہونے لگے اور اگلے روز حسو بٹ، بشیر کھوکھر، سمندر خان اور ملک سوہنا کی طرف سے ایک ہزار لوگوں کے کھانے کا بندوبست کھوکھر پنڈ میں کیا گیا، جہاں دونوں برادریوں کے نوجوانوں اور بزرگوں نے ایک دوسرے سے معافی مانگ کر قرآن پر دشمنی ختم کرنے کا حلف دیا اور ایک دوسرے کے ہاں دعوت سے اس صلح کا آغاز کر دیا۔

ملک سوہنا کو آج کراچی سے آئے دس دن ہو گئے تھے جب اُس نے اچانک ملک ناصر اور ملکانی زینب کو حیران کر دیا۔

”بہن میرے لیے“! اُس نے ملکانی زینب کو مخاطب کیا۔

”نبیل کی پلس نوکری سے میڈیکل کی چھٹیاں آٹھ دس دن بعد ختم ہونے والی ہیں۔ عائشہ سے میں نے اچھی طرح انٹرویو کر لیا ہے۔ اب میری بات دھیان سے سننا۔ تمہارا بزرگ ہوں اُمید ہے عزت رکھو گے“۔

”حکم کرو چاچا جی“۔ ملک ناصر نے کہا۔

”اگلے ہفتے میں کسی بھی دن عائشہ اور نبیل کا نکاح کروا دو۔ لیکن عائشہ کی بارات ملکاں والی آئے گی یہاں سے جائے گی نہیں۔ ملک جگو اُس کے والد کی حیثیت سے اپنا نام لکھوائے گا۔ خواہش تو یہ تھی کہ یہ سعادت مجھے ملتی، لیکن لگتا ہے اللہ کو یہی منظور ہے۔ اس طرح دلہن کو اُس کا میکہ بھی مل جائے گا“......

دونوں نے حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اُس کی طرف دیکھا اور گردن جھکا دی۔

حوالدار عجائب سنگھ وڈانچ ہسپتال سے گھر آ گیا تھا۔

اُس کی ٹانگ پر پلستر لگا تھا اور ڈاکٹروں نے اُسے تین ماہ آرام کا مشورہ دیا تھا۔ محکمے کی طرف سے اُسے سوائے علاج کی معمولی سی سہولت کے اور کوئی رعایت نہیں ملی تھی۔ لیکن نجانے کیوں اُسے اُمید تھی کہ جس مسلمان کی اُس نے مدد کی تھی وہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا۔

پندرہ بیس روز اسی کشمکش میں گزر گئے لیکن اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر ایک دن عجائب سنگھ حیران ہی رہ گیا......!

اُسے ایک ٹیلی فون آیا تھا کہ اُس کے لئے لندن سے کسی وڑانچ صاحب نے ایک لاکھ روپے بھیجے ہیں جو متعلقہ کمپنی سے اپنی شناخت دکھا کر وہ حاصل کرسکتا ہے۔

عجائب سنگھ سے زیادہ اُس کی گھر والی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اُسے اس خوش خبری کا یقین تھا جب عجائب سنگھ نے اُسے اعتماد میں لے کر ساری کہانی سنائی تو وہ ایک مرتبہ حیران ضرور ہوئی تھی لیکن اُسے اپنے "باپو" کی باتیں یاد آ گئیں جو زندگی کے آخری لمحات تک اپنے بچھڑ جانے والے مسلمان دوستوں کو یاد کرتا رہا جس نے اپنی بیٹی سے کہا تھا کہ اُن کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اور انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا گیا ہے۔

عجائب سنگھ کو فوراً اپنے "پراسرار محسن" کی سمجھ آ گئی تھی۔ اگلے روز وہ گاؤں سے ایک "ٹمپو" پر لیٹ کر کمپنی کے دفتر گیا جہاں اُس نے اپنے عزیزوں کو بھی بتایا تھا کہ لندن سے اُس کے ایک چاچے نے مرنے سے پہلے اس پر رحم کھاتے ہوئے کچھ رقم اُس کے نام روانہ کردی ہے۔

ایک لاکھ روپیہ لے کر جب وہ گھر پہنچا تو اُس کے موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی دوسری طرف اس کا سابق ملزم اور موجودہ محسن ملک نبیل اُس سے مخاطب تھا۔

شدت جذبات سے عجائب سنگھ کی آواز رندھ گئی۔ اُس نے بمشکل نبیل کا شکریہ ادا کیا۔ جس نے عجائب سنگھ کو بتایا کہ وہ اُسے کبھی نہیں بھولے گا۔ اُس نے عجائب سنگھ سے کہا تھا کہ وہ ٹھیک ہونے کے بعد بھارتی سکھوں کے جتھے کے ساتھ پاکستان آئے اور اُس کا مہمان بنے۔ عجائب سنگھ نے دل و جان سے اُس کی دعوت قبول کرلی اور اب اُسے اپنی صحت یابی کا انتظار تھا۔

○

عائشہ کو اگلے ہی روز ملک جگی اور دوسرے معززین اپنی بیٹی بنا کر لے گئے۔ انہوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق شادی کی تقریبات کا آغاز کردیا تھا اور پانچویں روز جب ملک نبیل دولہا بن کر ملکاں والی پہنچا تو سارا گاؤں سجدہ شکر بجالایا۔ عائشہ کو اُن کے نزدیک رحمت کے فرشتے والی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ جس کی وجہ سے بالآخر دو بڑے خاندانوں کی سالوں پرانی دشمنی ختم ہوئی اور علاقہ کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔